بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب المراد

ابو الفضل

السقاء

حامل اللواء

باب الحوائج

افضل الشہداء

قمر بنی ہاشم

تصنیف

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تیسرا ایڈیشن	ایک ہزار
سنہ طباعت	اکتوبر سنہ ۹۶ء
پرنٹر پبلشر	محمد انعام نقوی
طباعت	پرنٹ آرٹ ۱۱۶ نور اللہ روڈ الہ آباد

ناشر

مذہبی دنیا

۱۹۵- بخشی بازار- الہ آباد ۳

فون: ۶۰۶۶۳۶

نقشِ زندگی

اسم گرامی	عباسؑ
پدر بزرگوار	حضرت علی ابن ابی طالبؑ
مادرِ گرامی	فاطمہ کلابیہ
ولادت	۴ر شعبان المعظم سنہ ۲۶ھ سہ شنبہ
محلِ ولادت	مدینہ منورہ
شہادت	۱۰ر محرم سنہ ۶۱ھ جمعہ
زوجۂ محترمہ	لبابہ
اولاد	فضل، قاسم، عبید اللہ وغیرہ

آئینۂ کمالات

"إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ"

——— قرآن حکیم

"اُنْظُرْ إِلٰى إِمْرَءَةٍ قَدْ وَلَدَتْهَا الْفُحُوْلَةُ مِنَ الْعَرَبِ لِأَتَزَوَّجَهَا فَتَلِدَ لِيْ غُلَامًا فَارِسًا" (عمدۃ الطالب ص۳۴۹)

——— امیر المومنینؑ

"الْآنَ اِنْكَسَرَ ظَهْرِيْ وَقَلَّتْ حِيْلَتِيْ وَشَمِتَ بِيْ عَدُوِّيْ"

——— (امام حسینؑ)

"رَحِمَ اللّٰهُ عَمِّيَ الْعَبَّاسَ فَلَقَدْ آثَرَ وَأَبْلٰى وَفَدٰى أَخَاهُ بِنَفْسِهٖ حَتّٰى قُطِعَتْ يَدَاهُ فَأَبْدَلَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْهُمَا جَنَاحَيْنِ يَطِيْرُ بِهِمَا مَعَ الْمَلَائِكَةِ فِي الْجَنَّةِ كَمَا جَعَلَ لِجَعْفَرِ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ وَإِنَّ لِلْعَبَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى مَنْزِلَةً يَغْبِطُهُ بِهَا جَمِيْعُ الشُّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"
(خصال صدوقؒ ص۳۵۱)

——— امام زین العابدینؑ

"کَانَ عَمُّنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عَلِیٍّ نَافِذَ الْبَصِیْرَۃِ صُلْبَ الْاِیْمَانِ جَاھَدَ مَعَ اَخِیْہِ الْحُسَیْنِ وَاَبْلٰی بَلَاءً حَسَنًا وَمَضٰی شَھِیْدًا" وَقُتِلَ وَلَہٗ اَرْبَعٌ وَثَلٰثُوْنَ سَنَۃً"

(عمدۃ السید الداؤدی)

ـــــــــــــــ امام جعفر صادقؑ

"اَلسَّلَامُ عَلٰی اَبِی الْفَضْلِ الْعَبَّاسِ بْنِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ الْمُوَاسِیْ اَخَاہُ بِنَفْسِہٖ الْاٰخِذِ لِغَدِہٖ مِنْ اَمْسِہٖ الْفَادِیْ لَہُ الْوَاقِیْ السَّاعِیْ اِلَیْہِ بِمَائِہٖ الْمَقْطُوْعَۃِ یَدَاہُ" (زیارت ناحیہ)

ـــــــــــــــ (امام عصر عجل اللہ فرجہٗ)

"کَانَ الْعَبَّاسُ وَسِیْمًا جَمِیْلًا یَرْکَبُ الْفَرَسَ الْمُطَھَّمَ وَرِجْلَاہُ یَخُطَّانِ فِی الْاَرْضِ وَیُقَالُ لَہٗ قَمَرُ بَنِیْ ھَاشِمٍ"

(مقاتل الطالبیین ۳۲)

ـــــــــــــــ اربابِ مقاتل

نقوشِ راہ

نفسے چند	۱۱
تحریک	۱۳
قلت مصادر	۱۹
ظلم تاریخ ـــــ مادر نامہربان	۲۳
تاریخ و حدیث	۳۱
تاریخ و مقتل	۳۳
تاریخ کتب	۴۲
تمہید دین مرتضیٰ	۵۷
اسلام	۵۷
تاریخ اسلام	۶۶
روحِ اسلام	۷۴
رفتارِ اسلام	۷۸
اصطفاء، دار القضاء	۷۹

مطلع وفا ۸۶
دوران عون اور ذہنی کیفیات ۸۹
امتیازی وجود ۹۲
مشاورت ۹۵
شجرۂ طیبہ ۱۰۰
عقد ام البنین ۱۰۷
طلوعِ قمر ۱۱۵
ادوار حیات ۱۱۸
دور اول ـــــ وراثتی صفات ۱۲۱
کمال ایمان ۱۲۳
وفا ۱۳۱
علم و فقہ ۱۳۹
طلعت قمر ۱۵۱
عصمت ۱۵۶
سقایت ۱۵۹
شجاعت ۱۸۶
علمداری ۱۹۵
منازلِ قمر ۲۱۵
منزلِ اوّل ـــــ دور امیر المومنینؑ ۲۱۷
مشاہدات ۲۲۴

صفین ۲۴۱
وقتِ آخر امیر المومنینؑ ۲۴۳
منزلِ دوم ـــــ دورِ امام حسنؑ ۲۴۶
شہادتِ امام حسنؑ ۲۷۵
ایک المیہ ۲۷۸
غسلِ امام حسنؑ ۲۸۰
منزلِ سوم ـــــ دورِ امام حسینؑ ۲۸۵
رخصتِ امام حسینؑ ۲۹۲
منازلِ راہ ۲۹۵
ساحلِ مقصود ۳۰۳
نصبِ خیام ۳۱۲
فلسفۂ جہاد ۳۱۷
سقائی ۳۲۹
فیصلہ کن لمحہ ۳۶۳
تجدید عہد ۳۷۶
معرکۂ کارزار ۳۸۱
کشمکش جذبہ و عقل ۳۸۶
گرمیٔ بازارِ شہادت ۳۸۹
قربان گاہِ وفا
شانِ جہاد ۴۲۰

انداز رجز	۴۲۴
تاثرات	۴۲۶
امام حسینؑ	۴۲۷
امام زین العابدینؑ	۴۲۹
جناب زینبؑ	۴۳۱
مخدرات	۴۳۲
جناب سکینہ	۴۳۳
راہ کوفہ و شام	۴۳۵
شام	۴۳۷
قافلہ اہل حرم مدینہ میں	۴۳۹
مدفن	۴۴۱
زیارت	۴۴۴
بوسۂ قبر	۴۴۸
مرثیے	۴۴۹
مرثیہ ام البنین	۴۵۲
مرثیہ فضل بن حسنؑ	۴۵۴
ازواج و اولاد	۴۵۶
ابو یعلیٰ حمزہ	۴۶۰
باب المراد۔ کرامت و اعجاز کرامات	۴۶۳

نفسے چند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریک

۱۲/ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ کی صبح تھی ——— !

شب میں ۳ بجے حج و زیارت کی سعادت حاصل کر کے وارد سرزمین بمبئی ہوا تھا ——

اور اس وقت فخرالدین بھائی "بمبئی" کی دکان پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک ٹیلیفون آیا ——

"آپ سے ضروری مسائل پر گفتگو کرنا ہے"۔

میں نے عرض کی۔ "آجائیے"۔

تھوڑی دیر بعد ایک صاحب نازل ہوئے ——— اور یہاں سے شروع ہوئے

"میں نے ایک پبلیکیشن قائم کر دیا ہے۔ اس میں جدید اصولوں پر نئے انداز کی کتابیں شائع ہوں گی ——— اور آپ کو اس کے ادارۂ تحریر کا ایک ممبر نامزد کر لیا گیا ہے"۔

میں نے کہا ——— قلم چلانا میری زندگی ہے ——— میں اپنی زندگی کے کسی لمحہ کو بیکار نہیں کرنا چاہتا ——— تنہائی میں بھی اپنے شعری ذوق کو تسکین

دیتا ہوں ——— اور جب حالات قدرے سازگار بن جاتے ہیں تو قلم اٹھا لیتا ہوں۔"

میں نے ۴۴ سال کی زندگی میں کم و بیش ۲۳ کتب و رسائل تالیف و ترجمہ کی منزل سے گزارے ہیں ——— میں صاحب زبان و ادب نہیں ہوں کہ مجھے قلم کاری میں کوئی زحمت ہو ——— اور مدعی عصمت بھی نہیں ہوں کہ خطا و اشتباہ سے بالاتر اقدام کر سکوں۔ ——— میں اپنے علم و معلومات کی روشنی میں کام کرتا ہوں اور جب کوئی مخلص کسی غلطی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو فوراً اصلاح کر لیتا ہوں۔

میری نظر میں خوف خطا و نسیان سے قلم نہ اٹھانا علم و ہنر کی موت ہے اور خطا و نسیان کے بعد اصلاح کی طرف قدم نہ اٹھانا شرافت و عزت کی تباہی۔

میری کتابیں مختلف ممالک سے شائع ہو رہی ہیں اور اب بھی دورانِ سفر ایک کتاب تالیف کر کے لایا ہوں جو انشاء اللہ بہت جلد منظرِ عام پر آئے گی۔

میری سب سے زیادہ مجبوری ملک کے حالات اور اربابِ ایمان کی قوتِ خرید کی کمزوری ہے ——— چند مسودے بلا اشاعت پڑے ہوئے ہیں۔ کون رقم فراہم کرے ——— کون اشاعت کرے اور پھر کون فروخت کرے! آخر میں کون خریدے؟

اگر کوئی صاحبِ دل تیار ہو جاتا اور کچھ رقم صرف کر سکتا تو یہ بے قیمت ذخیرہ بھی ضائع نہ ہوتا۔

موصوف نے نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ کہا۔

" اب آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ وقت آگیا ہے کہ آپ کی یہ حسرت بھی نکل جائے گی اور یہ کام میرے ہی ذریعہ منزلِ تکمیل تک پہنچے گا۔ بس آپ کمرِ ہمت باندھ لیں اور لکھنا شروع کر دیں۔"

میں نے کہا کہ ابھی لکھنے کا کیا ذکر ہے، ابھی تو بعض مسودات پہلے ہی سے لکھے ہوئے رکھے ہیں اور ان کی اشاعت نہیں ہو سکی ہے۔ پہلے آپ ان کی اشاعت کا قصد کریں ———

پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

انھوں نے فرمایا کہ پہلے آپ میری فرمائش کی کتاب لکھیں ——— اس کے بعد تمام کتابیں شائع کی جائیں گی۔

میں نے کہا۔ آپ کی فرمائش کیا ہے؟

فرمایا قمر بنی ہاشم حضرت عباسؑ علمدار کی سوانح حیات۔

میں نے بے ساختہ کہا کہ اس کام کی کیا ضرورت ہے۔ اس موضوع پر میرے برادر محترم حضرت نجم الواعظین مولانا نجم الحسن صاحب قبلہ کی کتاب "ذکر العباس" موجود ہے۔ آپ اس کی اشاعت کر دیں۔ ایک موضوع پر متعدد کتابیں لکھنے سے بہتر مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرنا ہے۔

" ذکر العباس" سے زیادہ جامع اور ہمہ گیر کتاب لکھنا تقریباً ناممکن ہے ——— برادر محترم نے اس موضوع پر سارا مواد جمع کر دیا ہے۔ اور اس قدر دیدہ ریزی سے کام لیا ہے کہ جس روایت یا کتاب میں حضرت عباسؑ کا نام نظر آ گیا اسے بھی درج کتاب کر دیا ہے۔

ایسے حالات میں جدید کتاب کا لکھنا ——— اور اس کتاب سے ہٹ کر لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

موصوف نہایت خاموشی سے یہ ساری باتیں سنتے رہے اور آخر میں یہ فیصلہ سنایا کہ مجھے اس کتاب کا علم ہے ——— لیکن میں آپ سے گزارش کر رہا ہوں ——— میں نے کتاب لکھنے کی فرمائش کی ہے ——— کتابوں کی فہرست سنانے کی فرمائش نہیں کی۔

میں نے تعلقات و روابط اور جذبات و عواطف کی قدر کرتے ہوئے اس مطالبہ کو منظور کر لیا اور کوشش کی کہ "ذکر العباس" کو سامنے رکھنے سے پہلے اپنے طور پر چھان بین

کی جائے۔ شاید کوئی خاص چیز نظر آجائے۔

کتاب کو پیش نظر رکھنے کے بعد تالیف "تقلید" کی حیثیت پیدا کر لیتی ہے اور کتاب سے قطع نظر کر کے تالیف نئے رخ نئے انداز اور نئے سلیقہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

اس سلسلے میں مجھے کافی زحمتیں بھی اٹھانا پڑیں ——— کافی وقت خدا بخش لائبریری میں صرف ہوا۔ کچھ استفادہ فخرالاتقیاء مولانا وصی صاحب قبلہ کی لائبریری سے کیا ——— کچھ چیزیں جوادیہ کالج سے فراہم کیں ——— اور خدا کا نام لے کر قلم اٹھالیا۔

قلم کا اٹھانا تھا کہ باب الحوائج کے الطاف و مراحم کا سلسلہ شروع ہو گیا ——— اور کثرت مشاغل کے باوجود اتنی بڑی کتاب منظر عام پر آگئی۔

میرے رفقاء میرے مشاغل سے باخبر ہیں ——— انھیں معلوم ہے کہ میری زندگی کا کیا انداز ہے ——— وہ مولاؑ کے اس کرم کا بہتر اندازہ کر سکیں گے کہ حضرت باب المراد نے کس طرح سے میری کشتیٔ آرزو کو ساحلِ مراد تک پہنچایا ہے۔

تین ماہ کی یہ مسلسل زحمت آپ کے پیش نظر ہے ——— برادر محترم طاب ثراہ کی راہنمائی اپنے مقام پر ہے۔ ان کی کتاب سے کافی مدد ملی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اپنا اندازِ فکر و نظر اور طرزِ نگارش ان سے بالکل الگ رکھا ہے۔ انھوں نے واقعات پر زور دیا ہے اور میں نے استنباط و نتائج پر ——— انھوں نے عنادین قائم کئے ہیں اور میں نے موضوعات ——— انھوں نے حالات کو تسلسل سے لکھا ہے اور میں نے ابواب کے تحت انھیں مرتب کیا ہے۔

ان کے پیش نظر سوانح عمری تھی اور میرے پیش نظر سیرت نگاری۔

خدا انھیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے پہلی کاوش پیش کی اور اسے اپنے طرز پر حرفِ آخر بنا دیا ہے ——— اب اس کے بعد جو قلم بھی اٹھے گا وہ ان کا ممنونِ کرم رہے گا

سیرت نگاری

قدیم طرزِ فکر و اندازِ نگارش میں سیرت نگاری آغازِ حیات سے لے کر وفات تک کے حالات کے مرتب کر دینے کا نام تھا۔

سیرت نگار کا کام انتہائی درجہ تقلیدی ہوا کرتا تھا اور اس کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ جستجو اور تفحص کر کے حالات پیدا کرے اور پھر انھیں زندگی کے سن و سال کے اعتبار سے مرتب کر دے۔

دورِ حاضر میں یہ اندازِ فکر بالکل بدل چکا ہے۔ اب سیرت نگاری واقعات کے جمع کر دینے کا نام نہیں ہے ——— بلکہ واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ ایک سیرت نگار پر فرض ہے کہ وہ واقعات کے تسلسل پر نظر رکھے، ان کی کڑیوں کو تلاش کرے ——— وجوہ و اسباب پر غور و فکر کرے اور ان کے درمیان سے ایسے نتائج فراہم کرے جہاں تک عام ذہنوں کی رسائی نہ ہو۔

سیرت کی طرح سیرت نگاری بھی ایک بڑا اہم مرحلہ ہے۔

ایک انسان کی سیرت کی تشکیل میں بے شمار عناصر کا دخل ہوتا ہے۔ اس کے داخلی اور خارجی کیفیات دیکھے جاتے ہیں۔ نسلی اور قومی اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ حالات اور ماحول کے اعتبار سے بدلتی ہوئی قدروں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ انقلابات کے مقابلہ میں طرزِ عمل کا حساب کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح کے لاتعداد مسائل ہیں جن کے بغیر سیرت کی تشکیل مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

سیرت نگاری کے مرحلہ میں واقعات کی قدر و قیمت بھی الگ ہو جاتی ہے۔

ایک واقعہ انتہائی اختصار کے باوجود عظیم تاریخی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور بلند ترین

نفسیاتی کیفیات کی نشاندہی کرتا ہے اور ایک واقعہ انتہائی طولانی ہونے کے باوجود بنیادوں کے اعتبار سے بے حد کمزور اور غیر مفید ہوتا ہے۔

تاریخ اسلام میں ضربتِ خندق۔ انگشتری محراب کی قدر و قیمت معروف و مشہور ہے عمل لمحات کے لئے تھا لیکن اثر صبح قیامت تک کے لئے ہے۔ سیرت کی ان پیچیدگیوں کو نظر میں رکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت نگاری آبائی حالات سے زیادہ ان واقعات پر زور دینے کا مطالبہ کرتی ہے جن کا براہ راست کردار پر اثر پڑتا ہے یا جن کی روشنی میں انسان اپنا طرزِ عمل مرتب کرتا ہے۔

جناب عباسؑ کی سیرت پر قلم اٹھانا ایک عجیب و غریب ہمت کا کام ہے۔ یہ سیرت ایک ناپیدا کنار ہے جس میں سفینۂ ہمت کے ٹوٹ جانے کا قوی امکان رہتا ہے۔

یہ سیرت ——— وہبی اور کسبی کمالات کے درمیان کی منزل ہے جہاں خطوطِ راہ اور نقوشِ منزل کا معین کرنا بے حد مشکل ہے۔

حضرت عباسؑ کے حالات میں ایک طرف الٰہی عنایات کا پرتو ہے جس نے آپ کو سرحدِ عصمت سے قریب تر کر دیا ہے ——— اور دوسری طرف گھریلو تربیت کا اہتمام جس نے عام انسانوں کی صفوں سے ملانے کے باوجود ایک مخصوص امتیازی درجہ دے دیا ہے۔

ایسے نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے بڑا حوصلہ درکار ہے ——— ہر قدم پر لغزشِ فکر و قلم کا اندیشہ ہے اور ہر منزل پر حفظ مراتب کا خیال ذہن کو مضطرب اور پریشان کئے رہتا ہے۔

مختصر وقت اور عجلت کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب میں سیرت کو سیرت کے عنوان سے پیش کیا جائے۔

واقعات سے استنباط و استنتاج بھی ہو اور جزئی واقعات نظر انداز بھی نہ ہونے پائیں۔

چنانچہ ہر موضوع کو حسب حیثیت اہمیت دی گئی ہے اور غیر ضروری امور کو صرف "تبرکاً" نقل کیا گیا ہے۔

قلتِ مصادر

ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے کے لئے ایک مزید زحمت یہ ہوتی ہے کہ قدیم ترین مآخذ کی قلت ہے۔ اور ان مآخذ نے ان موضوعات پر کام کرنے کی زحمت نہیں کی۔

ابتدائی کوشش یہی تھی کہ واقعات کو قدیم ترین مآخذ سے جمع کیا جائے ——— لیکن جب ان کا دامن خالی پایا گیا تو دوسروں کے دروازوں پر حاضری دینا پڑی۔

حیرت انگیز بات ہے کہ اتنی بڑی بڑی شخصیتوں کا تذکرہ صرف چند سطروں میں کیا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں آنے کے بعد یوں ہی خالی ہاتھ چلے گئے۔ نہ اپنی دنیا کو کچھ دیا۔ اور نہ ان سے کچھ لیا۔

ان کی زندگی کسی ایسے حجرے میں گزری ہے۔ جہاں تک تاریخی شعاعوں کی رسائی ہی نہیں ہوئی یا مورخ کی نگاہ پہنچنے ہی نہیں پائی۔ عام طور سے قدیم مصادر میں حضرتِ عباسؑ کا ذکر دو موضوعات کے ذیل میں ملتا ہے ——— اولادِ امیر المومنینؑ اور شہداء کربلا۔

مورخین کو اس کے علاوہ سیرت طیبہ میں کوئی پہلو ملا ہی نہیں جسے اپنے یہاں جگہ دے سکتے۔ اور سیرت نگاروں کے لئے قدرے سہولت فراہم کر سکتے۔ ہمارا "مذاقِ تصنیف" اس پر مزید ستم ہے۔

علمی ماحول اور سماجی حالات نے ہمارے ذہنوں کو اختلافات کے سانچہ میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ بحث و مباحثہ اور جنگ و جدل سہانا اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے۔ عوام سے لیکر خواص تک جیسے دیکھو سب کا انداز نظر اور سب کا طرز نگارش یکساں ہے۔ بیانات میں مناظرہ کی چاشنی نہ آئے تو "ان من البیان لسحرا" کا مصداق نہ بنیں۔ اور تحریر میں غیر کا حوالہ نہ آجائے تو استناد و اعتبار نہ پیدا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا استناد "الزام" ہی سے پیدا ہوتا ہے اور سارا اعتبار اغیار کے مقدر ہی میں لکھ دیا گیا ہے۔

تحقیق کا تقاضا تو یہی تھا کہ ہر فریق کے روایات کو لیکر ان کو مقررہ معیاروں پر پرکھا جاتا اور معتبر روایات پر اعتماد کیا جاتا —— چاہے وہ کسی فریق سے تعلق رکھتی ہوں۔

اغیار کے روایات میں مضمون کا مل جانا "الزام" کی منزل میں، کام آسکتا ہے لیکن تحقیق کی منزل میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس کے لئے بہر حال معتبر اور مستند روایات کو تلاش کرنا پڑے گا۔

اس طرز فکر و نظر کے دو اہم نقصانات بھی ہوئے ہیں ایک عوامی سطح پہ اور ایک خواص کی سطح پر۔

عوامی سطح پر یہ نقصان ہوا ہے کہ عوام مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں —— انھیں ہر مسئلہ پر ایک ہی تحقیق درکار ہے کہ یہ روایت غیروں کے یہاں ہے یا نہیں۔؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نہیں ہے تو معتبر ہی نہیں ہے ——

حالانکہ صحیح ذمہ داری یہی ہے کہ اپنے یہاں کی روایت کو میزانوں پر تول کر غیروں کے سامنے پیش کیا جاتا اور ان کے ذہنوں سے یہ خیال نکال دیا جاتا کہ تمہاری کتاب میں درج نہ ہونے کا مطلب "عدم اعتبار" ہے۔

اندراج و عدم اندراج مؤلف و مصنف کے ذوق کا نتیجہ ہے —— اس میں واقعہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

واقعہ اپنے جملہ خصوصیات کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اب مؤلف کو یہ اختیار ہے کہ وہ کتنے اجزا کو قبول کرے اور کن اجزا کو ترک کردے۔

خواص کی سطح پر عظیم نقصان یہ ہوا ہے کہ زیادہ حصہ قوت مطالعہ اغیار کے لٹریچر پر صرف ہونے لگی ہے اور اپنا لٹریچر برباد ہو رہا ہے۔ جسے دیکھئے وہ انگریزوں کی تاریخ پڑھ رہا ہے —— جسے دیکھئے وہ مسلم و بخاری کا مطالعہ کر رہا ہے —— جس پر نظر ڈالئے وہ طبری اور ابن اثیر سے نقوش قدم تلاش کر رہا ہے۔

اپنی کتاب پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں اور اپنا لٹریچر کہنہ و بوسیدہ ہوتا جارہا ہے۔

اغیار کے جدید ترین مولفین نے ایک انداز یہ بھی نکالا ہے کہ "ہمیں" اپنے لٹریچر کے مطالعہ میں لگا دیا ہے۔ اور خود ان مباحث کو "اختلافی" کہہ کر دوسرے موضوعات میں لگ گئے ہیں۔

اس طرح ہمارا وقت تو بہر حال صرف ہو رہا ہے اور وہ دوسرے میدانوں میں اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

عمومی ذہنوں پر حالات کی اثر اندازی کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ہمارے مناظراتی ماحول میں جب کسی شخص کے سامنے کوئی روایت نقل کی جاتی ہے اور اس کا کوئی ربط و تعلق معصومینؑ کے فضائل سے ہوتا ہے۔ تو وہ پہلا سوال یہ کرتا ہے۔" یہ روایت غیروں کی کس کتاب میں ہے "؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضائل معصومینؑ غیروں کے اندراج کے محتاج ہیں یا اغیار کے

ترک کر دینے سے فضائل کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے یا ہماری ساری ذمہ داری صرف اغیار پر حجت تمام کرنا ہے۔ اپنے جذبۂ مودت کی تسکین یا اپنے علم و عرفان کا اضافہ کوئی شے نہیں ہے۔

اس کے بر خلاف اگر ایران و عراق کے ماحول میں روایت کے ساتھ اغیار کا نام لے لیا جائے تو فوراً چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اور بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انکے کسی عالم و مصنف نے اس واقعہ کو نہیں نقل کیا ——— اگر انھوں نے نہیں نقل کیا تو روایت کا کیا اعتبار؟ اغیار کے نقل پر اعتماد کرنا خلافِ عقل و انصاف ہے۔

وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے معاشرے نے روز اول سے "بین الاقوامی" ماحول میں زندگی گزاری ہے۔ ہمارے سامنے مختلف اقوام و ملل اور انکے نظریات و افکار رہے ہیں باہمی اختلافات اور معاصرانہ چشمک "انسانی فطرت" کا تقاضا ہے جس کے بعد اس ذہن کا پیدا ہو جانا کوئی خاص بات نہیں ہے۔

دوسرے ملک کے ارباب ایمان نے اس ماحول سے ہٹ کر زندگی گزاری ہے۔ انکے سامنے ایسے "تلخ تجربات" نہیں ہیں۔ وہ "ہوائے اتحاد" کے پروردہ اور "فضائے محبت" کے باشندے ہیں۔ انھیں اپنوں سے محبت ہے غیروں سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے۔ اب چونکہ مسئلہ حالات کی پیداوار ہے اور ذوق مقامی فضا سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مقام پر یہ بھی ممکن ہے کہ حالات میں تبدیلی آجائے اور ذوق یکسر دگرگوں ہو جائے۔

تاریخ ——— نامہربان

ہماری ذاتی خواہش یہی تھی کہ کتاب کے جملہ مطالب تاریخ سے اخذ کئے جائیں اور "تاریخ ہی کو اپنا مدرک و ماخذ بنایا جائے لیکن ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سنتا تھا کہ تاریخ "مادرِ معلومات" ہوا کرتی ہے۔ اس کے دامن میں ماضی کے جملہ حالات پائے جاتے ہیں ——— اس کے حافظہ میں ہر حقیقت محفوظ رہتی ہے اور اس کا خزانہ کسی وقت بھی خالی نہیں ہوا کرتا ——— وہ انقلابات زمانہ کے ساتھ حقائق کی پرورش کیا کرتی ہے۔

لیکن دیکھا یہ کہ تاریخ ایک "مادر نامہربان" کے سوا کچھ نہیں ہے ——— یہ حالات کی پروردہ ——— درباروں کی نمک خوار ——— بارگاہوں کی حاضر باش ——— اور ارباب قلم کی "منت کش" ہے

تاریخ صرف واقعہ نگاری ہوتی تو بھی اس پر اعتماد کرنا مشکل تھا ——— واقعہ "قلم کار" کی گردش قلم سے یکسر تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ اس کی روح دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے اور وہ اپنی واقعیت کو کھو بیٹھتا ہے۔

چہ جائیکہ بقول ابن خلدون تاریخ واقعات کی کڑیوں کے تلاش کرنے کا نام ہے۔ مؤرخ کا کام اسباب و علل کی جستجو کرنا ہے۔ اور ان کی روشنی میں واقعات کا مرتب کرنا ہے ——— جس کے بعد یہ امکان قوی اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ ہر مورخ اپنے ذوق کے مطابق حالات کو مرتب کرے اور جس واقعہ کو جہاں مناسب سمجھے ——— جگہ دیدے۔

واضح سی بات ہے کہ دنیا کا ہر انقلاب ابتدائی طور پر "بغاوت" کہا جاتا ہے بغاوت کے بعد مقصد حاصل ہو جائے تو وہی بغاوت انقلاب بن جاتی ہے ——— ورنہ بغاوت کی بغاوت ہی رہ جاتی ہے۔

کامیابی اور ناکامیابی بھی خیالات و رجحانات سے وابستہ ہے۔ انگریز مورخ "تحریک آزادی" میں حصہ لینے والوں کو "باغیوں" کے ذیل میں جگہ دیتا ہے اور ہندوستانی مورخ انھیں افراد کو "مجاہدین" کی صف میں بٹھاتا ہے

واقعہ ایک۔ حالات ایک۔ افراد ایک ——— لیکن۔ تاریخ میں اتنا بڑا فرق!۔

کیا یہ اس بات کا زندہ ثبوت نہیں ہے کہ تاریخ مورخ کے خیالات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور اس کے مندرجات پر آنکھ بند کر کے ایمان لانا ایک نادانی و غفلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسلامی تاریخ کے مورخین نے بھی اسی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے ——— انھوں نے جب بھی اپنے مقصد کے خلاف کوئی آواز دیکھی تو آواز اٹھانے والے کو "باغی" اور "شورش پسند" کا عنوان دیدیا۔

اور جب مقصد کی مخالفت کا سامان دیکھا تو قتل مسلم، زنائے محصنہ جیسے جرائم کے باوجود "فاتح اعظم" کے لقب سے نواز دیا۔

یہ بات نقل قول کے انداز پر ہوتی تو مورخ کی نیت کا اندازہ نہ ہوتا اور اسے "نیک دل" قرار دے دیا جاتا ——— لیکن قیامت یہ ہے کہ یہ مورخین کے استنباطات ہیں انھوں نے ہی ابواب قائم کئے ہیں۔ انھوں نے ہی ہر شخص کو الگ صف میں جگہ دی ہے۔ اور ہر ایک کی جداگانہ منزل معین کی ہے۔

تاریخی حقائق

دور حاضر میں حریت، مساوات، جمہوریت، ضمیر جیسے بے شمار لا یعنی الفاظ کی طرح ایک لفظ "تاریخی حقائق" بھی ہے۔

اس لفظ کا استعمال صبح و شام عمل میں آتا رہتا ہے لیکن چند ہی ایسے افراد ہوں گے جو اس کے معنی سے باخبر اور اسکے نتیجہ کی طرف متوجہ ہوں۔

عالم یہ ہے کہ کوئی بھی واقعہ تاریخ کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا اور وہ "تاریخی حقیقت" بن گیا۔ کوئی کلمہ مورخ کی زبان قلم سے نکلا ——— اور اسے "تاریخی حقائق" کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی حقائق کائنات ارض و سما میں وجود کے پابند نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق صرف مورخ کے ذہن و قلم سے ہے۔ مورخ کہہ دے تو حقیقت ورنہ بے ارزش۔

یہ رجحان اس حد تک آگے بڑھا کہ مسلمان ذہن کا طرز فکر ہی بدل گیا۔ کتب احادیث میں کوئی روایت دیکھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تو "روایت" ہے۔ اور تاریخ کی کتاب میں وہی روایت دیکھی تو اسے "تاریخی حقیقت" سمجھ لیا۔

معیار صرف یہ ہے کہ کتاب کا "عنوان" بدلنے سے واقعات کی نوعیت بدل جایا کرتی ہے۔ احادیث کی کتاب میں منقول واقعہ روایت ہوتا ہے۔ اور تاریخ کی کتاب میں مندرجہ روایت واقعہ بن جاتی ہے۔

اس "تغافل شعار" دور میں صحیح حقائق سے روشناس کرانا اور ان کی بنیادوں کو یاد کرانا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ صاحبان فکر ہی کو ہو سکتا ہے۔

اساسِ تغافل

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذہن کہاں سے پیدا ہوا اور اس قدر "روایت بیزاری اور تاریخ پسندی" کا جذبہ کہاں سے آیا؟

حقیقت یہ ہے انسان اپنی شخصیت کو بیحد پسند کرتا ہے۔ اپنے علوم و افکار پر نازاں رہتا ہے اور اپنے معلومات ہی کو کمال علم کا معیار سمجھتا ہے۔ سائنس داں کو سارا شرف سائنس میں نظر آتا ہے ——— اور طبیب کو سارا کمال طب میں ——— محدث کا کمال حدیث میں پوشیدہ ہوتا ہے اور مورخ کا کمال تاریخ میں۔

ان اختلافات کا سبب "افتاد طبع" کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہر انسان ایک فطری ذوق رکھتا ہے۔ اور اسی ذوق کے نتیجہ میں قدم آگے بڑھاتا ہے۔ جس کا ذوق تاریخ و جغرافیہ سے مانوس ہوتا ہے وہ اس راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے اور جس کا ذوق دینی ہوتا ہے وہ فقہ و اصول کی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ذوق کا یہ اختلاف نہ ہوتا تو مختلف علوم کے ماہرین کہاں سے عالم وجود میں آتے؟

اس حد تک اختلاف ذوق مناسب اور قابل تحسین ہے۔ نظام کائنات کے لئے اختلاف ذوق ضروری ہے۔

لیکن اس کا ذہنی رد عمل یہ ہوتا ہے کہ ہر علم کا طالب علم دوسرے علم کو لغو و جہل اور اس کے حاصل کرنے والے کو بے وزن و بے مصرف تصور کرنے لگتا ہے۔ مورخ محدث کو لغو سمجھتا ہے اور محدث سائنسداں کو۔

اس اختلاف سے تعصب کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں اور علوم کی "سرد جنگ" شروع ہو جاتی ہے۔

ہر صاحب علم دوسرے صاحب علم کے وقار کو تباہ کرنے کی فکر کرتا ہے اور صاحب فن دوسرے فنکار کو جہل سمجھتا ہے۔

نتائج کچھ بھی ہوں۔ اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح نہ حقائق بن سکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں۔

تاریخ پر ایمان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ دور حاضر کے مروجہ نظام تعلیم میں ہر علم کو ایک مرتبہ حاصل ہے۔ اور اسے ایک ضرورت قرار دیا گیا ہے لیکن علوم دین و مذہب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

نصاب تعلیم سے اخلاق، مذہب، دین و کردار سب کو خارج کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑا ماہر فن بھی "گھریلو ماحول" کا پروردہ نہ ہو تو انتہائی غیر مہذب ہوتا ہے اور اس کا اخلاق و کردار سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔

تاریخ کا مزید امتیاز یہ ہے کہ اس کا تعلق ہر علم و فن سے ہے ——— اور جدید طریقۂ تعلیم میں ہر علم کے مسائل کے ساتھ اس کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے ——— گویا طالب علم پر ایک لاشعوری اثر یہ ہوتا ہے کہ علم تاریخ تمام علوم و فنون کی بنیاد ہے اور تاریخ کے بغیر علم کے راستہ پر قدم رکھنا اندھیرے میں راستہ طے کرنے کے مرادف ہے۔

اس لاشعور کا اثر آئندہ زندگی پر پڑتا ہے اور تاریخ کی اصالت ہر ذہن کو اپنے سانچہ میں ڈھال لیتی ہے۔ اب تاریخی بیان ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اور باقی بیانات کچھ

نہیں ہوتے۔

علوم دین ومذہب کی "حرماں نصیبی" کا یہ عالم ہے کہ انھیں مدارس میں جگہ نہیں دی گئی ہے —— نصاب تعلیم میں ان کی کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا قابل انسان بھی ان کے مقابلہ میں "جاہل مطلق" ہوتا ہے۔ اور جہالت زعم علم سے ٹکرا کر ایک نئی شورش وجود میں لے آتی ہے۔

تاریخ کی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور مسائل دین ومذہب کا مذاق اڑایا جاتا ہے —— اس طرح اپنا علم کام بھی آجاتا ہے اور اپنی جہالت کی پردہ پوشی بھی ہوجاتی ہے۔

تاریخی حقائق کا پروپیگنڈا کسی تاریخ کی عزت ووقار کے تحت نہیں ہے بلکہ صرف اپنے علمی وقار کے تحفظ کے ذیل میں ہے۔

"حیرت ان ارباب علم پر ہے جو دونوں قسم کے قدیم وجدید علوم سے باخبر ہیں اور اس کے باوجود روایات واحادیث کے مقابلہ میں تاریخ کے بیانات کو اہمیت دیتے ہیں۔"

تاریخی امتیاز

علوم شریعت کے مقابلہ میں تاریخ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ شریعت کے علوم و فنون کا تعلق ایک محدود دنیا سے ہے۔ اس سے انسان کے عقائدی جذبات ومیلانات وابستہ ہوتے ہیں اور تعصب وتنگ نظری کے امکانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

تاریخ کے مسائل اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس سے عام طور پر جذبات واحساسات کا رابطہ نہیں ہوتا اور یہ کہنے کا امکان رہتا ہے کہ مورخ نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔

تاریخی مسائل میں "مستشرقین" کی ساری اہمیت یہی ہے کہ انھیں مسلمانوں کے معاملات

میں "غیر جانبدار" فرض کیا گیا ہے اور اس طرح ان کے بیانات کو "وحی منزل" کا درجہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو نہ تاریخ کے موضوعات غیر جانبداری کے موضوعات ہیں اور نہ مورخ ان مسائل میں غیر جانبدار رہ سکتا ہے

تاریخی مسائل کی دو قسمیں ہیں۔ بعض مسائل کا تعلق عمومی زندگی سے ہے۔ جس میں عقیدہ وعقیدت کا کوئی دخل نہیں ہے اور نفی واثبات مورخ کی نظر میں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور بعض کا تعلق مذہبی وجذباتی دنیا سے ہے کہ اس میں دنیا کا کوئی بھی انسان غیر جانبدار نہیں رہ سکتا جیسے صدر اول کی تاریخ۔ کہ اس میں مورخ اپنے خیالات کو مخصوص رجحانات سے الگ نہیں رکھ سکتا۔

مورخ کا یہ کہہ دینا آسان ہے کہ میں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ اور مسائل کو صحیح صورت میں درج کیا ہے —— لیکن حقیقی اعتبار سے ایسا عملاً ممکن نہیں ہے۔

مذہبی جذبات داخل سے تعلق رکھتے ہیں اور تاریخی بیانات خارج سے ——
داخلی کیفیات خارجی بیانات پر بہرحال اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لیکن خارجی واقعات داخلی کیفیات کی تشکیل نہیں کر سکتے۔

دنیا کے کسی بڑے سے بڑے غیر متعصب اور غیر جانبدار کی تاریخ لے لیجیے —— صرف ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ مورخ کا مذہب وعقیدہ کیا ہے اور اس نے کس نظریہ کے تحت کتاب کو مرتب کیا ہے۔

معمولی سی بات یہ ہے کہ بعض مورخین رسول اکرمؐ کا ذکر کرتے ہوئے "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھتے ہیں اور بعض "صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"۔

یہ فقرات تاریخی واقعات نہیں ہیں کہ ان میں تحریف وترمیم یا کتر بیونت کی جستجو کی جائے

اور یہ طے کیا جائے کہ اصل واقعہ کیا ہے اور مصنف نے کس طرح درج کیا ہے ـــــــــــ یہ صرف ایک احترام ہے لیکن اس کے باوجود نظریات و رجحانات کی غمازی ضرور کرتا ہے ـــــــــــ اور قاری بآسانی محسوس کر سکتا ہے کہ مورخ کا عقیدہ و نظریہ کیا ہے؟

یہی حال ابواب و فصول کا ہے۔ کہ مورخ افراد کی جگہ خود معین کرتا ہے اور یہ تعین اس کے خیالات کی نشان دہی کرتا ہے۔

اہم تاریخی شخصیتوں کو حکومتوں کے باغیوں میں شمار کر دیا جائے تو مورخ کا ایک عقیدہ ہے اور انھیں "مجاہد اور انقلابی" کا درجہ دے دیا جائے تو مورخ دوسرے عقیدے کا ہے۔

یہ باتیں واقعات و حقائق سے اجنبی ہیں لیکن نظریات کے استنباط میں مکمل مدد کر رہی ہیں۔

بات صرف یہ ہے کہ مسلم مورخ غیر جانبدار بن سکتا ہے لیکن غیر جانبدار ہو نہیں سکتا۔ حالات و واقعات تاریخی ہونے کے علاوہ عقائدی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اور عقائد انسان کی فکر و نظر کو پابند اور مقید بنا لیا کرتے ہیں۔

تاریخی حقائق ـــــــــ

کا پروپیگنڈہ کرنے والوں کو یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ بیانات بیان کی حد تک کیسے ہی کیوں نہ ہوں ایک مولف کے مذاقِ تالیف کے پابند ضرور ہیں ـــــــــ اور مذاقِ تالیف واقعہ کو حقیقت کا درجہ نہیں دے سکتا۔

تاریخ میں درج شدہ واقعات کو تاریخی اندراج کے اعتبار سے "حقائق" کہا جا سکتا ہے لیکن مولف کے اعتبار سے اس کے خیالات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

تاریخ و حدیث

"تاریخ کے مندرجات کو حقیقت کا درجہ دے کر روایات و احادیث کا مذاق اڑانے والوں کو ان امتیازات پر بھی نظر کرنا چاہیئے جن سے تاریخ و حدیث کا فرق واضح ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں تاریخ کی اہمیت کیا ہے؟

حدیث و تاریخ کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حدیث کے موضوعات دین و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تاریخ کے موضوعات عام ہوتے ہیں۔

دین و مذہب کے مسائل میں تعصب اور تنگ نظری کا امکان ضرور رہتا ہے لیکن شدتِ احتیاط کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہر انسان دینی مسائل میں دنیا کے اعتبار سے کہیں زیادہ محتاط ہوتا ہے اور یہ لحاظ رکھتا ہے کہ دنیاوی واقعات کے بیان کرنے میں اشتباہ ہو تو ہو لیکن مذہب میں اشتباہ نہ ہونے پائے۔

تاریخی واقعات اس احتیاط سے بے نیاز ہیں۔ وہاں مورخ اہتمام تو کر سکتا ہے لیکن احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث کے مضامین "بعینہٖ الفاظ" کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں۔ اور تاریخ کے واقعات سب "بالمعنی" نقل ہوتے ہیں ـــــــــ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ "بعینہٖ الفاظ" کے ساتھ نقل ہونے والے مضامین "بالمعنی" نقل ہونے والے واقعات سے کہیں زیادہ محفوظ ہوں گے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ محدث روایت کے بیان میں ان اشخاص پر بھی نظر رکھتا ہے جن سے اس واقعہ کو نقل کیا اور ان کی وثاقت و اعتبار کے بغیر نقل کرتے ہوئے اپنے کو شرعی

مجرم سمجھتا ہے۔

مورخ کے یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا کام زیادہ سے زیادہ واقعات کا فراہم کر دینا ہے۔ چاہے ان کی کوئی بنیاد نہ ہو اور وہ صرف خرافات کا درجہ رکھتے ہوں ——— محدث و مورخ کی ذمہ داریوں نے دونوں کے میدان الگ الگ کر دیئے ہیں ———

محدث کی ذمہ داری واقعات کی صحت کا اہتمام کرنا ہے اور مورخ کی ذمہ داری واقعات کی کثرت کا فراہم کرنا۔

محدث اپنے حوالے کو بیان کر دیتا ہے تاکہ دوسرا آدمی صحت و سقم، قوت و ضعف کا خود فیصلہ کرے اور مورخ فیصلہ کرنے کے بعد واقعہ کو بیان کرتا ہے ——— جس کے بعد تاریخی حقیقت ایک انسان کے نظریہ سے زیادہ کوئی شے نہیں رہ جاتی ہے۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مسلسل راویوں کے ساتھ نقل ہوتے والی حدیث میں "علم رجال" کے ذریعہ بیانات کی چھان بین کے وسائل مہیا کئے گئے ہیں اور تاریخی بیانات کے لئے ایسا کوئی معیار نہیں ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مورخ کے بیانات "وحی الٰہی" ہیں ——— ان کی تحقیق و تفتیش ایک مذہبی جرم ہے۔ اور ان پر تنقید و تبصرہ کرنا عذاب آخرت کا باعث ہے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ عدالت میں بیان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کرنے کے لئے پہلے بیان کرنے والے کی حیثیت پر نظر کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے بیان کی نوعیت پر توجہ دی جاتی ہے۔

علوم شریعت میں علم رجال اسی ضرورت کے تحت مرتب کیا گیا ہے کہ روایت سے پہلے راوی کی حیثیت دیکھ لی جائے اور فیصلہ انتہائی احتیاط کے ساتھ کیا جائے۔

تاریخ اس امتیاز سے سراسر محروم ہے۔ وہاں راوی کے حالات پر دہ راز میں رہتے ہیں۔

تنقید و تبصرہ اور چھان بین کا سوال ہی نہیں ہے۔

حدیث کے مقابلہ میں تاریخ کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ مورخ نہ ان واقعات کا خود شاہد ہوتا ہے جنہیں اس نے بیان کیا ہے اور نہ اس کی روایت کا۔ سلسلہ آخری منزل تک پہنچتا ہے۔

تاریخ میں "ماقبل تاریخ" واقعات کا اندراج اظہر من الشمس ہے اور وہ اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ مورخ کے پاس واقعات کا مشاہدہ یا ان کا تسلسل محفوظ نہیں ہے۔

حدیث کی دنیا اس سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ اس میں اصل راوی واقعہ کا شاہد ہوتا ہے اور بعد کے رواۃ اس راوی سے بالمشاہدہ نقل کرتے ہیں۔

مشاہدہ کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو روایت بے اعتبار ہو جائے اور اس کا بھرم کھو جائے۔

تاریخ کے مقابلہ میں حدیث و روایت کے امتیازات پر نظر رکھنے والے مورخ کے بیانات کو "تاریخی حقائق" کہہ کر قطعیات کا درجہ نہیں دے سکتے۔

تاریخ و مقتل

دور حاضر کے مفروضات میں ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ تاریخ کا اعتبار مقتل سے زیادہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے مندرجات کو "حقائق" کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اور مقاتل کے مندرجات کو روایت۔ ان مندرجات کے ضعف کے لئے یہی جملہ کافی ہے کہ "مقاتل کا بیان ہے۔"

ضرورت ہے کہ تمہیدی طور پر تاریخ اور مقتل کے فرق کو بھی پہچان لیا جائے

تاکہ آیندہ دونوں کے امتیازات سمجھنے اور فیصلہ کرنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ اور مقتل دو الگ حقیقتیں اور دو جداگانہ اندازِ تحریر ہیں ——— تاریخ کے مندرجات کا انداز کچھ اور ہوتا ہے اور مقاتل کا انداز کچھ اور ———

بعض لوگ تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ مقتل روایات کا مجموعہ ہوتا ہے اور تاریخ حقائق کا اور ضمناً حقیقت و روایت کا فرق بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

حالانکہ غور و فکر کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اور مقتل تاریخ کے ایک جز کا نام ہے۔

تاریخ کے دامن میں ہر خشک و تر اور ہر امرِ دین و دنیا کا انبار لگا رہتا ہے۔ علماء اسلام نے واقعاتِ کربلا کی مستقل اہمیت کے پیش نظر اس حصہ کو تاریخ سے الگ کر کے ازسر نو مرتب کر دیا ہے اور اسے "مقتل" کا نام دے دیا ہے۔ ورنہ یہ براہ راست تاریخ کا ایک جز تھا جسے کسی طرح بھی اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر مقاتل میں مورخین کے غلط بیانات اور ان کے مذموم روایات کا اندراج بھی ہو گیا ہے۔

مقتل کوئی نیا اندازِ تالیف ہوتا تو اس میں جملہ عقائد و رجحانات مذہب پیش نظر رکھے جاتے اور ایسے روایات کے اندراج سے پرہیز کیا جاتا جن میں دشمن مورخ کی دسیسہ کاری نے قلم تحریف چلا دیا ہو۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہے ——— علماء اسلام نے تاریخ سے مورخ کے بیانات کو نکال کر اور مستقل طور پر محفوظ کر دیا ہے اور ضمناً وہ تمام اغلاط بھی مقاتل میں چلے آئے ہیں جن کا صرف تاریخ میں رہنا مناسب تھا۔

اس کا واضح ثبوت حضرت شیخ مفید کا ارشاد ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "ارشاد"

میں واقعاتِ کربلا کو درج کرتے ہوئے ابتداء ہی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ ان بیانات کا تعلق تمام تر اربابِ تاریخ و سیر سے ہے۔ میں نے صرف اس مقام پر نقل کر دیا ہے۔

ایسے حالات میں تاریخی اغلاط کا منتقل ہو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔!

تاریخ کے مقابلہ میں مقتل کو ضعیف کہنا یا سمجھنا "ضعفِ عقل" یا "ضعفِ بصر" کی علامت ہے۔

مقتل تاریخ پر ایک امتیاز رکھتا ہے ——— کہ تاریخ کے مرتب کرنے والے عموماً جانبدار یا متعصب قسم کے لوگ رہے ہیں جن کا اندازِ نگارش خود آواز دیتا ہے کہ انھیں کربلا کے واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اسے صرف "ضرورتِ تالیف" کی بنا پر نقل کر رہے ہیں۔

اس کے برخلاف مقاتل کے تالیف کرنے والے عموماً اصل واقعہ کے مخلص رہے ہیں اور اسی اخلاص کی بناء پر "ظلمِ تاریخ" کی روشنی میں قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کرتے رہے ہیں۔

اس سے بالاتر ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کسی واقعہ کا نقل کرنا اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک انسان واقعہ کی روح سے باقاعدہ آشنا نہ ہو اور اس کے متعلقات کو بہت قریب سے محسوس نہ کر چکا ہو۔

سرِ راہ پیش آنے والا واقعہ ہر راہرو کی زبان پر رہتا ہے ——— لیکن صحیح و صاف وہی بیان ہوتا ہے جو واقعہ کو "قریب سے" محسوس کرنے والا انسان بیان کرتا ہے۔ واقعۂ کربلا کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

مورخین نے اس کے ساتھ عظیم ناانصافی برتی ہے اور واقعات کو صرف واقعات کے انداز سے نقل کر دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے روحِ کربلا کو محسوس ہی نہیں کیا اور طرفین کی صحیح

نوعیت سے باخبر ہی نہیں ہیں ——— "دو بادشاہوں کی جنگ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔"

واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں مورخین کے بیانات ایک "روزنامہ" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

نامہ نگار جس طرح واقعہ کو دیکھتا ہے نشر کر دیتا ہے اسے واقعہ کی اصل بنیاد یا جوہر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

مورخ کی ذمہ داری اس سے زیادہ ہے اور دوسرے موضوعات میں مورخین نے اس کا لحاظ بھی رکھا ہے۔ صرف کربلا کے معاملہ میں یہ حقیقت نظر انداز ہو گئی ہے اور اس ذمہ داری کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ روح کربلا کو کسی حد تک بھی قریب سے محسوس کرنے والوں نے قلم اٹھا لیا اور تاریخ کے "خیانت شعار" خزانہ سے اپنا ذخیرہ نکال لیا اب تاریخ "بے حس" انداز تحریر کا نام ہے ——— اور مقتل "حساس" مورخ کے بیان کا نام ہے۔

روح کربلا کے احساس و عدم احساس کا بین فرق یہ ہے کہ تاریخ کے دامن میں واقعات کی "تڑپ" کا نشان نہیں ہے۔ مورخ نے ایک غیر جانبدار انسان کی طرح بے تعلقی کے ساتھ واقعات کو بیان کر دیا ہے اور بس۔

مقاتل نے اس تڑپ کو محسوس کیا ہے۔ ان کے دامن میں "خاموش" جذبات بھی ہیں اور دلوں کی دھڑکنیں بھی ——— واقعات کی تصویر کشی بھی ہے اور احساسات کی عکاسی بھی ——— اور اس اعتبار سے مقتل "حساس" افراد کی نگاہ میں تاریخ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

مقتل نہ ہوتا تو بے شمار جذبات و احساسات گھٹ کر رہ جاتے، اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے واقعات تاریخ کی غفلت شعاری کی نذر ہو جاتے۔

مقتل ———

کی یہ کمزوری ضرور ہے کہ اس میں جذبات کی ترجمانی کے عنوان سے اکثر مقامات پر "زبان حال" کا ذکر بھی آ گیا ہے ——— اور اس طرح کتاب واقعات سے ہٹ کر مؤلف کے خیالات کی سرحد تک پہنچ گئی ہے۔

لیکن یہ بات افادیت کی منزل میں معیوب نہیں ہے۔ حالات اپنے پورے خصوصیات کے ساتھ بیان کر دیئے جاتے ہیں تو زبان حال سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ بھی آسان ہو جاتا ہے اور حالات ہی میں اختصار ہو جاتا ہے تو صورت واقعہ کے سمجھنے میں بھی بے حد دشواریاں پیش آتی ہیں۔

مقتل اور تاریخ ———

کا ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ تاریخ نے ہمیشہ درباروں اور میدانوں پر زور دیا ہے اور اپنے واقعات انھیں منزلوں سے فراہم کئے ہیں، مقاتل کا ایسا کوئی التزام نہیں رہا ہے۔

اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مورخین نے اپنی کتابوں کو سلاطین وقت کی فرمائش یا ان کی خوشامد میں مرتب کیا ہے اور ایسی کتابوں میں ان کے کارنامے اور ان کے دشمنوں کے عیوب کا ذکر ہونا بلکہ اسی کا موضوع بنانا ناگزیر ہوتا ہے۔

مقتل کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے ——— وہ مذہبی جذبات اور دینی احساسات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں نہ دربارداری ہوتی ہے اور نہ بارگاہ پرستی بھی مل جاتی ہے اور ماؤں کے دلوں میں تڑپتے ہوئے جذبات بھی ———

وہ میدان کے مجاہدات بھی نقل کرتا ہے۔ اور قید خانوں کا انداز عبادت و ریاضت بھی۔

مقتل کو مقتل کہہ کر نظر انداز کر دینا "مقتل" کا قتل ہے اور نتیجہ میں خود واقعہ کا قتل عام۔

ایک اہم سوال

اس مقام پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب مقاتل کی ترتیب و تدوین میں تاریخ ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔ تو اس کے دامن میں مندرجات کے ماسوا مطالب کہاں سے آ گئے۔ اور صاحب مقتل کا منفرد مدرک کیا ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کے لئے خود تاریخ کے مدرک پر غور کرنا پڑے گا اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ مورخ کے پاس اس کی "دستاویز" کی سند کیا ہے؟

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مورخ کے معلومات کسی آسمانی وحی والہام کا نتیجہ ہوتے ہیں اور وہ بچشم خود مشاہدہ کر کے یا "الہامی" انداز سے واقعات کو فراہم کرتا ہے۔ اور اسی لئے اس کی وثاقت و اعتبار پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ اکثر آیات قرآنی کی تاویل تاریخ ہی کی بنیاد پر کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

مورخ اپنے معلومات دوسرے افراد کے بیانات ہی سے فراہم کرتا ہے اور یہ بیانات کبھی تحریری شکل میں مورخ تک پہنچتے ہیں اور کبھی زبانی سننے میں آتے ہیں۔

مقتل کا انداز بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ صاحب مقتل اپنے معلومات کو دوسروں کے بیانات ہی سے فراہم کرتا ہے۔

کبھی تاریخ کی تحریروں کا سہارا لیتا ہے اور کبھی ان علوم سینہ پر اعتماد کرتا ہے

جو ظلم تاریخ کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور جنہیں مورخ نے اپنی تالیف میں جگہ نہیں دی ہے ــــــ

"علم سینہ" کوئی مضر یا معمولی شے نہیں ہے ــــــ غور کیا جائے تو تاریخ بھی علم سینہ ہی کی ممنون کرم ہے اور اس کے بیانات بھی اسی طرح جمع کئے گئے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ دامن تاریخ میں آنے کے بعد غیر جانبدارانہ اور "حقائق" کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

دانشمند طالب حقائق کا فرض ہے کہ مندرجات کتاب اور علم سینہ دونوں پر وقت نظر کے ساتھ غور کرے اور یہ دیکھے کہ صورت حال کے پیش نظر کون سی بات قرین قیاس ہے اور کون سی بات خلاف عقل؟

مجھے یاد آتا ہے کہ میرے ایک استاد نے نجف اشرف میں طالب علم اور عالم کے علوم کا فرق واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ۔

" طالب علم کتاب پر اعتماد کرتا ہے اور عالم تحقیق و تمحیص پر۔"

طالب علم سے اہم سے اہم مطلب بیان کر دیجئے۔ اسے اعتبار نہ ہو گا لیکن اگر اسی مطلب کا کسی معمولی کتاب سے حوالہ دے دیجئے تو فوراً باور کر لے گا چاہے مصنف انتہائی معمولی درجہ کا انسان رہا ہو۔

عالم کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ وہ تحریری اور تقریری۔ دونوں قسم کے مطالب کو "میزان عقل و تحقیق" پر تولتا ہے اور اس کے بغیر قبول نہیں کرتا۔

دور حاضر کا عمومی ذہن اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ کسی معمولی سے معمولی کتاب کا حوالہ دے کر روایت بیان کر دیجئے تو بات صحیح اور قابل اعتماد ہے اور اہم سے اہم مدرک سے نقل کیجئے ــــــ صرف کتاب کا ذکر نہ ہو تو بات ناقابل اعتماد ہے

اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے کہ تاریخ کے پرستار "مقاتل" پر الزام لگا دیتے ہیں کہ اس کے اکثر و بیشتر مطالب علم سینہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور "علم سینہ" معتبر نہیں ہوتا ہے۔

حالانکہ سنجیدگی کا تقاضا یہ ہے کہ علم سینہ ــــــ واقعاً علم سینہ ہو تو مندرجات کتاب سے کہیں زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ مندرجات کتاب دوسروں کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں۔ ان میں رعایت، مروت، ریاکاری اور رواداری کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں۔

سینہ میں وہی مطالب محفوظ کئے جاتے ہیں جن سے انسان کو داخلی ہمدردی اور دلچسپی ہوتی ہے۔

ان کے اعتبار اور عدم اعتبار کا بہترین پیمانہ خود صاحب علم ہے ــــــ وہ قابل اعتبار ہے تو اس کا بیان معتبر ہے اور وہ ناقابل اعتبار ہے تو قطعاً غیر معتبر۔

تاریخ کو یہ شرف بھی نصیب نہیں ہے کہ اس کے مندرجات کے بارے میں "صاحب بیان" ہی کے اعتبار سے فیصلہ کر دیا جائے اور یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ راوی کس پایہ کا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

حقِ نمک

تاریخ کی کمزوری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ یہ فن خود ہی حکومت کی نگرانی میں وجود میں آیا ہے اور اس پر روزِ اول سے اقتدار کی چھاپ لگی ہوئی ہے: تاریخ کا بیان ہے کہ روزِ اول اس کی ترتیب و تدوین کا کام اقتدار کے زیر نگرانی انجام پایا ہے۔ اور خلیفۂ دوم کے احکام کے تحت اس کی تدوین ہوئی ہے۔

حد یہ ہے کہ تاریخ کی ابتدا طے کرنے میں بھی انھیں کی رائے شامل رہی ہے۔ اور انھیں کے مشورہ کی بنا پر ہجری سنہ کے اعتبار سے واقعات مرتب کئے گئے ہیں یہ بات حیرت انگیز ضرور ہے کہ اسلامی تاریخ کا سنہ ہجرت سے کیوں مقرر ہوا ہے۔

عیسائیوں نے اپنی تاریخ کا سن اپنے پیغمبر کی ولادت سے شروع کیا ہے ــــــ دیگر اقوام نے بھی اسی نکتہ کا تحفظ کیا ہے ــــــ یہ صرف مسلمانوں کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے ولادت اور وفات دونوں کو چھوڑ کر درمیان سے تاریخ شروع کر دی۔

تقاضائے انصاف تو یہی تھا کہ ولادت مرسل اعظمؐ سے ابتدا کی جاتی اور ہجرت سے پہلے کے اہم واقعات کو بھی جزو تاریخ بنایا جاتا ــــــ اور اگر یہ ممکن نہیں تھا تو وفات سے سلسلہ شروع ہوتا کہ تاریخی مطالب کو یکسوئی حاصل ہوتی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور ہجرت کو بنیاد تاریخ قرار دے دیا گیا۔

ایسے حالات میں یہ کہنا قطعاً صحیح ہو جاتا ہے کہ تاریخ کی تدوین کا عمل انجام دینے والی حکومت نے اپنے حالات کا جائزہ لیا اور یہ دیکھا کہ ہماری تاریخ میں نہ ولادت رسول سے کوئی کارنامہ وابستہ ہے اور نہ وفات سے۔

ہمارا سارا کارنامہ ہجرت سے وابستہ ہے ــــــ اس لئے مناسب یہی ہے کہ سن تاریخ کو ہجرت سے شروع کیا جائے تاکہ ابتدائے تاریخ ہی میں اپنا تذکرہ آ جائے اور آغاز سن کے بیان ہی سے اپنا ذکر وابستہ ہو جائے۔

ایسا نہ ہوتا تو مسلمان قدیم طرز فکر سے قطعاً الگ نہ ہوتے ــــــ اور دیگر اقوام کی تقلید ہی کو اپنی فلاح و نجات کی ضمانت سمجھتے۔

اس تحقیق سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخ کی بنیاد اول پر حکومت و اقتدار

کا پہرہ ہے اور اس کی نشو ونما دولت وسلطنت کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں اس سے سنجیدگی فکر یا سلامت بیان کی توقع رکھنا قطعاً اشتباہ ہے۔

تاریخ کا سارا استناد واعتماد یہ ہے کہ وہ غیروں کے گھر پلی ہے اور انھیں کی آغوش ترتیب میں پروان چڑھی ہے۔ اب اگر اس کے دامن میں کوئی مفید مقصد ہے —— یا خلافِ مفادِ دولت مضمون مل جاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حقیقت اس قدر واضح اور روشن تھی کہ مورخ نہ اس پر پردہ ڈال سکا اور نہ تاویل و توجیہ کی نذر کر سکا۔

تاریخ —— ایسے ہی مقامات پر کار آمد اور مفید ہو سکتی ہے۔ ورنہ عقائد کی منزل میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ تاریخ سے عقائد کا فیصلہ کرنا ایک جہالت ہے اور مستند روایات کے مقابلہ میں تاریخ کا حوالہ دینا "غیر پرستی" ہے جو خالص مذہبی جذبہ کے قطعاً منافی ہے۔

کتبِ تاریخ

فن تاریخ اور مورخین کی اجمالی کمزوریوں کا جائزہ لینے کے بعد ایک نظر کتب تاریخ پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

تاریخ نویسی کا سلسلہ باقاعدہ طور پر تیسری صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوا ہے اور آج تک برابر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ مختلف ادوار و حالات میں مختلف کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔

ضرورت ہے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے مصنفین کے دور حیات کی تعیین کر لی جائے تاکہ تاریخ کی قدامت و اقربیت الی الواقع کا صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ "واقعاتی اعتبار" سے جو کتاب زیادہ قدیم ہوگی اس کے مندرجات زیادہ معتبر ہوں گے۔ درمیان میں راویوں کا سلسلہ بھی کم ہوگا اور حالات کو غلط بیانی پر مجبور کرنے کا موقع بھی کم ملا ہوگا۔

علمائے اسلام کے نقل کے مطابق کتب تاریخ کے تالیف کا زمانہ مورخین کی تاریخ وفات کے اعتبار سے حسب ذیل قرار پاتا ہے۔

سیرت ابن ہشام	عبد الملک بن ہشام	سنہ ۲۱۳ھ
طبقات	محمد بن سعد البصری	سنہ ۲۳۰ھ
الامامۃ والسیاسۃ	عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ	سنہ ۲۷۰ھ
الاخبار الطوال	احمد بن داؤد	سنہ ۲۸۲ھ
طبری	محمد بن جریر طبری	سنہ ۳۰۰ھ
مروج الذہب	مسعودی	سنہ ۳۴۶ھ
کامل	ابن الاثیر عز الدین علی بن محمد الجزری	سنہ ۶۳۰ھ
فخری	فخر الدین محمد بن علی بن طباطبا	سنہ ۷۰۹ھ
المختصر فی اخبار البشر	ابو الفدا اسمٰعیل بن علی	سنہ ۷۳۲ھ
البدایۃ والنہایۃ	اسمٰعیل بن عمر بن کثیر	سنہ ۷۷۴ھ
تاریخ ابن خلدون	عبد الرحمٰن بن محمد بن خلدون	سنہ ۸۰۸ھ
روضۃ الصفا	محمد بن خاوند	سنہ ۹۰۳ھ
تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی	سنہ ۹۱۱ھ
تاریخ الخمیس	حسین بن محمد الدیار بکری	سنہ ۹۶۶ھ
السیرۃ النبویۃ	احمد بن زینی بن احمد دحلان	سنہ ۱۳۰۴ھ

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قدیم مبسوط تاریخوں میں سب سے پہلا درجہ تاریخ طبری کا ہے جس کے مولف نے تیسری صدی کے خاتمہ کے ساتھ اپنی زندگی ختم کی ہے اور اسی صدی کے کسی حصہ میں یہ تاریخ مرتب کی ہے۔

اس سے پہلے کسی تفصیلی تاریخ کا وجود نہیں ملتا۔ "سیرت ابن ہشام" سیرت کی کتاب تھی اس میں تاریخ کے تمام موضوعات کا ذکر نہ تھا اور الامامۃ والسیاسۃ ایک مخصوص موضوع کے تحت مرتب کی گئی تھی۔

اور الاخبار الطوال تاریخ ضرور تھی، لیکن اس میں نہایت درجہ اجمال سے کام لیا گیا تھا۔

طبری نے ان تمام کتابوں سے الگ تفصیلی رخ اختیار کیا اور اسی امتیاز کی بنا پر ایک عظیم شہرت و عظمت کا مالک ہو گیا۔

اس شہرت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعد میں آنے والے مولفین نے اپنے کو اس کا شرمندۂ احسان محسوس کیا۔ اور اس کے مندرجات کو "حقائق" کا درجہ دینا شروع کر دیا۔

ابن اثیر کی کامل تین صدی بعد مرتب ہوئی لیکن اس کے سامنے بھی مفصل تاریخ کا کوئی مدرک طبری کے سوا نہ تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے بھی طبری کے چبائے ہوئے لقمے نگلنا شروع کر دیا اور اس طرح اپنی انفرادیت خاک میں ملا دی۔

تاریخی دنیا میں طبری کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس بسط و تفصیل کے ساتھ واقعات جمع کئے اور اپنی ریاضت و محنت سے ایک عظیم ذخیرہ مہیا کر دیا۔

ظاہر ہے کہ طبری کا مدرک سابق کی کتب تاریخ نہیں ہو سکتی تھیں ان کتابوں

میں اس تفصیل کے ساتھ واقعات کا اندراج ہی نہیں ہوا تھا۔ طبری نے اپنے ذاتی وسائل سے کام لیا اور اتنی طویل کتاب تیار کر لی۔

طبری کے بیانات پر مفصل تبصرہ کا امکان نہیں ہے۔ اجمالی طور پر اتنا کافی ہے کہ طبری نے حضور سرور کائنات کی وفات سے لے کر "خلافت راشدہ" کے خاتمہ تک ایک ہزار بارہ روایتیں درج کی ہیں۔ جن میں ۷۰۱ روایات سری کے ہیں۔ ۶۷ روایات سیف بن عمرو کے اور ۵۲ روایات عمر بن شیبہ کے۔

اور حسن اتفاق یہ ہے کہ یہ تینوں ہی غیر ثقہ افراد ہیں۔ سیف بن عمرو تو باجماع اہل رجال ضعیف و ناقابل اعتماد ہے۔

عبداللہ ابن سبا کا افسانہ اسی کا ایجاد کردہ ہے اور اس "چندی"۔ "مجہول" کا سراغ اسی نے لگایا ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کتاب کے اعتبار کا یہ عالم ہے اس پر اعتماد کرنے والی کتابوں کا کیا عالم ہوگا۔

اس پر مستزاد یہ ہے کہ سری نے بھی اپنی روایتیں طبری سے بیان نہیں کیں بلکہ انہیں لکھ کر بھیجا ہے۔ جس میں ہزار قسم کے شبہات کا اور بھی امکان ہے اور کتاب کی رہی سہی وقعت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

طبری کی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے ایک نظر اس حقیقت پر بھی ڈالیں اور پھر دیکھیں کہ طبری یا اس کے نقش قدم پر چلنے والے مورخین کی کتابوں کی قدر و قیمت کیا ہے؟

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ کریں کہ طبری بھی ایک عقیدہ اور ایک نظریہ کا انسان تھا۔ اس کا بھی "اخلاقی" فرض تھا کہ اپنے نظریہ کی ترویج و تبلیغ کی ہر امکانی کوشش کرے چاہے اس طرح حقائق کی پامالی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

طبری نے اپنے اس فریضہ کو ادا بھی کیا ——— اور ایک طرف عبداللہ بن سبا کا افسانہ ایجاد کر کے حکامِ جور کے مظالم پر پردہ پوشی کا مکمل انتظام کیا اور حکومت سے اختلاف رکھنے والے افراد کو ایک ایسے فتنہ کا پیرو کار ثابت کر کے ان کے اقدامات کی متانت و سنجیدگی کو خاک میں ملا کر ایک مستقل فتنہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔

اور دوسری طرف واقعات میں "حسین" ترمیم کر کے لفظوں کے الٹ پھیر سے حقیقتوں کے چہرے کو مسخ کر دیا۔

مثال کے طور پر واقعہ یہ ہے کہ مرگ معاویہ کے بعد امام حسینؑ کو مدینہ کے حاکم نے یزید کے حکم کے مطابق مطالبۂ بیعت کے لئے دربار میں طلب کیا اور آپ نے خبر مرگ معاویہ سن کر اسلامی رسوم کے تحت اناللہ وانا الیہ راجعون کہہ دیا۔ طبری نے موقع غنیمت جانا اور اسی مقام پر امام کی زبانِ اقدس سے کلمۂ "ترحم" بھی نقل کر دیا

گویا آپ نے معاویہ کے لئے دعائے رحمت بھی کی ہے ——— اور امام "مستجاب الدعوات" کی دعا کے بعد بخشش کے نہ ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر خود امام حسینؑ کے بارے میں ابن سعد کے کلمات میں ترمیم کر دی ——— ابن سعد نے آخری گفتگو کے بعد ابن زیاد کو اطلاع دی کہ حسینؑ بیعت نہیں کریں گے ——— ان کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے۔ "نفس ابیہ"۔

طبری نے نہایت ہی ہوشیاری سے "ابیہ" پر دو لفظوں کا اضافہ کر دیا اور "نفساً ابیۃ" غیرت دار نفس بنا دیا جب کہ ابن سعد کے الفاظ بڑے دور رس نتائج کے حامل تھے۔ اور ان سے صرف نظر ممکن نہ تھا کہ امام حسین کے بیعت

نہ کرنے کا سبب ان کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے جو کبھی طاغوتِ باطل کے سامنے نہیں جھکا ——— اور یہ دلیل ہے کہ حسینؑ اور ان کے بزرگوں میں کسی ایک نے بھی باطل کی بیعت نہیں کی۔

طبری کا تعصب، اس کی تنگ نظری ——— اس کے راویوں کا ضعف اور ان کی بے اعتباری کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ طبری نے پورا واقعۂ کربلا تمام مقدمات و متعلقات کے ساتھ صرف ۶۰ صفحات میں بیان کیا ہے اور سارے اہم تفصیلات کو نظر انداز کیا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ایسا واقعہ جس کی جڑیں کوسوں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور جس میں راہِ حق میں کم سے کم ۷۲ افراد نے جانیں قربان کی ہیں اور مختلف مصائب و آلام کا سامنا کیا ہے ——— اسے صرف اتنے صفحات میں بیان کیا جائے تو کیا ناانصافی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟

ایسے حالات میں تو ناممکن ہے کہ کربلا کی تاریخ کو طبری جیسے مورخین کے بیانات سے مرتب کیا جا سکے جس میں مورخ خیانت شعار ہے اور تاریخ مجموعۂ توہمات بھی۔

ضرورت تھی کہ ایک ایسی مستقل تالیف بھی ہو جس میں سینہ بہ سینہ آنے والے معلومات و ملفوظات کو بھی ایک درجہ حاصل ہو اور انھیں کی روشنی میں واقعات کو صحیح انداز سے مرتب کیا جائے اصطلاحی اعتبار سے مقتل ایسی ہی کتاب کا نام ہے جو ان موضوعات پر عظیم ذخیرہ مہیا کرتی ہے۔

مقاتل

ان دیانت دار مؤلفین کے مجموعات ہیں جنھیں واقعۂ کربلا سے کم از کم اس قدر دلچسپی رہی ہے کہ انھوں نے واقعہ کے تفصیلات پر توجہ دی ہے اور اسے بڑی حد تک

مرتب کر دیا ہے۔

مقاتل کے مولفین بھی معصوم نہیں تھے۔ ان سے بھی غلطی کا امکان تھا اور غلطیاں ہوئی ہیں ـــــ جس کا ایک سبب یہی تھا کہ ان کے سامنے تاریخ کے علاوہ کوئی اہم مدرک نہ تھا اور تاریخ اغلاط کا مجموعہ تھی ـــــ اس پر دشمنی اہل بیتؑ کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ طبری جیسا مورخ واقعۂ کربلا کے ساتھ اس قدر ناانصافی کیوں برتتا ہے کہ اکثر مقامات پر ایسے اقوال نقل کر دیتا ہے جس کے بعد واقعہ کی عظمت کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔

اسی مورخ نے واقعۂ کربلا کا صفر کے مہینے میں ہونا درج کیا ہے۔ (طبری ۲ ص ۲۸۶)

اسی مورخ نے "نفس ابیۃ کو نفسا ابیۃ بنایا ہے۔"

اسی مورخ نے زحر بن قیس کی روایت درج کی ہے کہ شہداء کربلا میں استقامت و استقلال کا وجود نہ تھا اور وہ ہمارے رعب و داب سے پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

(معاذ اللہ) طبری ۶ ص ۲۶۴ ۔

الاخبار الطوال

بھی طبری سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس نے بھی "طوال" نام رکھ کر اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ جیسے واقعۂ کربلا کوئی اہم واقعہ ہی نہیں ہے اور بہتر ۷۲ جانوں کی قربانی کوئی عظمت ہی نہیں رکھتی۔

زحر بن قیس کا بیان طبری سے پہلے اسی نے نقل کیا ہے ص ۲۵۷ ۔

کربلا میں حمید بن مسلم کے وجود کو اسی نے مشکوک بنایا ہے۔

اور اس قسم کے نہ جانے کتنے مزعومات و مفروضات ہیں۔ جو ان مورخین کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور آج کے ارباب نظر انہیں "ٹھوس تاریخی حقائق" کا درجہ دیکر ان پر تحقیق کی عمارتیں کھڑی کر رہے ہیں۔

مورخین ـــــ

سے زیادہ قابل افسوس مولفین ہیں ـــــ جو کہ آنکھ بند کر کے انکی تقلید کر رہے ہیں اور ان کے اغلاط پر پوری توجہ نہیں دیتے۔

طبری وغیرہ اہلبیتؑ کے اغیار تھے، حمید بن مسلم لشکر یزید کا رپورٹر تھا۔ لیکن آپ تو ایسے نہیں ہیں آپ کی مکمل ذمہ داری یہی ہے کہ ان کی غلط بیانیوں کی کڑی نگرانی کریں اور ان کے قریب میں نہ آنے پائیں۔

اس سلسلے میں بعض معاصر مولفین کی روش بھی تعجب خیز ہے کہ وہ طبری کے تحریفات کو جاننے کے باوجود نفس ابیہ کے بجائے نفسا ابیۃ ہی نقل کرتے ہیں ـــــ اور دشمن تاریخ کے بیانات کو "مخلص ارباب مقاتل" کے بیان پر ترجیح دیتے ہیں۔

بعض مولفین نے تو یہاں تک قیامت کی ہے کہ پہلے حمید بن مسلم کے بیانات سے استناد کر کے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ واقعات کربلا کا واقعی اور واحد مورخ و ناقل یہی شخص ہے ـــــ اور اس کے بعد زعم تحقیق میں آکر "بیک جنبش قلم" یہ اظہار کر دیا کہ حمید بن مسلم واقعۂ کربلا میں موجود ہی نہ تھا۔

گویا اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ کربلا کا کوئی واقعہ معتبر نہیں ہے۔ اپنے رواۃ کو بولنے کی مجال نہیں تھی۔ دشمن رپورٹر دشمن تھا۔ اور وہ بھی موجود نہ تھا اب واقعہ کے اعتبار کی کیا جہت باقی رہ جاتی ہے۔

یہ عذر ایسا نکل آیا کہ اس کے بعد ہر جزئی واقعہ پر "اجتہاد" کے امکانات وسیع ہو گئے اور یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی کہ روایت حمید بن مسلم کی ہے۔ اور حمید بن مسلم کربلا میں موجود نہ تھا۔

جہاں تک حمید بن مسلم کی شخصیت کا تعلق ہے۔ اس کا مشکوک ہونا یقینی ہے ـــــ صاحب لسان المیزان نے اسے ثقہ ضرور قرار دیا ہے لیکن ان کا خود بھی کیا اعتبار ہے

ان کے یہاں وثاقت کا معیار نہیں ہے جسے وہ معیار وثاقت سمجھتے ہیں۔ ایک لسان المیزان ہی کا ذکر نہیں ہے۔ علمائے اہل سنت میں اکثر ارباب رجال ایسے ملیں گے جن کے یہاں اعتبار و عدم اعتبار کا تعلق راوی کے کردار سے نہیں ہے بلکہ اس کے مذہب سے ہے ذہبی اس سلسلے کی نمایاں شخصیت ہے جسے ہر راوی کی زندگی پر تشیع کی پرچھائیں نظر آتی ہے اور تشیع عدم اعتبار کے لئے واحد سند ہے۔

رہ گیا اس کا کربلا میں وجود ـــــــــــ تو اس کا تذکرہ قدیم ترین مورخین کے علاوہ بعض ارباب مقاتل نے بھی کیا ہے اور ایک انسان کے واقعہ میں موجود ہونے کیلئے اس سے زیادہ ثبوت ضروری نہیں ہے۔

بعض معاصرین کو الاخبار الطوال کے اس فقرہ سے دھوکہ ہوا ہے کہ کربلا سے واپسی کے بعد کوفہ میں حمید بن مسلم نے ابن سعد سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا کہ کربلا سے آپ کی واپسی کیسی ہوئی؟

اور اس نے کہا کہ جس طرح کوئی انسان کسی بدترین مرحلہ سے واپس آتا ہے"

خیال یہ کیا گیا کہ یہ سوال اس شخص کو زیب نہیں دیتا جو خود واقعہ میں موجود رہا ہو۔ یہ سوال اسی شخص کا ہو سکتا ہے جس نے واقعہ میں شرکت نہ کی ہو اور اب حالات دریافت کرنا چاہتا ہو۔

حالانکہ یہ بات سراسر اشتباہ ہے۔ ایسے سوالات دو ہم سفر بھی ایک دوسرے سے کر سکتے ہیں۔ اہل زبان برابر ایسے محاورات استعمال کرتے رہتے ہیں۔

بحیثیت راوی و مورخ کے یہ سوال عجیب ضرور ہے لیکن اس کا حل بھی انھیں کتابوں میں مذکور ہے کہ شہادت امام حسینؑ کے بعد جب خولی سر امام کو لے کر کوفہ جانے لگا تو حمید بن مسلمؓ اسی کے ہمراہ کوفہ چلا گیا۔ طبری، کامل، ارشاد مفید۔

شائد اس کے سفر کی بنیاد یہ رہی ہو کہ کربلا کے واقعات ختم ہو چکے ہیں۔ اور کوفہ کی تاریخ کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ بحیثیت رپورٹر میرا فرض ہے کہ میں وہاں کے واقعات بھی محفوظ کر دوں۔ اور یہ دیکھتا رہوں کہ واقعات کے نقل میں خولی کوئی غلط بیانی یا خیانت تو نہیں کر رہا ہے۔

ابن سعد سے سوال اسی ذمہ داری کی بنا پر تھا جو ایک رپورٹر پر وارد ہوتی ہے یا ایک مورخ از خود اپنے ذمہ لیتا ہے۔

حمید یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے کربلا سے واپس آنے کے بعد کیا واقعات پیش آئے اور غارت گری خیام سے لے کر اسیری تک اہل حرم حسینؑ کے ساتھ فوجوں کا برتاؤ کیا رہا ـــــــ اور وہ خود کن کیفیات سے دوچار رہا ہے۔

مورخ کتنا ہی دشمن اور بدنفس ہو ـــــــــــ اس کے بیانات سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ واقعات کے تفصیلات سامنے آجاتے ہیں

اب یہ صاحب فکر و نظر مولف کی ذمہ داری ہے کہ ان واقعات میں سے مورخ کے مزاج و مقصد کا اندازہ کر کے مشکوک مواد کو الگ کر دے اور مفید و قابل اعتماد مواد کو اخذ

کر لے۔

مقاتل۔ کے بعد کتب مجالس کی باری آتی ہے۔

کتبِ مجالس

ان کتابوں کے مولفین و مصنفین زیادہ حصہ بلکہ تقریباً تمامتر محبانِ آلِ محمدؐ اور پرستاران حسینیت تھے۔

اور ان پر یہ الزام بہت آسان ہے کہ انھوں نے جانبداری سے کام لیا ہے اور فضائل و مصائب میں ضرورت سے زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ علمائے ایران کے بارے میں یہ فقرات عرصۂ دراز سے سننے میں آرہے ہیں کہ واقعۂ کربلا ذاتی طور پر نہایت ہی مختصر واقعہ تھا۔ اس کی کل مدت ایک دن سے زیادہ نہ تھی لیکن اہل ایران کی رنگ آمیزی نے اسے ایک مبسوط شکل دیدی ہے اور وہ ایک مکمل داستان بن گیا ہے۔

یہ بات کسی حد تک سنجیدہ اور معقول کہی جاتی ——— اگر اس کا قائل کوئی غیر مسلم یا دشمن آلِ محمدؐ ہوتا۔

لیکن افسوس کہ یہ فقرات بھی انھیں مسلمانوں کے ہیں جنہیں محبت اہلبیتؑ کا دعویٰ ہے۔ اور وہ " اپنی جانب میں " اس انداز سے رسالت کی اجرت ادا کر رہے ہیں۔

اضافہ و تحریف کا سوال وہاں اٹھایا جاتا ہے ——— جہاں ایک فریق موافق اور ایک مخالف ہو۔ فریقین کے ہم خیال ہونے کے بعد اس قسم کے سوالات عجیب و غریب رازہائے دروںِ پردہ کی غمازی کرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں قاتلانِ حسینؑ کی طرف سے

ہمدردی کے جذبات پوشیدہ ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ مصائب اپنی تفصیلی شکل میں سامنے آئیں یا ان کی طرف نظریں اٹھنے پائیں ——— ورنہ ایسے سوالات کا کوئی محل نہیں ہوتا۔ اور ہر شخص کا یہ جذبہ ہوتا ہے کہ واقعہ صرف واقعہ کی شکل میں نہیں بلکہ اپنے پورے جذبات و احساسات کے ساتھ منظر عام پر آئے۔

ان کتابوں کی تفاصیل کا سبب یہ ہے کہ ان میں واقعہ صرف واقعہ، کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے متعلقات پر بھی نظر رکھی گئی ہے اور ان احساسات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے جن کے زیرِ اثر یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

مورخ واقعۂ کربلا کو "حسینؑ و یزید" سے آگے بڑھ کر دیکھنا یا سوچنا نہیں چاہتا ——— اصحابِ کتب واقعہ کی مزید کڑیاں تلاش کرتے ہیں اور نتیجہ میں وہاں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں تک امامؑ غزالی اپنے فتویٰ سے پہنچانا چاہتے تھے۔

کسی واقعہ پر تبصرہ و تنقید کے ذیل میں وہ جذبات بھی آجاتے ہیں جن کی ترجمانی مورخ کی ذمہ داری نہیں ——— بلکہ مخلصِ اربابِ قلم کی ذمہ داری ہے مورخ کا فرض ہے کہ وہ ان مقتولین کے حالات اور ان کی ہمتوں کا جائزہ لے کر مجاہد کے سن و سال سے موازنہ کرے اور پھر یہ دیکھے کہ اس کار نمایاں کے لئے کتنا بڑا حوصلہ درکار ہے۔ اور اس حوصلہ کی بنیادیں کیا ہیں ——— اس میں کس کی تعلیم شامل ہے اور کس کی تربیت نے اثر کیا ہے۔ اس کے لئے کیا اہتمام ضروری تھا اور کیا انتظام کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مورخ کربلا کے ذیل میں حضرت عباسؑ کی وفاداری اور فداکاری کا ذکر کرتا ہے۔ اور مخلص صاحب قلم اس کی بنیادوں کو تلاش کرتے ہوئے مدینہ تک پہنچ جاتا ہے اور اس منظر کو دیکھتا ہے جہاں مولائے کائنات اپنے بھائی عقیل سے

گفتگو کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں۔ بھیا۔ کسی ایسی خاتون کا پتہ بتائیے جس سے عقد کرنے کے بعد مجاہد اور بہادر فرزند پیدا ہو۔

تصنیف و تالیف کا یہ عنوان سلسلہ بہ سلسلہ ہے۔ پہلے مورخ چند واقعات خشک انداز سے نقل کرتا ہے۔

اس کے بعد ارباب مقاتل ان کے قدرے تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان کی بعض بنیادوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ——— اور اس کے بعد اصحاب مجالس، اسرار شہادت کی جستجو میں پائے ہمت کو آگے بڑھاتے ہیں اور کربلا کو اس کے تمام جذبات و احساسات کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ان کتابوں میں تخیلات و تصورات کی آمیزش بھی ہے ان میں واقعات خشک انداز سے نہیں پیش کئے گئے ہیں۔ بلکہ ان کے مضمرات پر بھی توجہ دی گئی ہے ——— لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ یہ بیانات غیر معتبر اور یہ کتابیں بالکل بیکار ہیں۔

دنیا کا کوئی واقعہ جذبات و احساسات سے الگ ہو کر پیش نہیں آیا۔ کربلا کے مرد اور کربلا کی خواتین اس کائنات سے الگ کوئی مخلوق نہیں تھیں۔ ان کے دلوں میں وہی احساسات تھے جو ایک انسان کے دل میں ہوتے ہیں۔ وہ وہی سوچتے تھے جو ایک انسان سوچ سکتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ جذبۂ قربانی نے انھیں اپنے جذبات پر پابندی لگانے کا حکم دیدیا تھا اور وہ مسلسل اپنا خونِ حسرت پی رہے تھے۔

ارباب مجالس کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک انسان کی حیثیت سے ان جذبات کا سراغ لگایا ——— اور صفحۂ کاغذ پر احساسات کی تصویر کھینچ دی۔ خیام حسینی کے حالات۔ خواتین کے جذبات۔ ماؤں کی آرزو۔ ازدواج کا تصور ۔

بہنوں کی تمنائیں۔ بچوں کے حوصلے۔ جوانوں کے دلولے۔ مجاہدین کی ہمتیں۔ اور مخدرات کی عظمتیں۔ مورخ کے بیان کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ اور نہ اس سے ان امور کی توقع ہی کی جاسکتی ہے۔

یہ ارباب مجالس کا فیض ہے کہ انھوں نے صفاء نفس اور پاکیزگی فکر کا سہارا لے کر واقعات کو ذہنوں سے قریب تر کر دیا ہے اور اب ہمارا فرض ہے کہ حالات و ماحول کے پیش نظر ان جذبات و احساسات کا تجزیہ کریں اور جو چیزیں قابل قبول ہوں انھیں قبول کریں اور جو باتیں قرین عقل نہ ہوں انھیں رد کر دیں۔

تصویر کشی ان کا فرض تھا۔ رد و قبول ہمارا کام ہے۔ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اب ہماری منزلِ امتحان ہے۔ دیکھیں ہم کس حد تک عہدہ برآمد ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

ان سارے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ اپنے مولفین کی غفلت شعاری اور عصبیت طرازی کی بناء پر عظیم شخصیتوں کے بارے میں کافی و وافی مواد فراہم کرنے سے قاصر ہے ——— اس کے اکثر بیانات ناقابل اعتماد ——— اور بے شمار مندرجات غیر مکمل اور غیر مستند ہیں۔

قمر بنی ہاشم کے سوانح حیات مرتب کرنے میں بھی صرف " تاریخی " بیانات پر اعتماد کیا جاتا تو دو چار صفحات سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ جو تاریخ پورے کربلا کے حادثۂ عظمیٰ کو ۶۰ صفحات میں جگہ دے وہ ایک ایک شہید کے بارے میں کیا نقل کرے گی پھر بھی کوشش یہی کی گئی ہے کہ ارباب مقاتل سے وہی بیانات اخذ کئے جائیں جن کی کسی نہ کسی جہت سے تاریخ سے بھی تائید فراہم ہو سکے۔

ارباب مقاتل نے خود بھی بڑی حد تک اختصار سے کام لیا ہے۔ جس کا بنیادی سبب قدیم مآخذ کا کمتر ہونا اور ان کی اختصار پسندی ہی ہے۔

ارباب کتب مجالس نے کسی حد تک تفصیل سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کے بیانات بھی روایۃً کم ہیں۔ اظہار زیادہ۔ [illegible] روایت یا قرآن و سند بنا کر اس سے مناقب و فضائل کا استنباط کیا جا سکے۔

تاہم کوشش یہی کی گئی ہے کہ حتی الامکان مستند بیانات اور معصوم ارشادات پر اعتماد کیا جائے۔ اور واقعات کے نقل میں اس حد تک احتیاط کی جائے کہ کوئی واقعہ "مسلم تاریخی بیان" یا "عقیدہ" سے متصادم و متعارض نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد عصمت ارباب عصمت کا حصہ ہے۔

اہل نظر سے یہ التماس ضروری ہے کہ مجھے میری غلطیوں پر متنبہ فرماتے رہیں تاکہ آئندہ اشاعتوں میں اس کا لحاظ رکھا جائے اور غلطی کی تکرار نہ ہونے پائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہید دین مرتضیٰ

اسلام

خالق کائنات نے انسانی زندگی کے لئے جو وسیع اور ہمہ گیر قانون بنایا ہے اس کا نام ہے اسلام۔

اسلام اپنے اندر فرد و جماعت، سماج و معاشرہ، ظاہر و باطن، عقل و نفس جیسے تمام عناصر وجود کے بارے میں مکمل ضابطۂ حیات رکھتا ہے۔ اس کے دامن میں آغاز حیات سے لے کر آخری لمحات تک کے لئے اصول و تعلیمات کا ذخیرہ موجود ہے اور اس نے زندگی کے کسی شعبے یا حیات کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

دین اسلام کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے دین و مذہب کی تاریخ میں ایک نیا موڑ دیا ہے اور دین و دیانت پر ریسرچ کرنے والوں کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے

مذاہب کی تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ بعض مذاہب تجرد پر زور دیتے ہیں اور بعض مادیت پر ـــــ!

بعض کا خیال ہے انسانی ارتقا مادیت سے علیحدگی اور تجرد پسندی میں پوشیدہ ہے ـــــ انسان کو مادی زندگی سے ہر امکانی دوری اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ جیسے جیسے مادی علائق سے دور تر ہوتا جائے گا اس کا مذہبی وقار بڑھتا جائے گا۔

بعض مذاہب کا کہنا ہے کہ تجرد اور علیحدگی پسندی زندگی سے "فرار" کا دوسرا نام ہے ـــــ زندہ فرد یا زندہ جماعت وہی ہے جو مسائل حیات سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہو اور زندگی کے طوفانوں کو پیچھے ڈھکیل آگے بڑھنے کی ہمت رکھتی ہو ـــــ وہ مرد کوئی مرد نہیں ہے جو حالات سے گھبرا جائے اور وہ بہادر کوئی بہادر نہیں ہے جو پہاڑوں کی گھاٹیوں میں پناہ تلاش کرے۔ انسان اسی دنیا کے لئے پیدا ہوا ہے اور اسے یہیں زندگی گزارنا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ہر سرد و گرم سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کرے اور طوفانوں اور سیلابوں کی زد پر آگے بڑھتا چلا جائے۔ پہاڑوں کے غار یا خانقاہوں کے گوشوں میں پناہ لینا مردِ میداں کا کام نہیں ہے۔

اسلام نے دونوں طریقہ ہائے فکر سے ہٹ کر نیا راستہ نکالا ہے اور اسکی نظر میں نہ وہ تجرد اور علیحدگی پسندی محبوب ہے اور نہ یہ خالص مادیت۔ وہ پہاڑوں کے غار میں زندگی گزارنے کو بھی برا سمجھتا ہے اور پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہو کر زندہ رہنے کو بھی۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ انسان جہد حیات کی ہمت بھی رکھے اور زندگی سے لڑنے کا حوصلہ بھی رکھے ـــــ

میدانِ عمل میں قوت ارادی کو تیز تر بنانے کے لئے عبادت اور بندگی کا سہارا بھی لے اور بندگی کی راہ میں قدم آگے بڑھانے کے لئے وسائل حیات پر بھی عبور پیدا کرے۔

زندگی اور بندگی کے اسی حسین امتزاج کا نام ہے اسلام۔

اسلام سے پہلے یا اسلام کے آنے کے بعد مذاہب دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی رجحان نہیں پیدا ہوا ـــــ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام اپنے اعمال و قوانین میں ایک انفرادیت رکھتا ہے ـــــ اور اس کے درجۂ کمال تک کسی قانون یا نظام کی رسائی نہیں ہے۔

اسلام کی انفرادیت کا اہم سبب یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق انسانی دنیا یا اس کے کسی دور سے نہیں ہے۔ وہ اپنی ساخت و پرداخت میں کسی انسانی فکر کا ممنونِ کرم نہیں ہے اس کے قوانین مالکِ کائنات کے بنائے ہوئے اور اس کے اصول و قواعد رب العالمین کے ترتیب دیئے ہوئے ہیں۔

وہ آسمانی مذاہب میں بھی یہ امتیاز رکھتا ہے کہ اس کا تعلق کسی ایک دور یا ایک دور کے افراد سے نہیں ہے۔ وہ دائمی اور ابدی مذہب ہے اور اس کا تعلق تاریخ بشریت کے ہر دور سے ہے۔ اس نے عظیم ترین روحانیت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور بڑھتی ہوئی مادیت کا بھی حل پیش کیا ہے۔

اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کا ہر مذہب اہل مذہب کی امداد کا محتاج ہو گیا ـــــ اور اہل مذہب نے اپنی عقل کے مطابق مذہب کے قوانین میں اضافہ و ترمیم کا کام انجام دیا ـــــ لیکن اسلام نے اس کام کو بالکل جامد بنا دیا۔

اس نے تشریح و تعبیر کی منزل میں پوری فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے اور "باب اجتہاد" کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھا ہے۔

لیکن اصول وقوانین کی منزل میں کوئی رعایت نہیں کی اور ہر شخص سے اس اختیار کو سلب کر لیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہمارے قوانین میں کوئی نقص نہیں ہے جسے عقلِ بشر مکمل کر سکے اور اس کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کا سہارا لینا پڑے۔

اسلام کے "خداساز" مذہب ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ دنیا کا ہر مذہب اپنے لانے والے، بنانے والے یا ماننے والے افراد کا تابع ہو گیا ہے اور اس کا نام انھیں کے ناموں پر پڑ گیا ہے۔

لیکن اسلام کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ نہیں پیش آیا۔ وہ اپنی عظمت و برتری کو آج بھی بچائے ہوئے ہے اور اپنی انفرادیت کا ڈنکا بجا رہا ہے۔

یہ غلط فہمی یا تجاہل ہے کہ اسلامی قانون کو "محمڈن لا" سے تعبیر کیا جائے یا مسلمان کو "محمڈن" کہہ کر یاد کیا جائے۔ اس کے پیچھے بھی یہ تصور کارفرما ہے کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں کوئی انفرادیت نہیں رکھتا۔ یہ دنیا ہی کا ایک مذہب ہے جیسے کہ دوسرے مذاہب پائے جا رہے ہیں۔

جب کہ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ دوسرے مذاہب افراد کی طرف انتساب برداشت کر سکتے ہیں لیکن اسلام اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اسلام کی نازک مزاجی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے نمائندۂ خاص و مرسلِ اعظمؐ کو بھی اسی صف میں کھڑا کرنا چاہتا ہے جہاں اللہ کے دوسرے بندے اقرارِ عبدیت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ پیغمبرؐ اکرم کو بھی اسی طرح مسلم کہتا ہے جس طرح دوسرے اللہ والے مسلم کہے جاتے ہیں۔

یہ قانون "محمڈن" قانون ہوتا تو اس پر عمل درآمد کرنا سارے سماج کی ذمہ داری

ہوتی اور خود پیغمبرؐ اس ذمہ داری سے مستثنیٰ ہوتے۔

مرسلِ اعظمؐ کا عام انسانوں سے زیادہ پابندی کرنا اور قدرت کا پیغمبرؐ پر مزید فرائض کا عائد کر دینا اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ اس قانون میں کسی بندے کا دخل نہیں ہے یہ خالص الٰہی قانون ہے جسے قدرت نے اپنے رحم و کرم سے مرتب کیا ہے اور اسے "محمڈن لا" کہنا یا اس کے پرستاروں کو "محمڈن" کے نام سے تعبیر کرنا ایک کھلی ہوئی جہالت ہے۔

یہ اور بات ہے کہ نسبت کے لئے مکمل ارتباط ضروری نہیں ہے اور اس اعتبار سے مسلمان کو "محمڈن" یا اسلامی قانون کو "محمڈن لا" بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ کہنے والوں کا یہ مقصد قطعاً نہیں ہے ان کے سامنے ان کی اپنی تاریخ ہے اور انھوں نے اسلام کو اسی پر قیاس کیا ہے۔

مجازی استعمال کا دوسرا نمونہ "مذہبِ جعفری" ہے۔ ظاہر ہے مذہب جعفری کوئی الگ مذہب یا جداگانہ دین نہیں ہے۔ یہ وہی دین و مذہب ہے جو حضور سرورِ کائنات لیکر آئے تھے اور جس کی برسہا برس تبلیغ فرماتے رہے۔

"مذہب جعفری" صرف اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے دور میں مسلمان اپنے اپنے امام کی طرف منسوب ہونے لگے تھے۔ کوئی حنفی تھا، کوئی مالکی، کوئی شافعی تھا اور کوئی حنبلی وغیرہ۔

امام صادقؑ کے پرستاروں نے بھی اپنا امتیاز ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کو "مذہبِ جعفری" کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ "مذہب جعفری" کی نوعیت بھی "مذہب حنفی" یا "مذہب شافعی" جیسی ہے۔

مذہب حنفی یا مذہب شافعی سے مراد وہ اجتہادی قوانین ہیں جنھیں ان "مجتہدین" امت نے بطور استنباط پیش کیا ہے اور ان میں ان کے افکار و آراء کا عکس مکمل طور پر نظر

آتا ہے۔

لیکن مذہب جعفری سے مراد وہ قوانین ہیں جو امامت کے رشتے سے مرسلِ اعظمؐ کے ذریعہ امام جعفر صادقؑ تک پہنچے تھے۔ اور آپ کے سینۂ اقدس میں محفوظ تھے۔ امام جعفر صادقؑ مجتہد نہیں تھے۔

لوحِ محفوظ کے ترجمان تھے اور امام ابوحنیفہ وغیرہ جیسے حضرات واقعہ سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ان کا عمل اجتہادی ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے فتاویٰ پر ان کی فکر کی چھاپ لگی ہوتی تھی۔

امتِ اسلامیہ "مذہب جعفری" سے وہی مفہوم مراد لیتی ہے جو مذہب حنفی وغیرہ کا ہے تو سخت اشتباہ میں ہے۔ لوحِ محفوظ کے ترجمان اور ہیں ——— اور مجتہدینِ امت اور۔

اجتہاد کا سلسلہ آج بھی پوری امت کے لئے قائم ہے اور ہر مجتہد کو قانونی طور پر امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کرنے کا مکمل حق ہے ——— جیسا کہ علامہ قوشجی نے شرحِ تجرید میں حضرت عمر کے اجتہادات کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

"اگر حضرت عمر نے رسولِ اکرمؐ سے اختلاف کیا ہے تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ مجتہدین آپس میں ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف کرتے ہی رہتے ہیں۔"

علامہ قوشجی کی اس رائے کا مدرک یہ ہے کہ ان کی نظر میں رسولِ اکرمؐ کی حیثیت بھی ایک مجتہد کی تھی اور امت کو اجتہادی مسائل میں ان سے بھی اختلاف کرنے کا حق تھا۔

مجھے اس موضوع پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ اگر "بحیثیت مجتہد" رسول اکرمؐ کی رائے سے اختلاف کرنا ممکن ہے تو حضرت ابوحنیفہ تو بہر حال مجتہد ہی تھے ———

انھیں وحی و الہام اور نبوت و رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی رائے سے اختلاف کرنا ہر مجتہد کے لئے بطریقِ اولیٰ ممکن ہوگا۔

امام جعفر صادقؑ کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ آپ رسولِ اکرمؐ کے وارث و نائب اور خدا کے مقرر کئے ہوئے امام ہونے کے رشتے سے لوحِ محفوظ کے ترجمان تھے۔ آپ کی ذاتِ گرامی اجتہاد سے بہت بالا تھی اور آپ اپنے علوم و کمالات کو ابتدائے فطرت سے اپنے ہمراہ لیکر آئے تھے۔

مجتہدینِ امت لاکھوں مراتب اجتہاد طے کرنے کے بعد بھی آپ کی رائے سے اختلاف کا حق نہیں رکھتے۔

اس سے زیادہ تفصیل اس موضوع سے باہر ہے۔ مقصودِ کلام صرف یہ ہے کہ دینِ اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے۔ اس کے اصولِ حیات فکرِ بشر سے بالاتر اور خالقِ کائنات کے وضع کردہ ہیں ——— اس کی بلندیوں تک پہنچنا انسانوں کی بس کی بات نہیں ہے۔

اسلام کا تیسرا امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے تعلیمات کو نہایت واضح اور مفصل انداز سے بیان کیا ہے۔ اس کے تعلیمات میں کوئی الجھاؤ اور اس کے اصول میں کوئی بے نفعی نہیں ہے۔

اس نے انسانی جسم و روح کا لحاظ رکھتے ہوئے دونوں کے ارتقاء کے پیشِ نظر اپنے قوانین کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک اصولی قوانین اور ایک فروعی قوانین۔

اصولی قوانین وہ عقائد و معارف ہیں جن کا دریافت کرنا اور ان پر اعتماد رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اور فروعی قوانین وہ عملی مسائل ہیں جن پر عمل درآمد کرنا ہر مسلمان کا اولین فرض ہے۔

اصول کے ذریعہ عقیدہ کا استحکام اور نفس کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور فروع کے ذریعہ عمل کی اصلاح اور سماج کا سدھار ہوتا ہے۔

اتنے واضح انداز سے تعلیمات کا پیش کرنا بھی ایک دلیل ہے کہ اس کے پیچھے مافوق بشر طاقت کام کر رہی ہے اور اس کے پس منظر میں دستِ غیب کارفرما ہے۔

اسلام کا چوتھا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے قانون کے لئے ایک ایسے نام کا انتخاب کیا ہے جو بیک وقت وسیلہ بھی ہے اور مقصد بھی۔

دنیا کے کسی دوسرے مذہب یا قانون میں یہ خصوصیت نہیں ہے کہ اس نے اس نکتہ کا لحاظ رکھا ہو۔ مذاہب کی تاریخ میں ایسے ہی نام ملتے ہیں جو مقصد کی نشاندہی کرتے ہیں تو وسیلہ سے غافل ہیں اور وسیلہ پر نظر رکھتے ہیں تو مقصد کی طرف سے بے توجہ ہیں۔

یہ تنہا اسلام کی انفرادیت ہے کہ اس نے دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے اور اس جہت سے بھی اپنے قانون کو ہمہ گیر اور جامع بنا دیا ہے

اسلام اصطلاحی اعتبار سے "کلمۂ شہادتین" پڑھنے کا نام ہے ــــــــــ اور مسلمان ہر وہ شخص ہے جو توحیدِ الٰہی، رسالتِ پیغمبرؐ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ چاہے وہ عقائد دلوں کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوں یا صرف زبان پر پائے جا رہے ہوں۔

سوال صرف یہ ہے کہ اسلام جب ایک نظامِ زندگی کی شکل میں آیا ہے اور اس نے اپنا تعارف دین یعنی طریقۂ حیات سے کرایا ہے تو اس کی کل حقیقت "کلمۂ شہادتین" کیونکر بن سکتی ہے۔

کلمہ نہ طریقۂ حیات ہے اور نہ نظامِ زندگی ــــــــــ اسے نہ دین کہا جا سکتا ہے نہ مذہب۔

دین کے معنی ہیں طریقہ اور مذہب کے معنی ہیں راستہ ــــــــــ طریقہ اور راستہ دونوں عملی دستور چاہتے ہیں ــــــــــ لفظوں کا دہرا دینا نہ طریقہ ہے اور نہ راستہ۔

لیکن اس سوال کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی جب ہم اسلام کے حقیقی معنوں میں غور کرتے ہیں ــــــــــ اور یہ دیکھتے ہیں کہ مالک کائنات نے اپنے قانون کا نام اسلام کیوں رکھا ہے۔

اسلام کے معنی ہیں تسلیم، سپردگی اور اطاعت و انقیاد وغیرہ۔

اسلامی قوانین کا وضع کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ لوگ تسلیم اور سپردگی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

یہی ان کا مقصدِ حیات ہے اور یہی روحِ کائنات۔ تسلیم کا فقدان انانیت پیدا کراتا ہے اور انانیت کا وجود تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ دنیا تباہی کے گھاٹ نہ اترنے پائے اور انانیت کو مطلق العنان ہو کر کام کرنے کا موقع نہ ملے۔

یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کس کے مقابلہ میں سپردگی چاہتا ہے۔ اور کس کے مقابلہ میں سرِ تسلیم خم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ تسلیم کا مطالبہ تو اس وقت بھی پورا ہو جاتا ہے جب انسان اپنے وجود کو اپنے نفس اور اپنے خواہشات کے سپرد کر دیتا ہے جذبات کی حکومت ہوتی ہے اور وجود کا سجدۂ نیاز۔

لیکن اس کا واضح حل یہ ہے کہ تسلیم اور سپردگی خود اپنے اندر ایک بنیادی شرط رکھتی ہے۔ تسلیم کا صحیح تصور یہی ہے کہ جو شئے جس سے لی جائے اسی کے حوالے کر دی جائے ــــــــــ امانت کو صاحبِ امانت کے سپرد کر دینا تسلیم ہے۔ خیانت کا نام تسلیم نہیں ہے۔

انسان نے اپنا وجود اپنی ہستی اپنے نفس سے لی ہے۔ تو تقاضائے تسلیم یہی ہے کہ اسے نفس کے حوالے کر دیا جائے۔ اور اگر نفس کو کبھی کسی دوسری ہستی سے لیا ہے تو تسلیم کا تقاضا قطعاً یہ نہیں ہے کہ سراسر وجود پر نفس کو حاکم بنا دیا جائے۔

تسلیم کا صحیح مقتضا یہی ہے کہ جان اس جہاں آفرین کے حوالہ کر دی جائے جس سے لی گئی ہے ——— اور وجود کو اس کی راہ میں قربان کر دیا جائے جس نے اسے عطا کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عملی میدان میں قربانی و سپردگی ہی کو اسلام و تسلیم سے تعبیر کیا ہے۔ کلمۂ شہادتین صرف ایک اعتراف اور التفات ہے کہ ہمارا وجود ہمارا نہیں ہے وہ کسی بلند و بالا ہستی کا عطیہ ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہر وقت اسے اپنے ذہن میں رکھیں اور کسی وقت بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہوں۔ جیسے جیسے یہ احساس شدید تر ہوتا جائے گا تسلیم اور قربانی کا جذبہ محکم تر ہوتا رہے گا۔

تاریخِ اسلام

اہل اسلام نے اسلام کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے سلسلۂ کلام کا آغاز ہجرتِ رسولؐ یا زیادہ سے زیادہ ولادتِ مرسلِ اعظمؐ سے کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اندازِ فکر بالکل غلط ہے۔ اسلام کی تاریخ کا آغاز نہ ہجرت سے ہو سکتا ہے اور نہ ولادت سے۔

اسلام سے مراد کلمۂ شہادتین ہے تو اس کا سلسلہ بعثتِ پیغمبرؐ سے شروع ہوتا ہے جب آپ نے پہلے پہل امت کو کلمہ پڑھنے کی دعوت دی تھی اور دار العشیرہ میں کھلے لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ میں خیرِ دنیا و آخرت لے کر آیا ہوں، تم لوگ کلمۂ توحید

کا اعتراف کرو اسی میں تمہاری فلاح اور تمہاری زندگی کی نجات ہے اس کا کوئی تعلق نہ ولادتِ مرسلِ اعظم سے ہے اور نہ ہجرت سے۔

اور اگر اسلام سے مراد "حقیقتِ اسلام" یعنی تسلیم و سپردگی ہے تو اس کا سلسلہ روزِ اول سے قائم ہے۔

تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جب خالقِ عالم کی طرف سے ایسا قانون نہ آیا ہو جو انسان کو تسلیم و سپردگی کی دعوت دیتا ہو ——— کائنات کا ایسا ذرہ نہیں ہے جو بارگاہِ احدیت میں سرِ تسلیم خم نہ کئے ہو۔

"أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" ——— آلِ عمران ۸۳

کیا یہ لوگ غیر دینِ خدا کو تلاش کر رہے ہیں جب کہ زمین و آسمان کے تمام باشندے اسی پر اسلام لائے ہوئے ہیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ اسلام کلمۂ شہادتین والا اسلام نہیں ہے۔ اس کا مفہوم وہی تسلیم و سپردگی ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

ورنہ کائنات ارض و سما کے ذرے ذرے کے مسلمان ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان میں نہ کوئی کلمہ پڑھنے والا ہے اور نہ بیعت کرنے والا۔

ان کا کلمہ "زبانِ وجود" سے ہے اور ان کی بیعت "دستِ فطرت" سے ہے

یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر ذراتِ خاک بھی کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور عالمِ انسانیت کو ایک ٹھوکر دیتے ہیں کہ ہم بے جان و بے شعور ہو کر مالک کے وجود کا شعور رکھتے ہیں اور تم عقل و شعور رکھنے کے باوجود اس کی بارگاہ میں سر جھکانا نہیں جانتے۔

ارادی طور پر "اسلام" کا سلسلہ جناب آدمؑ کے دور سے شروع ہوا ہے لیکن اس دور میں اسلام کا کوئی مرتب نظام اور باقاعدہ ضابطۂ حیات نہیں تھا۔ اس لئے قرآن حکیم نے سب سے پہلے اس لفظ کو جناب نوحؑ کے تذکرہ میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد ہر دور شریعت میں اس لفظ کی تکرار ہوتی رہی تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ شریعت کے قوانین و قواعد کے بدلنے کے باوجود روح شریعت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور دین اسلام وہی دین ہے جو روز اول انسانی زندگی کے ضابطہ کے طور پر وضع ہوا تھا۔ اور جس کے اصول و تعلیمات میں فلاح و نجات کے جملہ اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔

" فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ " (نوحؑ یونس ۷۱)

جناب نوحؑ کا "من المسلمین" بتا رہا ہے کہ اسلام کا سلسلہ جناب نوحؑ سے شروع نہیں ہوا بلکہ یہ سلسلہ اس سے پہلے بھی رائج تھا اور اسی کی ایک کڑی جناب نوحؑ بھی تھے۔

حضرت نوحؑ کے بعد جناب ابراہیمؑ کا دور شریعت آتا ہے۔ آپ بھی اپنی شریعت کا عنوان "شریعت اسلام" ہی رکھتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

" وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ " ۔ بقرہ ۱۳۲۔

اس بات کی وصیت ابراہیمؑ و یعقوبؑ نے اپنے فرزندوں کو کی کہ اللہ نے تمہارے لئے دین منتخب کر دیا ہے لہٰذا اب مسلمان ہوئے بغیر دنیا سے نہ اٹھنا۔

جناب ابراہیمؑ اور جناب یعقوبؑ کی اسی وصیت کا سلسلہ نسل یعقوبؑ میں جناب یوسفؑ کی طرف منتقل ہوا اور آپ نے اعلان فرمایا۔

" رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ " ۔ یوسف ۱۰۱۔

پروردگار تو نے ایک ملک بھی دیا ہے اور احادیث کی تاویل کا علم بھی عطا کیا ہے تو زمین و آسمان کا خالق اور دنیا و آخرت میں میرا ولی و نگراں ہے مجھے مسلمان دنیا سے اٹھانا اور صالحین سے ملحق کر دینا۔

جناب یوسفؑ کے اس بیان میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ آپ نے وقت وفات اسلام کی دعا کی ہے۔

گویا آپ بتا رہے ہیں کہ یہ دعا باپ کی وصیت کی تکمیل کے لئے کی جا رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اصل مذہب وہی ہے۔ جو حیات کے آخری لمحات میں کام آئے زندگی کے ساتھ ساتھ چھوڑ دینے والا مذہب کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ "صالحین سے ملحق ہونے کی آرزو" بھی اشارہ کر رہی ہے کہ جناب نوحؑ کی طرح حضرت یوسفؑ کی نگاہ میں بھی اللہ کے کچھ صالح بندے ہیں۔ جن سے ملحق ہونے کی تمنا آپ کے قلب نازنین میں کروٹ لے رہی ہے۔

مرسل اعظمؐ کے تذکرہ میں بار بار اس لفظ اسلام کو دہرایا گیا ہے اور اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ جیسے یہ دین مرسل اعظمؐ ہی کا دین ہے اور پہلے پہل آپ ہی کو عطا ہوا ہے۔

اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے جیسا کہ انبیاء سابقین کے تذکروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب نے اپنے اسلام سے پہلے کسی صاحب اسلام کے اسلام کا اعتراف کیا ہے

" قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ عہ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ
مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ " (انعام ۱۴)
" وَجَاهِدُوا عہ فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَ
مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ
هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ
شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۔" حج ۔
" وَوَصَّيْنَا عہ الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ

عہ اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ کیا خالق ارض وسما کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا ولی بنا لوں جب کہ وہی کھلاتا ہے اور خود کھاتا بھی نہیں ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں اور خبردار تم لوگ بھی مشرک نہ بننا۔

عہ راہ خدا میں باقاعدہ جہاد کرو۔ اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور دین میں کوئی سختی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب ہے۔ اس نے تمہارا نام پہلے بھی مسلمان رکھا تھا اور اب بھی ـــــ تاکہ رسول تمہارا گواہ رہے اور تم لوگوں کے نگراں رہو۔

عہ ہم نے انسان کو وصیت کی کہ والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے کہ اس کی ماں نے حمل اور وضع حمل میں ناگواری کا سامنا کیا ہے۔ اس کے حمل اور رضاعت کا زمانہ کل ۳۰ مہینے کا ہے۔ جب وہ انسان توانا ہو کر ۴۰ سال کو پہنچا تو اس نے دعا کی۔ خدایا مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے دی ہے اور میرے والدین کو بھی۔ مجھے عمل صالح کی توفیق دے کہ تو راضی ہو جائے میری ذریت میں صلاح قرار دے میں تیری طرف متوجہ ہوں اور تیرے مسلم بندوں میں ہوں۔

كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُونَ شَهْرًا
حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي
أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ
أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَ
إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔" (احقاف ۱۵)
" قُلْ إِنَّ عہ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ
لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ
(انعام ۱۶۲)

مذکورہ بالا ارشادات میں مرسل اعظمؐ کو جادۂ اسلام پر گامزن رہنے کا حکم دیا گیا ہے ـــــ

آپ نے قوم کو اسی بات کی تعلیم دی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قوم کے اسلام کا انداز سرکار دو عالم کے اسلام سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ قوم نبیؐ کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کے مسلمان بنی ہے۔ اور نبی نے کسی سے درس اسلام نہیں لیا ـــــ قوم کا اسلام دنیا میں آنے کے بعد شروع ہوا ہے اور مرسل اعظم کا اسلام پیدائش کے ساتھ دنیا میں آیا ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے بارے میں اول من اسلم اور "اول المسلمین" کی لفظیں استعمال کی ہیں اور ان لفظوں کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب سے سلسلۂ اسلام شروع ہوا ہے میرا اسلام تمام مسلمانوں سے مقدم رہا ہے۔

عہ اے پیغمبر کہہ دو کہ میری نماز، عبادت، زندگی، موت۔ سب اللہ کے لئے ہے۔ جو عالمین کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں تو پہلا مسلمان ہوں۔

قرآن حکیم نے مسلمانوں کی فہرست میں کائنات ارض وسما، جناب نوحؑ، جناب ابراہیمؑ جناب یعقوبؑ، جناب اسمٰعیلؑ، جناب یوسفؑ ذریت ابراہیمؑ جیسے تمام افراد آجاتے ہیں اور ان سب کے مسلمان ہوتے ہوئے سرکار دو عالم اول المسلمین ہیں۔

اب یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ ساری کائنات مسلم ہے اور حضور سرور کائنات اول المسلمین ہیں۔ آپ اس وقت بھی تھے جب کائنات کا وجود نہ تھا۔ اور صرف موجود ہی نہ تھے بلکہ اپنی صفت اسلام سے متصف بھی تھے۔

روحِ اسلام

گزشتہ بیانات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اپنے دامن میں وسیلہ و مقصد دونوں کے مکمل اشارے رکھتا ہے۔

اس کے پاس وہ کلمہ بھی ہے جس کے ذریعہ انسان اس کے دائرہ عمل میں قدم رکھتا ہے اور وہ منزل تسلیم بھی ہے جہاں تک پہنچنا ہر مسلمان کا مقصد اولین ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ مقصد کا مرتبہ وسیلہ و ذریعہ سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔

وسیلہ کی ساری عظمت و بلندی مقصد ہی کے اعتبار سے طے کی جاتی ہے مقصد بلند ہوتا ہے تو وسیلہ بھی بلند ہو جایا کرتا ہے اور مقصد پست ہوتا ہے تو وسیلہ بھی بے ارزش بے قیمت ہو جایا کرتا ہے۔

اسلام میں کلمۂ شہادتین کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ وہ مقصد تسلیم و سپردگی تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہ کلمہ ایک طرف مرد مسلم میں یہ بلندیٔ فکر پیدا کرتا ہے کہ کائنات ارض و سما اور موجودات عالم امکان میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے آلہ کہا جا سکتا ہو اور جو ذاتی اقتدار

سے ہم سے بلند ہو۔

کائنات ایک "رشتۂ عبدیت" میں جکڑی ہوئی ہے اور پورا عالم امکان ایک مخلوق برادری کی فرد ہے۔

دوسری طرف یہ کلمہ یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ انسان کو متکبر و مغرور نہیں ہونا چاہیئے یہ صحیح ہے کہ اس کائنات خاک میں کوئی اس سے بلند تر نہیں ہے لیکن ایک ہستی ضرور ہے جو اس سے بلند تر اور اس کی خالق و مالک ہے۔

اسی کے فیض کرم کا نتیجہ یہ سارا عالم امکان اور اسی کی نظر رحمت کا صدقہ یہ وجود انسانی ہے۔

وہ اس کائنات میں تنہا اور لاوارث بھی نہیں۔ اس کے ہمراہ ہمیشہ اس کا خالق اور اس کی سرپرستی کے لئے ہمیشہ اس کا مالک موجود ہے۔

وہ ایک " بین بین " حیثیت کا مالک ہے کہ مخلوقات کے اعتبار سے سب کا ہمسر اور خالق کے اعتبار سے ایک بندۂ کمترین۔

اسلام اسی توازن فکر کا نام ہے ——— اور کلمۂ توحید اسی تعلیم و تلقین کا وسیلہ ہے۔

کلمۂ توحید کے ساتھ کلمۂ رسالت " لا آلہ " کی مزید تشریح کے لئے رکھا گیا ہے ——— یہ کلمہ صاف بتا رہا ہے کہ " مخلوقیت " کے اعتبار سے ساری کائنات ایک درجہ رکھتی ہے اور سب مالک کی بارگاہ کے فقیر ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانوں میں باہمی تفوق اور برتری نہیں ہے ——— ہے اور ضرور ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ اس برتری کا سرچشمہ " لا آلہ " نہیں ہے " الا اللہ " ہے۔۔۔ لا آلہ کی منزل میں ساری کائنات ایک درجہ اور ایک منزل رکھتی ہے ——— لیکن اس

کے بعد الا اللہ کی منزل میں ایک خدائے برتر ہے جسے یہ مکمل حق ہے کہ وہ اپنی الوہیت کا استعمال کرتے ہوئے ایک بندے کو دوسرے بندے پر برتری عطا کردے اور باقی بندوں پر اس کی اطاعت فرض کردے ۔

یہ کسی ذاتی تفوق کا نتیجہ نہیں ہے کہ لا آلہ کے منافی ہوجائے اس کا تمام تر تعلق الا اللہ سے ہے اور اسے اس امر کا مکمل اختیار حاصل ہے

خود قرآن حکیم کا اعلان ہے

" تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ "

ہم نے رسولوں میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ۔

مقصد یہ ہے کہ جب ہمارے نمائندوں میں مساوات اور برابری نہیں ہے ۔ اور ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے تو اس کائنات میں برابری کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ۔

یہ ہمارے اختیار کی بات ہے کہ ہم کسے افضلیت دیں اور کن حالات میں دیں۔ اس میں کسی بندہ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ بندہ کی دخل اندازی تو خود "لا آلہ" کے منافی ہے ـــــ غیر خدا کو خدا کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے ۔

مالک کی بارگاہ نیاز میں خاصان خدا کے سجدوں کا ایک اہم فلسفہ یہ بھی ہے ـــــ کہ وہ اس نکتہ سے باقاعدہ باخبر ہیں کہ امکان کے اعتبار سے ہماری حیثیت بارگاہ احدیت میں ایک فقیر سے زیادہ نہیں ہے ـــــ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اپنے فیوض وکرم سے "فقیر" کو "جناب امیر" بنادیا ہے کرم کرنا اس کا کام تھا اور شکریہ ادا کرنا ہمارا کام ہے ۔

" اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا "

یہ لوگ ہمارے بندوں سے حسد کرتے ہیں کہ ہم نے اپنا فضل ان کے شامل حال کردیا ہے تو یاد رکھیں کہ ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت اور ملک عظیم سب کچھ عطا کردیا ہے ۔

یہ کلمۂ توحید "لا آلہ" کی منزل میں انکار کو بلندی دینے کے ساتھ ساری کائنات کو نظر سے گرادیتا ہے اور الا اللہ کی منزل میں وہ جذبۂ تسلیم وسپردگی پیدا کرتا ہے جو اسلام کی واقعی روح اور مذہب کا واقعی مقصد ومقصود ہے ۔

کلمۂ توحید سے بہتر اس کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ـــــ شہادت رسالت حق الوہیت کے استعمال پر ایمان لانے والے کی نشانی ہے ۔ جس کے بعد انسانی غرور خاک میں مل جاتا ہے ـــــ اور خالق کے فیصلوں کو مکمل عظمت حاصل ہوجاتی ہے ـــــ

اس مقام پر اس نکتہ کی طرف توجہ دلا دینا بھی غیر مناسب نہیں ہے کہ کلمۂ توحید اور روح اسلام میں ایک انتہائی دقیق وعمیق تعلق ہے ۔ کلمہ پیکر روح ہے اور روح جان کلمہ ۔"

جس کے اندر کلمہ کا احساس شدید تر ہوگا وہ روح اسلام سے قریب تر ہوگا اور جس کے اندر روح اسلام یعنی تسلیم وسپردگی کا جذبہ شدید تر ہوگا اس کی نگاہ میں کلمہ کی عظمت بھی بھرپور ہوگی ۔

اسلام میں تقیہ کا حکم ضرور ہے ـــــ اور ناگزیر حالات میں کلمہ کا ترک کردینا روا بھی ہے ۔ لیکن حکم تقیہ پر عمل کرنے والے مخلصین مذہب کا کردار بتاتا ہے کہ جب تک جان کا مرحلہ سامنے نہیں آگیا اس وقت تک کلمہ کا ساتھ نہیں چھوڑا ـــــ

جلتی ریت پر لٹائے گئے ـــــــ پتھروں میں دبائے گئے ـــــــ کانٹوں پر چلائے گئے لیکن عقیدہ کے ساتھ کلمہ کبھی ترک نہیں کیا۔

یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ عقیدہ ذہن میں اس قدر راسخ ہے۔ اور تسلیم و سپردگی کا جذبہ اس قدر مستحکم ہے کہ کلمہ کو ترک کر دینے کی بھی ہمت[علہ] نہیں ہے۔

تسلیم و سپردگی کے "روحِ اسلام" ہونے کا سراغ تاریخ کے مختلف ادوار و مراحل سے لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کا سب سے واضح نمونہ قصہ جناب ابراہیمؑ ہے جہاں خلیل خدا ـــــــ حکم خدا کے بعد اپنے فرزند اسمٰعیل کو لے کر قربانگاہ کی طرف گئے اور خاک پر فرزند کو لٹا دیا ـــــــ بیٹا زیر خنجر لیٹا ہوا ہے اور باپ کے ہاتھ میں چھری ہے۔

بیانِ قدرت آواز دے رہا ہے

"فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ۝ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ"

جب ابراہیمؑ و اسمٰعیل منزل تسلیم میں آئے۔ اور باپ نے بیٹے کو لٹا دیا تو ہم نے آواز دی، اے ابراہیمؑ تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم حسنِ عمل والوں کو یوں ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

یہ ہے حقیقت اسلام۔ جہاں تسلیم و سپردگی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ بیٹا جوانی کے جذبات کو پامال کرنے پر تیار رہتا ہے اور باپ "ضعیفی کے سہارے" فرزند کے گلے پر چھری پھیر دیتا ہے

[علہ] آئندہ صفحات میں حضرت علیؑ کے بارے میں اس قسم کا ایک واقعہ نقل کیا جائے گا اور اس کی حقیقی روح کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ جوادی

یہی تسلیم کی منزل اور قربانی کا جذبہ تھا ـــــــ جس کا تقاضا خلیلِ خدا نے تعمیر کعبہ کے موقع پر کیا تھا۔

"وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ"

جس وقت ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے تو ان کی دعا تھی کہ اے سمیع و علیم ہماری محنت کو قبول کر لے اور ہم دونوں کو اپنا مسلم قرار دے لے ـــــــ پھر ہماری ذریت میں بھی ایک امت مسلمہ پیدا کر۔

ظاہر ہے کہ اس اسلام سے مراد کلمہ کا اسلام نہیں تھا۔ اس کا مطالبہ خلیل و ذبیح کے لئے انتہائی غیر معقول اور نامناسب تھا۔

یہ تسلیم و سپردگی کا اسلام تھا جس کے لئے معمار کعبہ ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ اور صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی ایک نسل کے لئے بھی طلب کر رہا تھا۔

ابراہیم و اسمٰعیل کی دعا مستجاب ہوئی اور قدرت نے نسل خلیل میں یہ جذبہ تسلیم رکھ دیا۔ جمیل مظہری نے اپنے مرثیہ میں شب عاشور جناب عباسؑ کی تقریر میں انھیں اسلامی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

جرأت کے معرکوں میں ہمارا نہیں عدیل
ہاشم کا خوں رگوں میں شجاعت کا ہے کفیل
علوی و ہاشمی ہوں کہ نوبادۂ عقیل
ہیں وارثانِ جذبۂ قربانیٔ خلیل

حق کے لئے حصارِ وفا گھیرتے ہیں ہم
بیٹے کے بھی گلے پہ چھری پھیرتے ہیں ہم

رفتارِ اسلام

قرآن حکیم کا مطالعہ گواہ ہے کہ تاریخ مذہب میں سب سے پہلے عبودیت کی قربان گاہ پر تسلیم و سپردگی کا مظاہرہ جناب ابراہیمؑ اور ان کے عزیز فرزند جناب اسمٰعیل نے کیا پھر خلیل و ذبیح کے بعد یہ سلسلہ نسلِ ابراہیمؑ میں چل پڑا ——— اور جو بھی آتا رہا وہ امت مسلمہ کا مصداق بن کر تسلیم و سپردگی کے جذبات کا مظاہرہ کرتا رہا۔

جناب ابراہیمؑ کے دو فرزند تھے ایک اسمٰعیلؑ اور ایک اسحاقؑ۔

جناب اسمٰعیلؑ کی قربانی کا تذکرہ واضح لفظوں میں قرآن حکیم میں موجود ہے ——— نسلِ اسحاقؑ بھی تسلیم و سپردگی سے خالی نہیں رہی اور کسی نہ کسی انداز سے قربانی پیش کرتی رہی۔

جناب اسحاقؑ کے فرزند جناب یعقوبؑ کی وصیت کا تذکرہ سابق میں کیا جا چکا ہے۔

"وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ"۔

جناب یوسفؑ، جناب ایوب، جناب موسیٰ، جناب عیسیٰ کی قربانیوں کا تذکرہ تفصیلی طور سے تاریخوں میں موجود ہے ——— یہاں تک کہ جناب عیسیٰ پر آ کر نسلِ اسحاقؑ میں منصب نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور منصب الٰہی نسلِ اسمٰعیلؑ کی طرف

منتقل ہو گیا۔

سرکار دو عالم خاتم الانبیاء بن کر آئے اور ختم نبوت کا شرف ذریت اسمٰعیلؑ کو حاصل ہوا۔

نسلِ اسمٰعیلؑ ہو یا نسلِ اسحاقؑ ——— دونوں سلسلوں میں اسلام و تسلیم کے مناظر بکثرت پائے جاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے عام امت اور صاحبان منصب کے اسلام میں یہ فرق رکھا ہے کہ عام امت کلمہ پڑھ کر بھی مسلمان ہو جایا کرتی ہے لیکن اللہ کے منصب دار بندے اس وقت تک مسلم نہیں کہے جاتے جب تک منزل تسلیم و سپردگی پر فائز نہ ہوں۔ یعنی ان کا اسلام سپردگی اور قربانی کا اسلام ہوتا ہے اور وہ اپنے ہمراہ یہ جذبہ لے کر ہی اس دنیا میں آتے ہیں۔

اب جس کا جذبۂ قربانی جس قدر مستحکم ہوتا ہے اس کے بارے میں اسلام کا اعلان بھی اتنے ہی واضح انداز سے ہوتا ہے۔

اصطفاء و ارتضاء

اس مقام پر اس نکتہ کا بیان کر دینا بھی انتہائی مناسب ہے کہ مالک کائنات نے نسل اسحاق میں چلنے والے اسلام کا تعارف لفظ اصطفاء کے ساتھ کرایا ہے۔

"انَّ اللّٰه اصطفیٰ لکم الدّین"

اللہ نے تمہارے لئے دین کو مصطفےٰ قرار دیا ہے۔

لیکن جب نسل اسحاق میں جناب عیسیٰ پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور منصب نبوت نسلِ اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوا۔ تو تعارف کا عنوان تبدیل ہو گیا۔

میں نے اپنی کتاب "امامت اور قیامت" میں اس نکتہ کی طرف مفصل اشارہ کیا ہے

کہ قدرت نے ہر شریعت کے محافظ کو نبی یا رسول کا عنوان دیا ہے اور شریعت پیغمبر اسلام کے محافظین کو نبی یا رسول کے بجائے لفظ "امام" سے یاد کیا ہے۔

اس مقام پر یہ بتانا ہے کہ جس طرح محافظین کے عنوان میں تبدیلی آگئی ہے۔ اسی طرح خود دین کے عنوان میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے اور جو دین نسل اسحاق میں اصطفا کے عنوان سے چلتے چلتے حضور سرور کائنات تک پہنچا ہے۔

وہی دین جب غدیر خم کے میدان میں امامت کے حوالہ کیا گیا تو قرآن حکیم کا لہجہ بھی بدل گیا اور اب یہ نہیں کہا جاتا کہ

"اصطفیت لکم الاسلام دینا۔"

ہم نے تمہارے لئے دین کو مصطفےٰ قرار دیا ہے۔

بلکہ یہ اعلان ہوتا ہے۔

"رضیت لکم الاسلام دینا"

ہم نے تمہارے لئے دین کو پسند کیا ہے اور اس سے راضی ہوئے ہیں۔

اب یہ ارباب نظر کے غور کرنے کی بات ہے کہ جس کا اصطفاء ہوتا ہے اسے کیا کہا جاتا ہے ——— اور جس سے رضا متعلق ہوتی ہے اس کا کیا عنوان ہوتا ہے؟

میں اس مقام پر بندوں کی نظریہ پر اعتماد کرنے کے بجائے خود خالق کریم کے نظریہ کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے امامت کے ہاتھوں دیئے جانے والے قانون کا عنوان کیا رکھا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:-

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔"

اللہ نے بعض صاحبانِ ایمان و کردار سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں روئے زمین پر اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح سابق میں بناتا رہا ہے اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جس کا ارتضاء کیا گیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ اس دین کا عنوان ارتضاء ہے۔ اصطفاء نہیں ہے۔

یعنی جو دین روز اول سے اصطفاء کے عنوان سے چل رہا تھا آج ارتضاء کے عنوان سے زندہ ہے۔ اور اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ دین "مصطفیٰ" کا غلبہ وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسکے لئے اس دین کا غلبہ ضروری ہے جس کا ارتضاء کیا گیا ہے۔ اور جسے صحیح معنوں میں "دین مرتضیٰ" کہا جا سکتا ہے۔

دین کے لئے لفظ مرتضیٰ کا استعمال "عالم معنی" میں اس عظیم اتحاد کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے ایک بندۂ مرتضیٰ اور دین مرتضیٰ میں ہے۔ یہ مرحلۂ تفسیر نہیں ہے کہ اس کے لئے حوالوں کی گفتگو کی جائے۔

یہ ایک لفظی مناسبت ہے جو ظاہری ہونے کے باوجود معنویت کا ایک سلسلہ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور دنیا کو بتا رہی ہے کہ غدیر خم کے اعلان کے بعد "اصطفاء" والے دین پر ایمان کافی نہیں ہے بلکہ اس دین کا تسلیم کرنا ضروری ہے جسے ارتضاء کا عنوان حاصل ہے اور جس میں ولایت علی مرتضیٰ ایک رکن کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان مباحث سے قطع نظر اصل مدعا یہ ہے کہ مذہب اسلام تسلیم اور قربانی کا

مذہب ہے ـــــ اس میں جس کی قربانیاں جتنی زیادہ ہوں گی اس کا مرتبہ اتنا ہی بلند و برتر ہوگا۔

تاریخ انبیاء و مرسلین میں قربانیوں کا مسلسل تذکرہ ملتا ہے۔ مال کی قربانی، عزت کی قربانی، وطن و مرکز کی قربانی وغیرہ۔

لیکن "قربانی" کے عنوان سے جان کی قربانی کا تذکرہ صرف جناب اسمٰعیل کے یہاں ملتا ہے ـــــ اور قدرت نے اس قربانی کے اعلان میں ایک خاص اہتمام کیا ہے۔

واقعہ بیان کرنے سے پہلے تمہید میں یہ کہہ دیا گیا۔

" فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ۔

جب اسمٰعیل باپ کے ساتھ دوڑنے کے لائق ہو گئے۔ تب جناب ابراہیمؑ نے ان کے سامنے اپنے خواب کو بیان کیا اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا۔

اب قربان کرنے والا ضعیف باپ ہے اور قربان ہونے والا نوجوان فرزند مالک نے حسن عمل کی خبر دی اور ان کی قربانی قبول ہو گئی۔ لیکن تاریخ قرآن نے ایک "رازِ سربستہ" آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ دیا۔ کہ یہ سارے فضائل، سارے مراتب، سارے کمالات اسی قربانی کا نتیجہ ہیں جو نوجوانی کی منزل تک پہنچنے کے بعد سامنے آئی ہے۔

اب اگر کوئی ایسا قربانی پیش کرنے والا مل جائے جو اپنے نفس کو اسی حوصلہ کے ساتھ اس سے کم عمر میں قربان کر دے تو یقیناً قربانی کے لحاظ سے اس کا مرتبہ قربانیٔ اسمٰعیل سے بلند تر ہوگا۔

نبوت و غیر نبوت کا فرق اپنے مقام پر ہے لیکن جہت تسلیم و قربانی کی عظمت سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جناب اسمٰعیل نے کسی خاص مقصد کے تحت قربانی نہیں دی تھی۔ اور نہ ان کی قربانی کا کوئی خاص مدعا تھا۔

وہ صرف ایک خدائی آزمائش تھی جس میں جناب اسمٰعیل کامیاب ہو گئے اور ذبیح اللہ کا لقب پا گئے۔

کہ اگر (نعوذ باللہ) ناکامیاب بھی ہو گئے ہوتے تو کسی مقصد کا نقصان نہ ہوتا۔ صرف اسمٰعیل کے ثواب میں کمی واقع ہو جاتی۔

لیکن تاریخ میں ایسی قربانیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن کی پشت پر اہم مقاصد کام کر رہے تھے۔ کہ اگر وہ قربانیاں نہ ہوتیں تو سارے مقاصد برباد ہو کر رہ جاتے۔

ظاہر ہے کہ ان قربانیوں کا مرتبہ قربانیٔ اسمٰعیل سے کہیں زیادہ بلند تر ہوگا۔

ہجرت کی رات مولائے کائنات کی قربانی کا یہی عالم تھا کہ یہ علیؑ کا کوئی امتحان نہیں تھا بلکہ پیغمبرؐ کی زندگی کا سوال تھا جو علیؑ کی قربانی پر موقوف تھا۔ علیؑ نے جان کی بازی لگا دی تو نبی کی جان بچ گئی۔ ورنہ ....

اس مقام پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علیؑ بھی (معاذ اللہ) ناکامیاب ہو جاتے تو کوئی نقصان نہ ہوتا؟

اس لئے کہ یہاں نقصان نگاہوں کے سامنے موجود ہے۔ علیؑ قربانی نہ پیش کرتے تو نبی کی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ـــــ اور نبی کی زندگی کا خاتمہ دین و مذہب اصول و فروع، شریعت و قوانین سب کی قربانی اور سب کا خاتمہ تھا جس کا تصور بھی تاریخ مذہب میں نہیں کیا جا سکتا۔

تفصیلات کو ترک کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام حقیقی تسلیم و سپردگی کا مذہب ہے جو جناب آدمؑ سے چل کر انبیاء و مرسلین کے ذریعہ حضور سرور کائنات تک اور اس کے بعد اماموں کے ذریعہ صبح قیامت تک پہنچے گا۔

اور اس کی روح ہے قربانی۔

قربانی کی عظمت کا راز ان بلند مقاصد میں پوشیدہ ہے جن کے پیش نظر قربانی دی جاتی ہے۔

حضرت عباس بن علیؑ کی قربانی پوری تاریخ قربانی میں ایک منفرد عظمت کی حامل ہے اس کی مثال کسی منزل پر بھی تلاش نہیں کی جاسکتی۔

عباس فدیۂ راہ خدا بھی ہیں۔ اور بلند مقصد پر قربان ہونے والے بھی۔ ان کی زندگی میں قربانی بھی ہے اور مقصد کی بلندی بھی۔

اور اس کے علاوہ ایک خصوصیت اور بھی ہے جو کربلا کے شہداء ابرار کو بھی حاصل نہیں ہے۔

وہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر قربانی دینے والا عام اصولوں کے تحت پیدا ہوتا ہے اور اپنے فکر و نظر کے فیصلے کے مطابق قربان ہوتا ہے۔ عباسؑ کی قربانی اس نوعیت کی نہیں ہے۔ آپ کی ولادت قربانی ہی کے مقصد سے ہوئی ہے۔ اور قربانی بھی اس عظیم مقصد کے لئے جس سے بالاتر مقصد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

عباسؑ کو کربلا کی تاریخ کے اعتبار سے "افضل الشہداء" بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ شہادت کے اعتبار سے اس بلندی کا حامل بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں امام زین العابدینؑ نے فرمایا ہے:۔

" میرے چچا عباسؑ کا وہ مرتبہ ہے جس پر روز قیامت سارے شہداء راہ خدا غبطہ کریں گے۔"

عباسؑ شہید ہیں اور " دین مرتضیٰ" کے شہید ہیں۔

صادق آل محمدؐ نے انھیں نکات کے پیش نظر شہادت جناب عباسؑ کو دین و مذہب کی شہادت قرار دیا ہے۔

مقام زیارت میں ارشاد فرمایا ہے:۔

" لَعَنَ اللّٰهُ اُمَّةً اِسْتَحَلَّتْ مِنْكَ الْمَحَارِمَ وَ انْتَهَكَتْ حُرْمَةَ الْاِسْلَامِ"

خدا اس امت پر لعنت کرے جس نے تیرے سلسلے میں محرمات کو حلال کیا اور "اسلام" کی ہتک حرمت کی۔

مطلع وفا

علم نفسیات میں یہ بات بطور مسلمات ذکر کی جاتی ہے کہ انسانی کردار کی تعمیر میں دو قسم کے عناصر کارفرما رہا کرتے ہیں، وراثت اور ماحول۔ وراثت کردار کے داخلی عناصر کی تشکیل کرتی ہے۔ اور ماحول خارجی اثرات کی تعیین کرتا ہے۔

یہ بات اس حد تک عام ہو چکی ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ آئے دن کے تجربات اور صبح و شام کے مشاہدات اس بات کے زندہ گواہ ہیں کہ وراثت و ماحول انسانی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔

اس وقت ان مسلمات سے قطع نظر کر کے مسئلہ کی فلسفی حیثیت پر نظر ڈالنا ہے اور یہ طے کرنا ہے کہ وراثتی اثرات کے کردار پر اثر انداز ہونے کی بنیاد کیا ہے؟

مختصر انداز میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسانی وجود ایک باپ اور ایک ماں کے مشترک عنصر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

"اِنَّا خَلَقْنَا الاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ"

ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

اور یہ عنصر براہِ راست عالم وجود میں نہیں آتا ــــــ بلکہ اس کی تشکیل بھی اس خون سے ہوا کرتی ہے جو ہمہ دم انسان کی رگوں میں دوڑا کرتا ہے اور جس کی مسلسل گردش سے یہ سلسلۂ حیات قائم و دائم ہے۔

خون کا وجود بھی کوئی غیبی وجود نہیں ہے ــــــ بلکہ یہ بھی ان غذاؤں کا نتیجہ ہے جو انسان کے شکم میں جانے کے بعد تحلیل ہوا کرتی ہیں اور مختلف منزلوں سے گزرنے کے بعد خون کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

غذاؤں کا وجود بھی دفعتہً نہیں ہوتا ــــــ ان کے وجود میں بھی دانہ کے خصوصیات، زمین کے کیفیات، آفتاب کی حرارت، ماہتاب کی خنکی، ہواؤں کی سردی و گرمی، فضاؤں کی رطوبت و خشکی وغیرہ کا دخل ہوتا ہے۔

اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد دانہ وجود میں آتا ہے ــــــ اور دانہ کے چند منازل طے کرنے کے بعد غذا کی شکل پیدا ہوتی ہے۔ غذا انسانی شکم کی مشین میں تحلیل ہوتی ہے تو خون بنتا ہے۔ اور خون مخصوص قوانین کے تحت رنگ بدلتا ہے تو نطفہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

انسانی وجود کے لئے اتنے مراحل بھی کافی نہیں ہیں ــــــ یہ مرحلے تو طرفین میں "مادۂ حیات" کی تشکیل کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔ "جدید مخلوق" کی پیدائش میں کچھ مراحل اور باقی رہ جاتے ہیں۔

یہی مادے مخصوص جنسی اعمال کے تحت باہم مخلوط ہوتے ہیں۔ اور مختلف تغیرات کے بعد صنفِ نازک کے رحم میں مستقر ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ باہمی اختلاط کے بعد ان خصوصیات کا باقی رہ جانا ناممکن ہے جو ابتدائی

طور پر پائے جا رہے تھے۔

خالص مادہ کے اثرات اور ہوتے ہیں، اور مخلوط مادہ کے اثرات اور۔ کسی انسان کے بنیادی "اثرات"، کو طے کرنے کے لئے کسی ایک طرف کے خصوصیات پر نظر کرنا اور دوسرے کے کیفیات کو نظر انداز کردینا شدید قسم کی غفلت ہے۔ اختلاط کا ایک واضح اثر یہ ہوتا ہے کہ جس مادہ کے جراثیم غالب آجاتے ہیں وہ باقی رہ جاتا ہے اور پھر دوسرے کے اثرات تقریباً ختم ہوجاتے ہیں یا کم از کم دب کر رہ جاتے ہیں۔

نسلوں میں چلنے والی بیماریوں کا بنیادی راز یہی ہے کہ کسی فریق کے خون میں فاسد جراثیم پیدا ہوگئے تو اس کے امکانات قوی ہوتے ہیں کہ دوسرے جراثیم ان پر اثر انداز نہ ہوسکیں اور بالآخر انھیں بھی اثر پذیر ہونا پڑے اور نتیجہ میں کوئی کمزور مخلوق عالم وجود میں آجائے۔

" مخلوط مواد" کے اثرات کے بعد" رحم مادر" کی باری آتی ہے۔ یہاں آنے والی مخلوق کو ایک دو دن نہیں بلکہ تقریباً ۹ مہینے زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ اور یہ طویل مدت "خاموشی" کے ساتھ اپنے ماحول سے الگ ہوکر نہیں گزارنا ہوتی۔ بلکہ اس میں بھی پورے ماحول سے اثر لینا پڑتا ہے۔

خونِ جگر کی غذا ملتی ہے تو اس خون کے سارے اثرات دخل انداز ہوتے ہیں شکم مادر کا ماحول لیتا ہے تو ماں کے ذہنی اور مادی کیفیات کا اثر بھی ہوتا ہے۔ اور اسی لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ نئی مخلوق کی تشکیل میں باپ سے زیادہ ماں کا دخل ہوتا ہے۔ اور باپ کی احتیاط سے زیادہ ماں کا پرہیز لازم و ضروری ہوتا ہے

دورانِ خون اور ذہنی کیفیات

مادی خصوصیات کے بعد اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے کہ دورانِ خون بھی صرف طبیعی قوانین کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا عمیق تر تعلق انسان کی ذہنی کیفیت اور اس کے نفسیاتی تاثرات سے بھی ہوتا ہے۔

پرسکون حالات میں دوران خون کی رفتار اور ہوتی ہے۔ اور ہیجان کے موقع پر رفتار اور۔

آپ نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ مسرت یا غم کے موقع پر جب بھی غیر معمولی حالات پیدا ہوجاتے ہیں تو خون کی رفتار میں ایک نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے اور یہی سلسلہ کبھی کبھی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے انسان کا ہارٹ ہی فیل ہوجاتا ہے۔

دور حاضر میں دوران خون کی بیماری کا واحد راز یہی ہے کہ انسانی ذہن الجھنوں کا شکار ہوگیا ہے اور زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جب ذہن پورے سکون کے ساتھ کام کرسکے اور خون کا دوران اپنے معمولی انداز پر باقی رہ سکے۔

یہ باتیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ دنیا کی ہر آنے والی مخلوق اپنے والدین کے مادی اور معنوی اثرات و تخیلات کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شریعت اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مباشرت کے مختلف قوانین میں ایک قانون یہ بھی رکھا ہے کہ ذہن تمام تر جنسی عمل کی طرف متوجہ رہے۔ اور دنیا کے دوسرے "اضطراب انگیز" خیالات جگہ نہ پانے پائیں۔ زبان پر ذکر الٰہی رہے اور دل میں یاد پروردگار:

ذہن پر کوئی غلط بوجھ نہ پڑے اور آنے والی مخلوق کی تشکیل میں غلط عناصر

نہ شامل ہونے پائیں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ ان خصوصیات میں اکثر باتوں کا معصومین کی تخلیق سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے انھیں محل کلام سے الگ کرنے کے بعد مسئلۂ تخلیق پر نظر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نیک صورت و نیک سیرت اولاد کی تخلیق میں صرف مقدر کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی ایک قسم کی تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ عام ذہن اس تدبیر کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اپنی تدبیر کی غلطی کو تقدیر کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

عالم تدبیر میں ایسے انسان کم ہی ملیں گے جو عقد کی ابتدائی منزلوں سے لیکر حمل کی آخری منزلوں تک ان تمام شرائط و قواعد کا لحاظ رکھتے ہوں جو ایک صالح اولاد کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

جنسی ہیجان۔ سماجی اضطراب۔ حالات کا دباؤ۔ مسائل حیات کا الجھاؤ۔ انسان کو جملہ قوانین سے غافل بنا دیتا ہے اور نتیجہ میں تدبیر کا مسئلہ تقدیر کے حوالہ ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اکثر محتاط اور متقی افراد کے یہاں بھی بد سیرت اور بد صورت اولاد کا پیدا ہو جانا اس قانون کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

تخلیق کا تعلق کسی ایک فریق سے نہیں ہوتا اس کا تعلق دونوں فریق سے ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ فریق دوم اس قدر محتاط و پرہیزگار نہ ہو جس قدر احتیاط اور پرہیزگاری ایسی "پاکیزہ امانت" کے تحفظ کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں پسر نوح کی "بد نفسی" کا تذکرہ کیا ہے وہیں زوجۂ نوح کی خیانت کا بھی تذکرہ کر دیا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ باپ کی عدم احتیاط کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ماں کی "نفسیاتی خیانت" کا اثر ہے۔

اس سے بالاتر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ خود معصوم کے لئے بھی ہمہ وقت یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جب بھی کوئی رشتہ ازدواج قائم کرے تو اپنے شایان شان کائنات کی سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار عورت ہی سے رشتہ قائم کرے۔

معصوم عالم ظاہر میں انھیں قوانین کا پابند ہوتا ہے جو قوانین عام امت کیلئے نافذ کئے جاتے ہیں۔ اس کے رشتہ ازدواج میں بھی "آنے والی نسل" کے علاوہ بے شمار سیاسی، سماجی، معاشی مسائل کا دخل ہوتا ہے۔

وہ کبھی اسلام کے سیاسی مسائل کے پیش نظر عقد کرتا ہے اور کبھی سماجی اور معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے۔

سرکار دو عالمؐ کی متعدد شادیوں کے پس منظر میں بھی یہی مصالح کام کر رہے تھے۔ کہیں دشمن کی تالیف قلب کے لئے عقد کیا گیا تو کہیں بیواؤں کی پرورش کے لئے۔ کہیں قوم و ملت کی تعلیم و تربیت کے لئے ازدواج تھا۔ تو کہیں مصالح عامہ کے تحفظ کے لئے۔

اس منزل پر یہ تصور ہی غلط ہے کہ ام حبیبہ کو گھرانے کے اعتبار سے خدیجۃ الکبریٰ جیسا ہونا چاہیئے۔

اس لئے کہ دونوں کے عقد کی بنیادیں ایک نہیں ہیں تو دونوں کے حالات ایک جیسے کیسے ہوں گے۔

خدیجہ سے عقد سلسلۂ نسل کو قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا اور ام حبیبہ سے عقد دوسرے مصالح اسلام کی بناء پر۔

قیام نسل کے ازدواج میں ان تمام باتوں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے جو عام رشتوں میں درخور اعتناء نہیں ہوتیں۔ جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ معصوم بھی بلند و بالا خاتون کا انتخاب اسی وقت کرتا ہے جب اس کے ذریعہ کسی "خاص فرزند" کو عالم وجود میں لانا

ہوتا ہے ورنہ عام حالات میں اس قدر شدتِ انتظام کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

امتیازی وجود

جناب عباسؑ کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ ان کا وجود ایک مقصدی وجود تھا ۔

امیر المومنینؑ نے ان کی والدۂ گرامی سے عقد عام ازدواجی مصالح کے تحت نہیں کیا تھا بلکہ اس کا ایک خاص مقصد تھا جس کے لئے آپ نے اس اہتمام سے رشتہ قائم کیا تھا ۔

ظاہر ہے کہ جب معصوم کے پیش نظر کوئی اہم مقصد ہوگا تو وہ اس کی تکمیل کے لئے وہ تمام انتظامات بھی کرے گا جو عام انسان نہیں کر سکتا ۔ جناب عقیل سے مشورہ کرنا بھی اسی اہتمام کے اظہار کے لئے تھا کہ یہ عقد عام رشتوں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے ۔

امیر المومنینؑ کی حیات طیبہ میں جناب ام البنین کے عقد کے قبل اور جناب ام البنین کے عقد کے بعد بھی متعدد رشتوں کا تذکرہ ملتا ہے لیکن کسی رشتہ میں جناب عقیل کے مشورہ کا ذکر نہیں ہے ۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب عقیل کل تک "نساب قریش" نہ تھے اور آج ہو گئے ہیں ۔ یا امیر المومنینؑ کو پہلے ان کی رائے پر اعتماد نہ تھا اور آج پیدا ہو گیا ہے ۔ یا اس رشتے کے اعلان میں کوئی خاص مصلحت ہے جو کل تک حاصل نہ تھی ۔

ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا ۔

بات صرف یہ تھی کہ مولائے کائنات اپنے عقد کے اہتمام کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کرا دینا چاہتے تھے اور آپ کا مقصد یہ تھا کہ آنے والی نسلیں یہ محسوس کریں

کہ یہ عقد عام رشتوں سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور اس کا سلسلہ مخصوص مصالح کے تحت قائم ہوا ہے ۔

اس کے بعد جب انسان ان مصالح پر غور کرے گا اور مولائے کائنات کی ایک فرزند شجاع کی خواہش سامنے آجائے گی ۔ تو آنے والے فرزند کی عظمت و اہمیت خود بخود منظر عام پر آجائے گی ۔

اس کے علاوہ ایک امکان یہ بھی ہے کہ مولائے کائنات خود جناب عقیل کو بھی اپنے بلند ترین مقصد میں شریک بنانا چاہتے ہوں اور آداب اسلامی کے پیش منظر واضح لفظوں میں اس مدعٰی کا اظہار نہ کرنا چاہتے ہوں ۔

اپنے عقد کے ذیل میں آپ نے جناب عقیل کو بھی متوجہ کر دیا کہ میرے پیش نظر ایک اہم مقصد ہے جس کے لئے میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں اور عقد کا یہ خصوصی اہتمام کر رہا ہوں ۔ کہ ایک فرزند شجاع پیدا ہو اور اسلام کے خاص موقع پر کام آئے ۔

جناب عقیل پر اس اشارہ کا خاصہ اثر ہوا اور جس طرح مقصد شہادت کے لئے مولائے کائنات نے حضرت عباسؑ کو مہیا کیا تھا ۔ جناب عقیل نے حضرت مسلمؑ کو مہیا کر دیا اور یہ سلسلہ اس طرح قائم ہو گیا کہ واقعۂ کربلا میں جس طرح اولاد علیؑ نے قربانیاں پیش کیں اسی طرح اولاد عقیل کا نام بھی سرفہرست نظر آتا ہے ۔

میرے اس دعوٰی کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ واقعۂ کربلا میں جناب ام البنین کی اولاد میں چار جوانوں نے قربانیاں پیش کی ہیں ۔ عبد اللہ ، عثمان ، جعفر اور عباس علمدار اور چار ہی کی تعداد اولاد عقیل میں بھی نظر آتی ہے ۔ جعفر بن عقیل ، عبد الرحمن ابن عقیل ، عبد اللہ بن عقیل ، موسیٰ بن عقیل ۔

امیر المومنینؑ نے جس عظیم مقصد کی طرف متوجہ کرانا چاہا تھا ، جناب عقیل نے اسے باقاعدہ محسوس کر لیا ۔ اور پورے طور سے اس جذبۂ ایثار و قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے

جس قدر فدیے مولائے کائنات نے راہ خدا میں پیش کرنے کے لئے فراہم کئے اسی قدر فدیے حضرت عقیل نے بھی پیش کر دیئے۔

مذکورہ بالا روایت میں مشورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس کے بارے میں یہ بحث اٹھائی جائے کہ امام غیر امام سے مشورہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور مشورہ کرنا عدم علم کی دلیل ہے یا تقاضائے مصالح کی؟

نوٹ:- نسل و نسب کے مزید مسائل کی تحقیق کے لئے میری کتاب "خاندان اور انسان" کا مطالعہ کیا جائے۔

مشاورت

دین اسلام کے اجتماعی قوانین میں ایک اہم قانون یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنے دنیاوی معاملات میں استبداد و استقلال سے کام نہیں لینا چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو دوسرے افراد سے مشورہ بھی کرنا چاہیئے۔

مشورہ کے بارے میں کثرت سے روایات کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ شائد اس طرح پروردگار عالم کسی زبان پر حقیقت کو جاری کر دے اور مشورہ کرنے والا اس "سربستہ راز" تک پہنچ جائے۔ جہاں تک اپنی مستقل رائے کا پہنچنا ممکن نہ تھا۔

دوسری اہمیت یہ ہے کہ شریعت اسلام نے استشارہ کو استخارہ پر مقدم کیا ہے اور بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اپنے مالک سے طلب خیر کرنے سے پہلے اللہ کے مخلص بندوں سے مشورہ کریں۔

شاید یہ مشورہ انھیں اس صحت مند نتیجہ تک پہنچا دے جہاں سے صلاح و فلاح کے دروازے کھل جائیں اور استخارہ کی ضرورت نہ رہ جائے۔

یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ مالک سے طلب خیر کے ممکن ہوتے ہوئے بندوں سے رائے لینے کی ضرورت کیا ہے۔

بہتر یہی تھا کہ بندہ براہ راست مالک سے صلاح و فلاح کا فیصلہ کرا لیتا اور بندوں کو اپنے اسرار پر مطلع نہ ہونے دیتا۔

لیکن اس توہم کا واضح حل یہ ہے کہ استخارۂ تسبیح ہو یا تفاؤل قرآن حکیم کسی بھی مرحلہ پر مالک کائنات براہ راست سامنے آکر اپنی رائے نہیں بیان کرتا۔ اس نے ایک طریقہ بتا دیا ہے کہ اس طرح میری رائے دریافت کی جاسکتی ہے۔ اب اگر اس نے مشاورت کا راستہ بھی بتا دیا ہے تو مشاورت کے نتیجہ میں سامنے آنے والی رائے بھی ایک قسم کے استخارہ ہی کی رائے ہوگی ——— اور زبانِ مومن کو تسبیح کے دانوں ہی کا درجہ دیا جائے گا۔

مشاورت کی یہی اہمیت تھی کہ مالک کائنات نے خود حضور سرور کائنات کو حکم دیا تھا۔

"شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ"

پیغمبر آپ ان لوگوں سے مشورہ کیا کریں۔

ظاہر ہے کہ رسول اکرمؐ اپنے علم کی بناء پر ان کے علم کے محتاج نہ تھے۔ اور نہ اپنے مالک سے اتصال کی بناء پر کسی دوسرے کی رائے کے پابند تھے۔ لیکن اس کے باوجود مالک نے ہی مشورہ کا حکم دے دیا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مشاورت ضروری ہے اور استقلال کسی طرح بھی مالک کو پسند نہیں ہے۔

یہ اور بات ہے کہ مشاورت کا تعلق دنیاوی امور سے ہے جہاں بندوں کو رائے دینے کا حق ہے اور صاحب ضرورت کو رائے لینے کا حق ہے ورنہ مذہب کے

تعلیمات اور دین کے اصول میں کسی مشورہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

"خلافت و امامت" دین کا مسئلہ ہے اس میں کسی مشاورت کا گزر نہیں ہے۔ دوسرے مسائل میں مشاورت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ایک اجتماعی ضرورت ہے جس کی تکمیل ہر فرد بشر کا فرض ہے۔

یہ سوال ضرور رہ جاتا ہے کہ ایک "مرکزی" شخصیت کو کسی کے مشورہ کی کیا ضرورت ہے اور اسے اس مشورہ سے کیا حاصل ہوگا۔

لیکن اس کا جواب بھی دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اشکال مالک کے امتحان اور ابتلاء پر بھی وارد ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے؟

کیا اسے اپنے بندوں کی واقعی حیثیت معلوم نہیں ہے کہ امتحان کے ذریعہ دریافت کرنا چاہتا ہے ——— یا ان کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی امتحان لینا چاہتا ہے۔

اگر اس مقام پر یہ فرض کیا جائے کہ مالک حالات سے باخبر ہے لیکن بندوں پر تمام حجت کرنا چاہتا ہے تو نبی اور امام کے مشورہ کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے اور اس مشورہ کا مفہوم بھی یہی ہوگا کہ نبی یا امام امت کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ ایسے اہم مسائل میں تمہارا انداز فکر کیا ہے اور نتیجہ میں تمہاری فکر کس قدر صائب و صحیح ثابت ہوتی ہے۔

اس طرح انھیں اپنی صحیح حیثیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور آئندہ بلا سبب دخل در معقولات سے گریز بھی کریں گے۔

اور اگر مالک کے امتحان کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح بندے عمل کی رفتار تیز کر دیں اور راہ تقرب میں قدم آگے بڑھائیں تو نبی اور امام کے مشورہ کی بھی یہی توجیہ کی جاسکتی ہے

کہ یہ اصحاب مشاورت کو اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانے کا بہترین ذریعہ ہے جس کے لئے صاحب معاملہ مشورہ کر رہا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر صاحب معارف اور اغانی کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ جناب امیر نے اپنے عقد کے بارے میں جناب عقیل کو "نسابِ قریش" سمجھ کر مشورہ کیا تھا تو بھی یہ نتیجہ نکالنا قطعی غلط ہے کہ جناب عقیل ان حالات کو جناب امیر سے بہتر جانتے تھے اور امام کا علم ایک "عام" امتی کے مقابلہ میں ناقص یا محدود تھا۔

مشورہ میں تعلیم امت کے علاوہ بھی بہت سے مختلف مصالح ہو سکتے ہیں ان میں سے بعض کی طرف سابق میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اور ایک اہم مصلحت یہ ہے کہ اس طرح جناب عقیل کے نفس کی بلندی کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ کہ انھوں نے فوراً ایک بہادر خاندان کی خاتون کی طرف اشارہ کر دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ بھیا ایسے فرزند کی کیا ضرورت ہے جس کا انجام شہادت و قربانی ہو؟

جناب عقیل راہ خدا میں قربانی کی اہمیت کا کھلی اعلان کر رہے تھے اور جناب امیر اس اعلان کی تصدیق و توثیق کر رہے تھے۔

قرآن حکیم نے بھی رسول اکرمؐ کو مشورہ کرنے کا حکم اسی مصلحت کی بناء پر دیا تھا۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے۔

"فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ"

اور جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں۔

مقصد یہ ہے کہ امور دنیا میں مشورہ کرنا ضروری ہے لیکن مشورہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مشیرانِ کار ہی پر اعتماد کیا جائے اور انھیں کی رائے کو حرف آخر کا درجہ دیا جائے۔ آخری عزم اپنے افکار و نظریات کی بنا پر ہونا چاہیئے اور مقام عمل میں رب العالمین پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

مشورہ تالیف قلب کا بھی کام کرتا ہے اور ما فی الضمیر کے اعلان کا بھی۔

مشورہ سے یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ مشیرانِ کار کا ذہنی رجحان کیا ہے اور وہ مسائل پر کس زاویۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں۔ زیر نظر واقعہ کے بعد جناب مسلم کا وجود اس بات کا گواہ ہے کہ جناب عقیل کے ذہنی رجحانات وہی تھے جن کی طرف جناب امیر متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عقیل امام وقت نہ تھے۔ انکے پاس علم غیب نہ تھا۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے بخوبی آگاہ نہ تھے اس لئے انھوں نے اس عظیم مستقبل کیلئے از خود کوئی انتظام نہیں کیا اور جیسے ہی مولائے کائنات نے اس حادثۂ عظمیٰ کی طرف متوجہ کر دیا عقیل اس فکر میں پڑ گئے کہ میری طرف سے بھی ایک ہدیہ بارگاہ احدیت کے لئے مہیا ہونا چاہیئے اور مجھے بھی راہ حق میں قربانی کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصد مشورہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے جناب امیر کا مشورہ کرنا ضروری تھا اور اس سے علم امامت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی تعلق جناب عقیل کی مسئلۂ انساب میں اعلمیت سے ہے۔

شجرۂ طیبہ

انسانی زندگی کے امتیازات میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مالک کائنات نے فطرت بشر میں کچھ ایسے جذبات بھی ودیعت کر دیئے ہیں جن سے انسان سلسلۂ نسل کو صرف وقتی جذبات کی تسکین نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کی پشت پر بے پناہ احساسات ورجحانات کی کارفرمائی کا بھی تصور رکھتا ہے۔

خواہش اولاد۔ جذبۂ اخوت۔ احترام نسب یہ وہ جذبات ہیں جو ایک انسان کو سلسلۂ نسب کی ترتیب پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے نتیجہ میں انسان اپنے کو ایک رشتے کی زنجیر میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔

حیوانی نسل میں حلال وحرام کا گزر نہیں ہوتا —— اس کے جنسی رابطہ میں شعور وادراک کا دخل نہیں ہے اس لئے وہ تسکین جذبات کے لئے حسن انتخاب کا بھی قائل نہیں ہے۔

اس کی زندگی "رزق سرراہ" پر گزرتی ہے۔ وہ نہ کسب معاش کا قائل ہے نہ تسکین جذبات کا۔

سرراہ افتادہ غذا میں اس کے معاشیات کا حل ہیں اور غیر شعوری تسکین اس کے جذبات باطن کا علاج۔

انسانی زندگی اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے یہاں جذبات واحساسات بھی ہیں اور رشتہ وقرابت کے خیالات بھی —— وہ نسل ونسب کا بھی قائل ہے اور سماجی جکڑبند کا بھی۔

وہ زندگی کے راہ وچاہ سے بھی باخبر ہے —— اور نسلی اثرات کی کارفرمائی سے بھی۔

اسی لئے ہر حسن وقبح کے پس منظر میں اس کی جڑیں تلاش کرنے کا عادی ہے۔ اور ظاہر سے باطن کا سراغ لگانا اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

شجرۂ نسب کی اہمیت بھی انھیں انسانی جذبات[له] کا نتیجہ ہے۔ انسانی ذہن میں

[له] علامہ محمد امین بغدادی نے "سبائک الذہب" کے مقدمہ میں علم الانساب کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نسب ازدواج کے مسئلہ میں کفو کی تعیین کے کام آتا ہے جیسا کہ امام شافعی کا ارشاد ہے کہ قریش کے دوسرے قبائل ہاشمی اور مطلبی کے کفو نہیں ہیں۔ غیر قریشی قریش کا کفو نہیں ہے۔ کنانی عورت کے بارے میں دو قول ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ غیر کنانی کنانی کا کفو نہیں ہے۔ اہل عجم کے سلسلے میں نسب کا لحاظ کیا جائے یا نہیں؟

اس میں بھی دو قول ہیں اور صحیح قول یہی ہے کہ وہاں بھی نسب کا اعتبار ضروری ہے۔

امام ابوحنیفہ کے مذہب میں قریش سب ایک دوسرے کے کفو ہیں اور باقی عرب

(بقیہ حاشیہ ص۱۰۲ پر)

"نسلی اثرات'' اس حد تک راسخ ہیں۔ کہ ایک زمانہ میں انسان جانوروں تک کا شجرہ مرتب کیا کرتا تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس نسل کا جانور اصیل ہوتا ہے۔ اور اس نسل کا غیر اصیل۔

ظاہر ہے کہ جب حیوانی زندگی میں نسلی اثرات ظاہر ہو سکتے ہیں۔ تو انسانی حیات تو بہر حال ان نتائج کی پابند ہے۔ اور اس میں ان حالات کا پیدا ہو جانا بہر صورت ناگزیر ہے۔

مولائے کائنات نے جناب عقیل سے گفتگو کے دوران انھیں "نسلی اثرات'' کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ایک بہادر خاندان کی عورت سے عقد کرنا چاہتا ہوں اور جناب عقیل نے اسی نکتہ کی تائید کی تھی کہ عرب میں ام البنین کے بزرگوں سے زیادہ بہادر اور مرد میدان کوئی قبیلہ نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ حضرت عباسؑ کی سیرت مبارکہ پر نظر ڈالنے سے پہلے ان نسلی

بقیہ ص۱۰۱ سے آگے) آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے بعض وجوہ و اسباب کی بناء پر بعض انساب کو بعض پر فضیلت دی ہے اور سادات کو غیر سادات پر مقدم کیا ہے لیکن اس کا تعلق رشتۂ ازدواج سے نہیں ہے۔ ازدواج کا سلسلہ اور ہے اور احترام و اعزاز کا سلسلہ اور۔

ازدواج کے لئے اسلام کا ایک قانون ہے۔

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا کفو ہے اس سے زیادہ کسی شے کا مطالبہ صحیح نہیں۔ نسلی امتیاز احترام کی حدوں میں درست ہے لیکن اس کے آگے اسلامی آئین کی توہین و تحقیر بن جاتا ہے۔

اثرات'' اور نسبتی شرافتوں کا جائزہ لیا جائے۔ جو عام طور سے انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن کے لئے خاص طور پر مولائے کائنات نے اہتمام کیا تھا۔

حضرت عباسؑ کا آبائی سلسلہ نہایت درجہ واضح و درخشاں ہے۔ آپ حضرت علیؑ کے لال اور حضرت ابو طالبؑ کے پوتے تھے۔ عبد المطلب کی جان اور ہاشمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

یہ سلسلۂ نسب آگے بڑھ کر حضرت اسمٰعیل سے مل جاتا ہے جو اسلامی تاریخ میں ایثار و وفا اور جذبۂ قربانی کی پہلی یادگار ہیں جن کے حصہ میں تعمیر حرم بھی آئی تھی۔ اور قربانی راہ خدا بھی۔

مادر گرامی کی طرف سے بھی آپ کا سلسلۂ نسب عرب کے عظیم ترین شجاع و بہادر خاندان سے ملتا ہے۔ ایسا باہمت و جرأت خاندان جس کے ہر شعبۂ حیات میں ہمت ہی ہمت ہے اور شجاعت ہی شجاعت۔

دنیا میں کم ایسے اتفاقات ہوئے ہوں گے کہ کسی شخص کے خاندان کے ہر شعبہ میں فضائل ہی فضائل رہے ہوں اور کمالات ہی کمالات کی جلوہ فرمائی رہی ہو۔ جناب عباسؑ کو مالک کائنات نے یہ شرف بطور خاص عنایت فرمایا تھا۔ آپ کے شجرۂ نسب میں ہر طرف شجاعت ہی شجاعت تھی۔

باپ ——— فاتح اعظم اسلام اور شیر خدا۔ جس کی شان میں فضائے کائنات۔ لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیٌّ سے گونج رہی تھی۔

دادا ——— ناصر دین حق، محسن رسالت، ابو طالب جس کے وجود اقدس کی ہیبت سے عرب ہزاروں مخالفتوں کے باوجود مرسل اعظم کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا اور جس کے مرنے کے بعد قدرت نے اپنے حبیب کو وطن چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔

دادی ـــــ اسد کی لاڈلی ـــــ فاطمہ۔ جن کی قوت قلب کا یہ عالم کہ شکم اقدس میں فرزند۔

وقت ولادت قریب اور خانۂ کعبہ کی دیوار شق ہو رہی ہے۔ مگر قدم پیچھے ہٹانے کے بجائے آگے بڑھتی جا رہی ہیں اور نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ تین دن تک خانۂ خدا میں قیام پذیر ہیں۔

مادرِ گرامی ـــــ فاطمہ[۱] بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن الوحید بن کعب

۱؎ عمدۃ الطالب میں آپ کا اسم گرامی فاطمہ درج کیا گیا ہے۔ تاریخ الخمیس نے "والیسی" لکھا ہے۔ ص۳۱۷ لیکن آپ نے ام البنین کے لقب سے اس قدر شہرت حاصل کر لی ہے کہ اکثر مورخین کو آپ کا اسم گرامی معلوم نہیں ہو سکا یا ان لوگوں نے اس کا ذکر ضروری نہیں سمجھا۔ چنانچہ حسب ذیل کتب میں آپ کا تذکرہ ام البنین ہی کے نام سے کیا گیا ہے۔
کامل ۳ ص۳۰، مروج الذہب ۳ ص۶۳، الامامۃ والسیاسۃ ۲ ص۷، مقتل خوارزمی ۲ ص۲۹، سبائک الذہب ص۷، طبری ۶ ص۳۶۹، الاخبار الطوال ص۲۶۹
کامل السقیفہ میں آپ کا اسم گرامی لیلیٰ درج کیا گیا ہے جو عمدۃ الطالب کے نقل کی بنا پر آپ کی والدہ کا اسم گرامی تھا۔
آپ کے پدر بزرگوار کے نام کے بارے میں بھی مورخین میں ایک طرح کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کامل ابن اثیر، الامامۃ والسیاسۃ اور مروج الذہب نے حرام "ر" سے نقل کیا ہے لیکن علامہ مقرم نے کامل کو حزام کے حوالہ میں نقل کیا ہے۔ میں نے طبع بیروت میں بھی یونہی دیکھا ہے۔ باقی مورخین نے حزام "ز" سے نقل کیا ہے۔ عمدۃ الطالب قلمی نسخہ میں "حزام بن" سے درج کیا ہے۔ یہ نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ ۲؎ مقاتل الطالبین ابوالفرج اصفہانی۔ ناسخ التواریخ ۲ ص۳۰۳۔

بن عامر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ہوازن۔

جن کا آبائی سلسلہ حزام سے شروع ہو کر ہوازن تک پہنچتا ہے اور مادری سلسلہ میں حسب ذیل نام آتے ہیں۔

آپ کی والدہ ـــــ ثمامہ بنت سہیل بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب۔
ان کی والدہ ـــــ عمرہ بنت الطفیل بن مالک الاخرم بن جعفر بن کلاب۔
ان کی والدہ ـــــ کبشہ بنت عروہ الرحال بن جعفر بن کلاب۔
ان کی والدہ ـــــ ام الخشف بنت ابی معاویہ فارس الہرار بن عبادہ بن عقیل بن کلاب۔
ان کی والدہ ـــــ فاطمہ بنت جعفر بن کلاب۔
ان کی والدہ ـــــ عاتکہ بنت عبد الشمس بن عبد مناف بن قصی۔
ان کی والدہ ـــــ آمنہ بنت وہب بن عمیر بن نصر بن قعین الحرث بن ثعلبہ بن ذودان بن اسد بن خزیمہ۔
ان کی والدہ ـــــ بنت جحدر بن ضبیعہ الاغر بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل بن ربیعہ بن نزار۔
ان کی والدہ ـــــ بنت ملک بن قیس بن ثعلبہ۔
ان کی والدہ ـــــ بنت ذی الراسین خشین بن ابی عصم بن سمح بن فزارہ۔
ان کی والدہ ـــــ بنت عمر بن صرمہ بن عوف بن سعد بن ذبیان بن بغیض بن الریث بن غطفان۔

آپ کے ننہالی بزرگوں میں عامر بن ملک بن جعفر بن کلاب۔ "ملاعب الاسنہ" کے لقب سے مشہور تھے۔ اور ان کی شجاعت کی وہ دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ ان کو "نیزوں سے کھیلنے والا" کہا جاتا تھا۔

آپ کی نانی کے بھائی عامر بن الطفیل بن مالک بھی "اشجع عرب" تھے۔ انکی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ قیصر روم کے پاس جب کوئی عرب آتا تھا تو وہ پہلا سوال یہ کرتا تھا کہ تمہارا عامر سے کیا رشتہ ہے؟

اگر کوئی رشتہ نکل آتا تھا تو بے حد احترام کرتا تھا ورنہ قابل توجہ بھی نہیں سمجھتا تھا۔

آپ کے بزرگوں میں ایک نام "عروہ رحال" کا بھی آتا ہے جنہیں رحال اسی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ اکثر و بیشتر ان کی آمد و رفت سلاطین اور امراء کے پاس رہا کرتی تھی۔ اور بادشاہان وقت ان کا کافی احترام کیا کرتے تھے۔

انھیں بزرگوں میں طفیل کا نام بھی ہے جو "ملاعب الاسنہ" کے بھائی اور شجاعت و جوانمردی میں شہرۂ آفاق تھے۔

لبید شاعر نے انھیں بزرگوں کی مدح میں وہ اشعار کہے ہیں جن کو سن کر نعمان کو خاموش ہو جانا پڑا اور دنیائے عرب میں کسی کو اعتراض کرنے کی مجال نہ ہو سکی۔

عقد جناب ام البنین

افسوس کی بات ہے کہ قدیم ترین مورخین نے بہت سے اہم تاریخی واقعات کے ساتھ اس عقد کے تذکرہ کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

حالانکہ اس کی "انفرادی" نوعیت کا تقاضا تھا کہ اس کے حالات نقل کئے جاتے اور یہ بتایا جاتا کہ امیرالمومنینؑ نے ایک "مخصوص" فرزند کی تمنا میں جس عقد کا اہتمام کیا تھا اس کا انداز کیا تھا۔ اور اس عقد کے کیفیات کیا تھے؟

بعض فارسی مقاتل نے کسی قدر تفصیل بیان کی ہے۔ لیکن اس کا "تاریخی" ثبوت ملنا مشکل ہے۔

یہ اور بات ہے کہ بالبصیرت انسان حالات و مقدمات کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جناب امیر نے اس عقد کے لئے کیا اہتمام کیا ہوگا اور جناب ام البنین کا اس مقدس گھر میں کیا کردار رہا ہوگا۔

حالات و کیفیات پر نظر رکھنے والا انسان اس واقعہ کی تصدیق کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جناب ام البنین نے مولائے کائنات کے بیت اشرف میں قدم رکھتے ہی آستان مبارک کو بوسہ دیا اور شہزادوں کی خدمت میں عرض کی میں تمہاری ماں بن کر نہیں آئی ہوں بلکہ ایک خادمہ کی حیثیت سے آئی ہوں"۔

اس واقعہ کا عرفانی ثبوت یہ تھا کہ جناب ام البنین مولائے کائنات کے علاوہ صدیقہ طاہرہ کی عظمت سے بھی باخبر تھیں۔

انھیں یہ معلوم تھا کہ فاطمہؑ اس جلیل القدر خاتون کا نام ہے جس کے عقد کا اہتمام خالق کائنات نے بالائے عرش کیا تھا

اور جس سے ازدواج[1] کی ہر خواہش کو سرکار دو عالمؐ نے رد کرتے ہوئے وحی کا یہ فیصلہ سنایا تھا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی کفو نہ ہوتا۔[2]

ایسے مقدس گھرانے میں قدم رکھتے ہوئے یہ احساس ناممکن ہے کہ میں فاطمہؑ زہرا ہی کی طرح علیؑ کی ایک زوجہ ہوں۔ یا مجھے واقعاً مادرِ سبطین کہے جانے کا حق حاصل ہے حاشا وکلا۔

جناب ام البنین کی بلندی نفس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کے ذہن میں صرف یہی احساس ہوگا کہ اسلام کو ایک مجاہد راہ خدا کی ضرورت تھی۔ اور اس ضرورت نے مجھے اس آستانۂ مقدس تک پہنچا دیا ہے ورنہ کہاں میں۔ اور کہاں بیت زہراؑ ۔؟

حضرت ام البنین کو یہ بھی معلوم تھا کہ مالک کائنات نے شہزادی کونین کو یہ بھی شرف عطا کیا تھا کہ ان کی موجودگی میں مولائے کائنات نے دوسرا عقد نہیں فرمایا اور یہ شرف تاریخ میں صرف دو ہی خواتین کو عطا ہوا ہے ایک جناب فاطمہؑ اور ایک ان کی والدۂ گرامی جناب خدیجہ

سرور کائنات نے جناب خدیجہ کی حیات تک کسی خاتون سے عقد نہیں فرمایا۔ اور مولائے کائنات نے صدیقۂ طاہرہ کی زندگی بھر عقد ثانی نہیں فرمایا۔

---

[1] تاریخ میں یہاں تک ملتا ہے کہ صدیقۂ طاہرہ سے عقد کی خواہش حضرات شیخین نے بھی کی تھی اور مرسل اعظمؐ نے اسے بھی رد کر دیا تھا۔ صواعق محرقہ، تاریخ خمیس وغیرہ۔

[2] اصول کافی۔ تہذیب شیخ طوسی۔

الٰہی مصالح کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسلام نے عقد ثانی کو عدالت سے مشروط کیا ہے۔ اور یہ قانون بنا دیا ہے کہ جب تک تمام ازدواج میں عدالت و انصاف ممکن نہ ہو ایک عقد کے بعد دوسرا عقد کرنا جائز نہیں ہے۔

عدالت کے حدود کے بارے میں روایات میں جو اشارے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری سلوک کی برابری تو بہر حال ضروری ہے حتی الامکان یہ سعی بھی ہونی چاہئے کہ قلبی رجحان میں بھی فرق نہ آنے پائے۔

یہ بات صرف ان حدود تک معاف کی جا سکتی ہے جہاں تک اسلام کے احترام فضائل و کمالات کے قوانین اجازت دیتے ہوں ——— اس کے بعد زوجیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ گھر کا سہانا ماحول "وحشت کدہ" میں تبدیل ہو جائے گا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ سرکار دو عالمؐ کسی بھی قیمت پر دیگر ازدواج کو جناب خدیجہ کے برابر نہیں قرار دے سکتے تھے۔

خدیجہ صرف زوجہ رسول نہیں تھیں کہ انھیں دیگر ازدواج کے برابر قرار دے دیا جائے۔ ان کو کچھ الگ امتیازات حاصل تھے۔

ان کے عقد کی ایک انفرادی شان تھی جس کے بعد یہ ناممکن تھا کہ ان کے ساتھ عام خواتین جیسا برتاؤ کیا جائے۔

یہ عدم مساوات کا اندیشہ معاذ اللہ نفس رسول کی کمزوری کی بناء پر نہیں تھا کہ اسکے مقابلہ میں عصمت کو لایا جا سکے۔ اس کی بنیاد فضائل و کمالات کا امتیاز تھا جسے کسی منزل پر نہیں مٹایا جا سکتا تھا۔

خود سرکار کائنات نے بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب حضرت عائشہ نے ٹوکا کہ آپ ایک ضعیف عورت کو برابر یاد کئے جا رہے ہیں۔ مالک نے آپ کو اس سے بہتر ازدواج

عطا کر دی ہیں۔ تو آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا تھا۔

خدیجہ کے برابر کون ہو سکتا ہے۔ وہ اس وقت ایمان لائیں جب کوئی ایمان لانے والا نہ تھا۔ انھوں نے اس وقت میری تصدیق کی اور اپنے اموال سے میری مدد کی جب کوئی سہارا دینے والا نہ تھا۔ ان کے ذریعہ مالک نے مجھے اس وقت صاحب اولاد بنایا جب لوگ ابتر کے طعنے دے رہے تھے۔ کسی اور خاتون کی یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

خدیجہ بنیاد کوثر ہیں، خدیجہ جواب طعنۂ ابتر ہیں۔ خدیجہ کے ازدواج میں کسی مصلحت و سیاست کا امکان نہیں ہے۔ خدیجہ کی زندگی پر کسی حرص و طمع کا الزام نہیں ہے۔ خدیجہ نے سماجی بندھنوں کو توڑ کر عقد کیا ہے۔ خدیجہ نے رسم و رواج پر ضرب کاری لگا کر پیغمبری مشن کو تقویت پہنچائی ہے۔ خدیجہ نے دولت کو فضائل کا احترام سکھایا ہے۔ خدیجہ نے مال و علم کی قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔

خدیجہ کے علاوہ کسی خاتون کے عقد کو یہ امتیازات حاصل نہیں ہیں۔ قدرت نے بھی نہیں چاہا کہ خدیجہ کی انفرادی شخصیت پر حرف آنے پائے اس لئے اس وقت تک اپنے حبیب کو دوسرے عقد کی اجازت نہیں دی جب تک خدیجہ کو اس دنیا سے اٹھا نہیں لیا۔

جناب فاطمۂ زہرا کے عقد کی مصلحت اور بھی زیادہ واضح ہے کہ جب قدرت خدیجہ جیسی غیر معصومہ ہستی کی محبت میں دوسری خاتون کو شریک نہیں بنا سکتی اور اس کے مراتب و مناقب کا اس انداز سے تحفظ کرنا چاہتی ہے تو فاطمۂ تو بہر حال معصومہ ہیں ——— ان کے مقابلہ میں کسی دوسری خاتون کے آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

یہ کائنات کا اول و آخر عقد ہے جو اس نوعیت سے واقع ہوا ہے ———

ورنہ ہر عقد میں ایک ہی فریق معصوم رہا ہے اور دوسرے فریق کو درجۂ عصمت حاصل نہیں رہا ہے۔ یہ صرف عقد زہرا و علی کا امتیاز ہے کہ شوہر بھی معصوم ہے۔ اور زوجہ بھی معصومہ۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ کائنات کا ہر عقد روئے زمین پر ہوا ہے لیکن عقد زہرا عرش اعظم پر کیا گیا ہے۔

غیر معصوم کا عقد زمین پر ہوگا تو جب طرفین معصوم ہوں گے تو عقد کا ہر اہتمام بھی مالک کائنات کی طرف سے کیا جائے گا۔

ایسے حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد عجب ام البنین کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے کو [illegible] زوجیت کے اعتبار سے جناب [illegible] اور زہرا مرضیہ کے بیت شرف کو اپنا "خانہ زوجیت" تصور کرتی ہوں۔ یا انکے شہزادوں کے لئے اپنے کو ماں کا درجہ دیتی ہوں۔

ام البنین عرفان کامل کی منزل پر فائز تھیں۔ ان سے عقد ایک اہم مصلحت کے تحت ہوا تھا۔ ان کے بارے میں اعزاز و احترام بیت رسالت کا جو تصور بھی قائم کیا جائے وہ کم ہے۔

تاریخ کے واقعات ان واقعات کی شہادت دیں یا خاموش رہ جائیں حقیقت خود اپنی ایک زبان رکھتی ہے۔

بنت رسولؐ کے بعد

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولائے کائنات نے جس قدر بھی عقد فرمائے ہیں سب کا سلسلہ صدیقۂ طاہرہ کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ارباب تاریخ میں اس مسئلہ میں ضرور اختلاف ہے کہ معصومۂ عالم کے بعد آپ نے سب سے پہلے کس خاتون سے

سے عقد فرمایا ہے ۔

ابوالفداء ص۱۹ کا بیان ہے ۔

" ثم بعد موت فاطمہ تزوج ام البنین بنت حزام الکلابیہ ..... وتزوج علیؑ ایضا امامہ بنت ابی العاص بن الربیع .... وامہا زینب بنت رسول اللہ ۔"

جناب فاطمہؑ کے انتقال کے بعد آپ نے ام البنین سے عقد فرمایا اس کے علاوہ امامہ سے بھی عقد فرمایا جن کی ماں زینب (ربیبہ) بنت رسول تھیں ۔

کامل ابن اثیر ۳ ص۲۰۰ کی عبارت ہے :-

" ثم تزوج بعدھا ام البنین بنت حزام الکلابیہ فولدت لہ العباس وجعفر وعبد اللہ وعثمان "..... وتزوج علیؑ امامہ بنت ابی العاص ۔"

جناب فاطمہؑ کے بعد آپ نے ام البنین سے عقد فرمایا جن سے عباس، جعفر، عبد اللہ اور عثمان پیدا ہوئے ..... اور آپ نے امامہ بنت ابی العاص سے بھی عقد فرمایا ۔

اس کے خلاف مطالب السئول فی مناقب آل الرسول کمال الدین محمد بن طلحہ الشافعی ص۲۱۶ کی عبارت یہ ہے ۔

" وکان یوم قتلہ عندہ اربع حرائر فی نکاحہ و ھن امامہ بنت ابی العاص بنت بنت رسول اللہ تزوجہا بعد موت خالتہا البتول فاطمہؑ "

آپ کی شہادت کے دن آپ کی زوجیت میں چار عورتیں تھیں ۔ امامہ بنت ابی العاص ..... جن سے ان کی خالہ جناب فاطمہؑ کے انتقال کے بعد عقد فرمایا تھا ۔

بعینہ یہی عبارت کشف الغمہ ابو الحسن علی بن السعید فخر الدین عیسی الاربلی کی ہے ص۱۴۳

ابن صباغ مالکی نے فصول مہمہ میں بھی یہی عبارت درج کی ہے ص۸۲ مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ ۔

مشکل یہ ہے کہ پہلی روایت ابن اثیر کے دور سے شروع ہوئی ہے جس کا سن وفات ۶۳۰ھ ہے اور دوسری روایت محمد طلحہ شافعی کی ہے جن کا سن وفات ۶۵۲ھ ہے ______

یعنی دونوں تقریباً ہمعصر ہیں ۔ اور ایسے حالات میں تاریخ کی قدامت کی بناء پر کوئی فیصلہ ممکن نہیں ہے ۔

صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے دیگر قرائن کا سہارا لینا پڑے گا ______ اور قرائن کا تقاضا یہی ہے کہ جناب امامہ کے عقد کو سابق مانا جائے ۔ اس کے دو اہم شواہد ہیں ۔

پہلا شاہد یہ ہے کہ جناب امامہ سے عقد کے بارے میں خود صدیقۂ طاہرہ نے وصیت کی تھی اور آپ نے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد عقد ثانی کیجئے گا تو امامہ سے کیجئے گا ۔ وہ میرے بچوں کا زیادہ خیال رکھتی ہے ۔

اب یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ مولائے کائنات صدیقۂ طاہرہ کی وصیت کے باوجود امام حسنؑ و حسینؑ کے تحفظ اور ان کی خدمت سے بے نیاز ہو کر "فدیۂ حسینؑ" کی فکر میں مصروف ہو جائیں ۔

دوسرا شاہد یہ ہے کہ صدیقۂ طاہرہ کی وفات سنہ ۱۱ھ میں ہوئی ہے اور جناب عباس کی ولادت بالاتفاق سنہ ۲۶ھ میں ہوئی ہے۔

اور بات یہ عادتاً مشکل ہے کہ جناب ام البنین کے یہاں عقد کے ۱۴، ۱۵ سال کے بعد ولادت ہوئی ہو جب کہ اس عقد کا ایک اہم مقصد تھا اور اس مقصود کا حاصل ہونا شیت کے تقاضوں کی بناء پر ضروری تھا۔

یہ اور بات ہے کہ امامہ کے عقد کے مقدم ہونے سے جناب ام البنین کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

دونوں کے عقد کے مقاصد الگ الگ ہیں اور دونوں کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں۔

امامہ سے عقد شہزادوں کی خدمت کے لئے ہوا ہے اور ام البنین سے عقد ایک دوسرے اہم مقصد کے لئے۔ اب جس عقد کا مقصد جس قدر بلند ہوگا اسی قدر دونوں کی زوجیت میں بھی فرق ہوگا؟

جناب ام البنین کی ذاتی اور وراثتی شرافتیں، ان کی عظمتِ کردار اور جلالتِ نسب کے لئے مستقل جداگانہ دلائل ہیں۔

جناب امامہ زینب "بنت" رسولؐ کی دختر ضرور تھیں لیکن خود جنابِ زینب کا حقیقی دختر ہونا محلِ کلام ہے۔

تحقیقی اعتبار سے وہ ربیبہ رسولؐ تھیں جو عرب کے دستور کے مطابق دختر رسولؐ کے عنوان سے مشہور ہو گئی تھیں۔

طلوعِ قمر

وہ وقت کتنا حسین اور سہانا تھا جب مطلع وفا پر بنی ہاشم کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ دنیائے ایثار جگمگا رہی تھی۔ کائنات محبت کی رونق دوبالا ہو رہی تھی۔ ام البنین کی گود رشک وادی ایمن بنی ہوئی تھی۔ اور مولائے کائنات کا گھر منزل چراغ طور تھا۔

تاریخ کی بے انتہاء غفلت ہے کہ اس نے ایسے عظیم وجود کی تاریخ بھی معین نہ کی اور بنی ہاشم کے ماہتاب کی تاریخ طلوع بھی مقرر نہ ہو سکی۔ لیکن اتنا بہرحال مسلم ہے کہ قمر بنی ہاشم کے طلوع کا سال سنہ ۲۶ھ ہے۔

علامہ عزالدین جزری نے اسد الغابہ میں اور شیخ سماوی نے ابصار العین میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ آپ کا سن ولادت سنہ ۲۶ھ ہے حضرت نعمۃ اللہ الجزائری نے انوار نعمانیہ میں اسی قول کا تذکرہ کیا ہے۔ اور صاحب تنقیح المقال کا بھی یہی بیان ہے ان سب سے بالاتر علامہ داؤدی کی العمدہ کی روایت ہے جس میں صادق آل محمدؐ نے حضرت عباسؑ کے فضائل وکمالات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور اس کے تتمہ میں یہ فقرہ ہے۔

"قتل وله اربع وثلثون سنة۔"

آپ ۳۴ سال کی عمر میں شہید ہوئے۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپکی ولادت کا سال سنہ ۲۶ھ ہے۔

مذکورہ بالا شہادت کے بعد مزید کسی تاریخی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے صرف یہ مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ آپکی ولادت باسعادت کی تاریخ کیا ہے؟

علامہ عبد الرزاق مقرم نے علامہ السید محمد عبد الحسین بن السید محمد عبد الہادی

الجعفری کی "انیس الشیعہ" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۴ر شعبان ہے۔

مورخ یگانہ برادر محترم مولانا نجم الحسن طاب ثراہ کراروی نے مختلف حوالوں سے مختلف تاریخیں درج کی ہیں۔

۱۔ ۱۹ر جمادی الاولیٰ یا ۱۸ر رجب بحوالۂ جواہر زواہر قلمی (یہ حقیر کے جد امجد کا قلمی رسالہ ہے جو غریب خانہ پر محفوظ ہے۔ اس کے مندرجات کے استناد کا کوئی علم نہیں ہے یہ احتمال ضرور ہے کہ جد مرحوم حضرت آیۃ اللہ مولانا السید احمد حسین طاب ثراہ کے محرر فتاوی تھے ——— لہٰذا ممکن ہے کہ آپ نے یہ معلومات انھیں مرحوم سے حاصل کئے ہوں۔ (جوادی)

۲۔ ۲۶ر جمادی الثانیہ مولانا سلیم جبرولی بحوالۂ محرق القواد۔

۳۔ ۱۸ر رجب بحوالۂ آئینہ تصوف طبع رام پور۔ ۱۳۱۱ھ

برادر محترم طاب ثراہ نے ان اقوال پر درایتی انداز کی بحث کی ہے۔ لیکن اس درایت سے پہلے روایت کے اسلوب پر بھی نظر کرنا ضروری ہے۔

یہ اقوال جن کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں ان میں سے کسی کا زمانۂ تالیف چودھویں صدی سے آگے کا نہیں ہے۔

۴ر شعبان کی روایت انیس الشیعہ کی ہے جسے اس کے مولف نے یکم شعبان ۱۲۴۲ھ کو سلطان فتح علی شاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔

یعنی اس کا زمانہ تالیف تیرہویں صدی ہجری کے نصف سے پہلے کا ہے۔ اس لئے ان ماخذ میں اس کتاب کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اور وہ نسبتاً زیادہ معتبر کہی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ قدیم ماخذ میں ذکر نہ ہونے کی بنا پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ان میں

سے کسی بزرگ نے بھی کوئی قول کسی کتاب سے اخذ کیا ہوگا۔ زیادہ احتمال یہی ہے کہ یہ سب امور بطور علم سینہ منتقل ہوتے تھے۔ اور علم سینہ میں ان روایات کی قدر و قیمت زیادہ ہے جن کا تعلق اس مقدس سرزمین سے ہو جہاں یہ ماہتاب رفتار درخشاں و تابندہ ہوا تھا۔

نجف اشرف وغیرہ میں ولادت کی تاریخ ۴ر شعبان ہی مانی جاتی ہے اس لئے احتمال قریب یہی ہے کہ یہ قول مطابق واقع ہو۔ اس کی ایک معنوی مناسبت بھی ہے جو اہتمام قدرت کے لحاظ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ تیسری شعبان کو امام حسینؑ کی ولادت ہوئی ہے تو بہت ممکن ہے کہ چوتھی شعبان کو حضرت عباسؑ کی تاریخ ولادت کیلئے منتخب کیا گیا ہو تاکہ میر کارواں آگے آگے رہے اور وفا شعار "تاریخی اعتبار سے" اس کے نقش قدم پر چلتا رہے۔

ادوارِ حیات

تاریخی واقعات کے اعتبار سے جناب عباسؑ کی زندگی کو تین حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک وہ حصہ جو آپ نے پدر بزرگوار کے زیر سایہ گزارا ہے ——— اور جو سنہ ۲۶ھ سے شروع ہو کر سنہ ۴۰ھ پر تمام ہوتا ہے یعنی تقریباً ۱۴ سال۔ دوسرا وہ حصہ جو جناب امیرؑ کی شہادت سے شروع ہوتا ہے جس میں آپ امام حسنؑ کے زیر سایہ تھے۔ یہ زمانہ سنہ ۵۰ھ پر تمام ہوتا ہے۔ اور اس کی کل میعاد ۱۰ سال ہے۔ تیسرا وہ حصہ جس کا سلسلہ شہادت امام حسنؑ سے شروع ہو کر کربلا پر تمام ہوتا ہے جس کی میعاد ۱۰ سال ہے جس میں آپ نے امام حسینؑ کے زیر سایہ زندگی گزاری ہے۔

واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ شعور کی ابتدائی منزلیں باپ کے زیر سایہ طے کی ہیں ——— اور دونوں بھائیوں کے دور امامت میں زندگی کے باقی مراحل طے ہوئے ہیں۔

کسی شخص کے حالات پر نظر کرنے کے لئے اس نکتہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس نے کس دور میں اپنے بزرگ سے کیا لیا؟ اور اس کے بزرگوں نے اس کی تربیت پر کس قدر توجہ فرمائی۔

حضرت عباسؑ کے حالات کو سمجھنے کے لئے بھی یہ یاد رکھنا پڑے گا کہ مولائے کائنات نے آپ کی تربیت عام بچوں کی طرح نہیں فرمائی ——— آپ کی حیثیت صرف ایک فرزند کی سی نہیں تھی جو ماں باپ کی آغوش تربیت میں پروان چڑھا کرتا ہے۔

آپ کا وجود ایک مقصدی وجود تھا جسے مقصد سے قریب تر بنانے کے لئے جس قدر بھی اہتمام ضروری تھا اس کا برتنا مولائے کائنات کا "فرضِ تمنا" تھا۔ اور آپ کسی وقت بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتے تھے۔

فارسی اور اردو کے مقاتل میں جو چھوٹے چھوٹے واقعات ملتے ہیں ——— ——— ان کا قدیم "تاریخی" ماخذ ملے یا نہ ملے۔ ان کی صحت کا فیصلہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اگر ان کا تعلق غیر معمولی شفقت و محبت اور بلند ترین انداز تربیت سے ہے تو ان کی صحت قطعی ہے۔ اور اگر اس کے سوا کوئی معمولی اور عادی بات ہے تو اس کے لئے مدرک بھی تلاش کرنا ہوگا۔ اور اس کے توجیہات پر بھی غور کرنا پڑیگا۔

صاحب "ریاض القدس" کے یہ تفصیلات قرین قیاس ہیں کہ حضرت عباسؑ نے ولادت کے بعد سب سے پہلے سر سجدۂ خالق میں رکھا۔ آپ نے پہلی نظر امام حسینؑ کے چہرۂ اقدس پر ڈالی۔

امام حسینؑ نے اپنی زبانِ اقدس آپ کے دہن مبارک میں دی اور اسی کو آپ کی غذا بنایا۔

آپ نے مولا سے غیر معمولی محبت کا اظہار کیا۔

آپ کے بچپنے کا ہر انداز امام حسینؑ کے سامنے غلامانہ انداز رکھتا تھا۔
آپ کے تیور عام بچوں سے قطعی مختلف تھے۔ اس لئے کہ یہ تمام باتیں حضرت عباسؑ کے امتیازی اور مقصدی وجود کے شایانِ شان ہیں۔ اور ان کا ہونا ہر اس وجود کے لئے ضروری ہے جس کی تخلیق کے لئے اس قدر غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہو

دورِ اوّل

وراثتی صفات

حضرت عباسؑ کو ان کے بزرگوں سے کیا ملا؟ اس عنوان کے تفصیلات کے لئے بڑا وقت اور کافی طویل بحث درکار ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عباسؑ کی وراثتی جرأت و شجاعت پر امیرالمومنینؑ کا حسنِ انتخاب خود ہی ایک سند ہے۔

عباسؑ بہادر نہ ہوتے تو جناب عقیل کی جستجو بیکار قرار پا جاتی۔ عباسؑ شجاع نہ ہوتے تو امیرالمومنینؑ کا انتخاب بے معنی ہو جاتا۔

بہادر بیٹے کی تمنا میں عقد کرنا اس بات کی سند ہے کہ اس عقد کے بعد جو فرزند پیدا ہوگا وہ یقیناً شجاع اور دلیر ہوگا۔ تاریخ کا تقریباً اتفاق ہے کہ جناب ام البنین کی اولاد میں سب سے پہلے فرزند جناب عباسؑ ہی تھے۔

صاحب عمدۃ المطالب احمد بن علی عنبا نے یہ بحث ضرور اٹھائی ہے کہ عباس اور عمر بن علی میں کون بزرگ تھا۔ اور کون خرد۔ لیکن یہ بحث برائے بحث ہے۔ ارباب تاریخ کا اتفاق ہے کہ عباسؑ اولاد جناب ام البنین میں سب سے بزرگ تھے اور حضرت عمر بن علی یقیناً ان سے چھوٹے تھے۔

غالباً اسی وراثتی شجاعت کا اثر تھا کہ ولادت کے بعد ہی آپ کا نام "عباس" رکھا گیا۔ جو شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور مولائے کائنات سے ایک خاص مناسبت بھی رکھتا ہے۔ آپ کا پہلا نام "حیدر" تھا جو شیر کا ایک نام ہے اور سچ کہا گیا ہے سہ

کیوں نہ عباسؑ ہوتے مثل علیؑ
شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے

شجاعت و ہمت کے علاوہ جو اوصاف آپ کو بطور وراثت ملے تھے انکی طرف ایک اجمالی اشارہ امام جعفر صادق نے ابو حمزہ ثمالی کی روایت میں "زیارت حضرت ابو الفضل" کے ذیل میں فرمایا ہے۔

"السلام علیک یا ابن اول القوم اسلاما واقدمهم ایمانا واقومهم بدین اللہ واحوطهم علی الاسلام"

سلام ہو آپ پر اے علیؑ کے فرزند! جو اسلام میں ساری قوم سے اول۔ ایمان میں سب سے مقدم۔ دین الٰہی میں سب سے زیادہ مستقیم اور اسلام کے سب سے بڑے محافظ تھے۔

مقام تعارف میں مولائے کائنات کے ان اوصاف کا شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ صادق آل محمدؐ کی نگاہ میں عباس ان تمام صفات کے حامل تھے اور ان کو یہ تمام کمالات بطور وراثت حاصل ہوئے تھے۔

کمال ایمان

حضرت عباسؑ کا اسلام عام امت کے اسلام سے جداگانہ ان کی شان استقامت منفرد اور ان کا تحفظ اسلام کا جذبہ قطعاً غیر معمولی تھا۔

مسلمان تاریخ میں ان مسائل کے شواہد نہ بھی مل سکیں تو صادق آل محمدؑ کا ارشاد گرامی ایک مستقل شاہد ہے۔ جو تاریخ کی غفلت و خیانت سے پردہ اٹھا رہا ہے اور دنیا کو متوجہ کر رہا ہے کہ تاریخ نے اسلام کے عظیم ترین کرداروں کے سلسلے میں کس قدر لاپروائی سے کام لیا ہے۔

آپ کے اسلام و ایمان کے بارے میں ایک مشہور واقعہ یہ ہے کمسنی کے زمانے میں ایک مرتبہ آپ مولائے کائنات کے زانو پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے زانو پر زینب[1] تھیں۔ ایک مرتبہ مولا اپنے عزیز فرزند کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ بیٹا عباس! کہو ایک۔

---

[1] واضح رہے کہ اس روایت میں زینب سے مراد جناب زینب نہیں ہیں۔ ان کی ولادت ۵ھ میں ہوئی ہے اور وہ جناب عباس سے تقریباً ۲۱ سال بڑی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور بھی ناممکن ہے کہ جس وقت عباسؑ ایک زانو پر رہے ہوں گے اس وقت زینب دوسرے زانو پر رہی ہوں گی۔
زینب سے مراد زینب صغریٰ ہیں جو جناب امیر کی دوسری صاحبزادی تھیں۔
علامہ ہبتہ الدین شہرستانی کا بیان ہے کہ جناب امیر کی تین بیٹیوں کا نام زینب تھا اور سب کی کنیت ام کلثوم تھی۔ نہضتہ الحسین۔

عباس نے کہا ایک۔

آپ نے فرمایا کہو دو۔

عباس خاموش ہو گئے۔

آپ نے پھر فرمایا۔ عباس کہو دو۔

آپ نے عرض کی۔ باباجان! مجھے شرم آتی ہے کہ جس زبان سے ایک کہہ دیا ہے اس سے دو کس طرح کہوں۔؟

"یہ بات عباسؑ کے مزاج توحید پر بار ہے۔"

توحید کے ساتھ یہ وفاداری ـــــــــ اور عقیدۂ اسلام کا یہ انداز تحفظ عام کلمہ گو افراد میں ناممکن ہے۔ یہ علیؑ کا ایک وراثتی تحفہ ہے جو عباسؑ کے حصہ میں آیا ہے ـــــــــ ورنہ "مقام عدد" میں ایک کے بعد دو کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مولائے کائنات کا یہ اصرار اور عباسؑ کا جواب اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ علیؑ کا یہ فرزند غیر امام ہونے کے باوجود اپنے کو عقیدۂ توحید کی پاسبانی کا ذمہ دار تصور کر رہا ہے اور جب اس غیر امام فرزند کا یہ عالم ہے تو جو ان میں امام ہوگا اس کا انداز تحفظ کیا ہوگا؟

عباسؑ نے تحفظ دین اسلام کے لئے کیا قربانیاں دی ہیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

[illegible] مقصود یہ ہے جو بطور وراثت عباسؑ کی طرف منتقل ہوئے تھے اور جن سے متصف ہونا صرف قدرت کی فیضِ عنایت کی بنا پر تھا۔

ان میں وہ کمالات الگ ہیں جو امام حسینؑ کی مخصوص توجہ و تربیت کی بنا پر حاصل

ہوئے تھے۔ اور جن کا عطا کرنا امام حسینؑ اپنے وفادار جان نثار کی پرورش کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جناب امیرؑ کے ہوتے ہوئے آپ نے عباسؑ کو اپنی زبان چسائی۔ اور ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھا۔

خود امیر المومنین نے بھی وقت آخر عباسؑ کو امام حسینؑ ہی کے حوالہ کیا تھا۔ اور یہ واضح کر دیا تھا کہ میں نے یہ فدیہ تمہارے ہی لئے مہیا کیا ہے اور آج تمہارے ہی حوالے کر کے جا رہا ہوں۔

امام جعفر صادقؑ نے اسی کمالِ ایمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔

"اَشْهَدُ لَكَ بِالتَّسْلِيمِ وَالتَّصْدِيقِ"

ہم آپ کے جذبۂ تسلیم و سپردگی اور آپ کی شان تصدیق کی گواہی دیتے ہیں ـــــــــ آپ منزل تسلیم پر فائز اور درجۂ تصدیق کے حامل ہیں۔

(زیارت حضرت عباسؑ)

تسلیم و سپردگی کے منازل اور ان کی بلندیوں کا اندازہ کرنا ہے تو قرآن حکیم اور نہج البلاغہ کے بیانات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

قرآن حکیم نے شان تسلیم کی نقشہ کشی اس انداز سے کی ہے

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا"

اے پیغمبر! آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک صاحب ایمان نہیں بن سکتے جب تک اپنے اختلافات میں آپ کو حکم نہ بنائیں اور

اس کے بعد آپ جو فیصلہ کر دیں اس کے خلاف اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور مکمل طور پر اپنے کو مالک کے سپرد کر دیں۔

آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منزل تسلیم پر فائز ہونے والے کو جذبات و رجحانات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اور نفس کو اتنا طاہر و اطہر بنانا پڑتا ہے کہ فیصلۂ نبوت کے بعد چون و چرا کیا تنگی دل کا بھی احساس نہ ہو۔

کربلا کی تاریخ میں حضرت عباسؑ کی شان تسلیم اسی انداز کی ہے۔ آپ نے اپنے جذبات، احساسات، خیالات اور رجحانات کو اس طرح امام معصوم کا تابع فرمان بنا دیا تھا کہ کسی منزل پر بھی کوئی تنگی محسوس نہیں کی اور ہر منزل پر راضی برضا رہے۔

ایک شجاع و بہادر کے لئے حمیت و غیرت کی عظیم قربانی ہے کہ اس کے خیمے دریا کے کنارے سے ہٹ جائیں۔

فوج دشمن کے لئے یہ ناممکن تھا کہ شدید جنگ اور عظیم خونریزی کے بغیر امام حسینؑ کے خیام کو فرات کے کنارے سے ہٹا دے۔

علیؑ کے شیر کی شجاعت و ہمت آواز دے رہی تھی کہ کربلا کا واقعہ دسویں محرم کے بجائے تیسری محرم ہی کو پیش آئے گا۔

لیکن عباسؑ کے کردار نے واضح کر دیا کہ عقل کے فیصلے سے ہٹ کر قوت کا اظہار کرنا جرأت ہے اور نفس کو قابو میں لانے کے بعد اقدام کرنا شجاعت ہے

عباسؑ جری نہیں ہے شجاع ہے اس کی طاقت پر خواہشات کی حکومت نہیں ہے مرضی مولا کا پہرہ ہے۔

دنیا کی کوئی طاقت نہیں تھی جو ان خیام کو فرات کے کنارے سے ہٹا دیتی یہ منزل تسلیم ہی کا کرشمہ تھا کہ عباسؑ نے خود اپنے ہاتھ سے خیمے ہٹا دیئے اور نہایت صبر و سکون کے ساتھ فرات کا کنارہ چھوڑ دیا۔

فرات کا کنارہ چھوٹ گیا لیکن تسلیم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ——— شیر الجلال کا کردار آج بھی آواز دے رہا ہے کہ تسلیم کی منزل والے عصمت کے فیصلے کے مقابلہ میں جذبات کا لحاظ نہیں کرتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

دوسرا وقت وہ آیا جب عاشورہ کی رات شمر ملعون نے اپنے بھانجوں کو آواز دی اور حضرت سے خفیہ گفتگو کرنا چاہی۔

ایک وفادار سپاہی اور "مقصود کربلا" مجاہد کے لئے یہ بات سخت ناگوار تھی کہ وہ اپنے آقا کے پاس سے ہٹ کر دشمن سے محو گفتگو ہو جائے اور اس کی کسی قسم کی بات پر کان دھرے۔

شمر کے لئے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک لمحہ فرصت پا کر عباسؑ سے کوئی گفتگو کر سکتا۔

یہ ادائے تسلیم ہی کی مجبوری تھی کہ جیسے ہی امام حسینؑ نے حکم دیا۔ "بھیا! تم کو اس کی بات سن لینا چاہیئے۔"

جناب عباسؑ فوراً ہی شمر کی طرف بڑھ گئے اور نہایت ہی سکون و اطمینان کے ساتھ اس کی گفتگو سن لی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد جواب وہی دیا جو ایک بہادر سپاہی اور وفادار جاں باز کے شایان شان تھا۔

اس سے زیادہ نازک موقع اس وقت آیا جب خود شیر حیدر کرار نے آکر مولا سے یہ عرض کی تھی کہ مولا اب نفس تنگی کر رہا ہے اور دشمنوں کے طعنے سنے نہیں جا رہے ہیں۔ اجازت دے دیجئے تو میں انھیں بتادوں کہ آپ کے ایک ایک بہادر غلام کے دست و بازو میں کتنی طاقت ہے اور میرا مولا مجبور و بے بس نہیں ہے۔

موقع تھا اور نہایت حسین موقع تھا کہ امام مظلوم اجازت دے دیتے اور عباسؑ خیبر و خندق کی تاریخ کو دہرا دیتے۔

دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا اور حیدر کرار کا لال کربلا کے پورے میدان پر قبضہ کر لیتا۔

لیکن اللہ رے مجبوری :- کہ امام حسینؑ نے جنگ کی اجازت دینے کے بجائے مشکِ سکینہ کی ذمہ داری سپرد کر دی اور فرمایا۔ "بھیا! بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔"

دنیا کا دوسرا کوئی بہادر ہوتا تو مشکیزہ کو محفوظ کر کے رکھ لیتا اور دشمنوں کو ان کے طعنوں کا مزہ چکھا دیتا لیکن یہ منزلِ تسلیم کے راہبر و عباسؑ کا معاملہ ہے کہ شیر نے آقا کا حکم پاتے ہی ایک طرف مشکیزۂ سکینہ سنبھالا تو دوسری طرف تلوار اٹھا کر رکھ دی۔

دنیا دیکھ لے کہ تسلیم و سپردگی والوں کا کردار کیا ہے۔ اور وہ مولا کا حکم پانے کے بعد کس خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے جذبات کو پامال کر دیا کرتے ہیں۔

تصدیق کے بارے میں حضرت امیرالمومنینؑ "نہج البلاغہ" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"اول الدین معرفتہ وکمال معرفتہ التصدیق بہ"۔

دین کی ابتداء معرفت سے ہے اور معرفت کا کمال تصدیقِ الوہیت ہے۔

حضرت عباسؑ کی منزلِ تصدیق شاہد ہے کہ آپ صرف عارفِ الٰہی نہیں بلکہ کمالِ عرفان کے درجہ پر فائز تھے۔

علمائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ عرفان کی ذمہ داریوں کا آغاز کس عمر سے ہوتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ وجوبِ عرفان بھی دیگر احکام شریعت کی طرح بلوغ سے متعلق ہوتا ہے اور اس سے پہلے نہ واجبات و محرمات کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور نہ عرفان و ایمان کی۔

لیکن بعض حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ عرفان کا مسئلہ احکام شرعیہ سے بالکل مختلف

ہے۔

احکام کا تعلق عمل سے ہوتا ہے۔ اس میں بلوغ وغیرہ کی قید لگائی جا سکتی ہے۔ لیکن عرفان کا تعلق عمل سے نہیں ہے۔ اس کا ربط براہ راست انسانی عقل و شعور سے ہے۔

جس وقت بھی انسان میں عقل و شعور کا کمال پیدا ہو جائے گا اس کا عرفان قابل قبول سمجھا جائے گا۔ اور اسے وہی درجہ دیا جائے گا جو ایک کامل العقل عارف کے عرفان کا ہوتا ہے۔

یہ تحقیق قرین عقل بھی ہے اور مطابق آیات و احادیث بھی ——— تفاصیل کا محل نہیں ہے لیکن جناب اسمٰعیل کے لئے منزل اسلام کا اعلان اور جناب ابراہیم کی طرف سے امت مسلمہ کی دعا گواہ ہے کہ عرفان و ایمان کے لئے سن و سال کی قید نہیں ہے۔

یہ اور بات ہے کہ فہم و ادراک بہرحال ایک سن و سال اور عمر کے محتاج ہیں خواہ کتنی ہی مختصر عمر کیوں نہ ہو۔

ادراک اپنی منزل طے کرنے کے لئے ایک وقت چاہتا ہے اور شعور اپنے کمال کے لئے ایک زمانہ چاہتا ہے۔

لیکن تاریخ میں کچھ ایسے بھی بندے نظر آتے ہیں جن کا عرفان اول وجود ہی سے کامل تھا۔ اور انھوں نے ولادت کے ساتھ ہی بارگاہ احدیت میں سر تسلیم خم کر کے یہ بتا دیا تھا کہ ہم معصوم اور صاحب منصب بندے ہیں۔ ہمارے علاوہ دوسرے بندوں میں یہ شان نظر آنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

مشکل اس لئے کہا جاتا ہے کہ فیضان الٰہی کی کوئی حد نہیں ہے اور نہ بندے کے ظرف صلاحیت کی کوئی تحدید نہیں کی جا سکتی۔ ایسے بندے بہرحال پیدا ہو سکتے ہیں

جنہیں مالک ابتدائے عمر سے شعور کامل اور ادراک تام عطا کر دے اور وہ بے پناہ صلاحیت کے مالک ہوں۔

ایسے بلند و بالا بندوں کو صاحبان منصب سے الگ کرنے کا ایک ہی معیار ہے کہ صاحبان منصب آغاز عمر سے فروع دین اور احکام شرعیہ کے بھی مکلف ہو سکتے ہیں۔ ان پر اکثر شرعی ذمہ داریاں بھی عائد ہو سکتی ہیں جیسا کہ جناب موسیٰ کے بارے میں قرآن مجید کا اعلان ہے۔

"وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ"

(ہم نے موسیٰ پر دودھ پلانے والی عورتوں کا دودھ پہلے ہی سے حرام کر دیا تھا۔

حرام و حلال کا تعلق احکام سے ہے عقائد و عرفان سے نہیں اور قدرت نے جناب موسیٰ کے لئے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر منصب دار کسی قدر کمال عرفان کا حامل کیوں نہ ہو جائے۔ قدرت اسکی احکام کی ذمہ داریاں عائد نہیں کرتی۔ اور صاحب منصب کتنا ہی کمسن کیوں نہ ہو اس پر یہ ذمہ داریاں عائد کی جا سکتی ہیں۔

جناب عباسؑ کا شمار تاریخ کی انھیں منفرد شخصیتوں میں ہے جنہیں مالک نے روز اول سے کمال عرفان کا حامل بنایا تھا۔ اور شعور کامل دے کر دنیا میں بھیجا تھا تصدیق کے ان مراتب کو سامنے رکھنے کے بعد معصوم کی گواہی کی روشنی میں اس واقعہ کی خود بخود تصدیق ہو جاتی ہے کہ عباسؑ نے باپ کی آغوش میں بیٹھ کر ایک کے بعد دو کہنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

علیؑ کا لال دنیا کو آواز دے رہا تھا کہ اگر تم نے میرے بابا سے کمال معرفت کی منزل سنی ہے اور اس کا کسی قدر عرفان حاصل کیا ہے تو اب بابا ہی کی زبان سے میرے

بچپنے کا حال سنو اور اس کے بعد تصدیق کرو کہ اللہ کے وہ مخلص بندے کیسے ہوتے ہیں جو آغاز خلقت سے ہی کمال عرفان کی منزل پر فائز ہوتے ہیں۔

اور پھر ان کا مولا کیسا ہوگا جس کی غلامی کا اعلان کرنا وہ اپنی تسلیم و تصدیق کا اہم فرض سمجھتے ہیں۔

وفا

ام البنین کے لال اور حیدر کرار کے لخت جگر نے اپنے جملہ کمالات و کرامات میں جس قدر شہرت وفا کے سلسلے میں حاصل کی ہے شاید ہی دنیا میں کسی وفادار کو یہ منزل نصیب ہوئی ہو۔

آج جب کبھی وفا کا نام زبان پر آتا ہے تو سب سے پہلے عباسؑ کا تصور فوراً ذہن پر ابھرتا ہے۔ اور جب کبھی عباسؑ کا ذکر آتا ہے تو وفا کی تصویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے۔

جب زباں پر کبھی آجاتا ہے نام عباسؑ
دیر تک ہونٹوں سے خوشبوئے وفا آتی ہے

جوادی

قمر بنی ہاشم کو یہ وصف بھی بزرگوں سے وراثت میں ملا تھا اور اس کا سلسلہ بھی تاریخ میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

قرآن مجید نے آپ کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ کیا ہے تو اسی کمال وفا کے ساتھ۔

"وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ"

(کیا انھیں ان حقائق کی خبر نہیں ہے جو وفادار ابراہیمؑ کے

صحیفہ میں ہیں۔

جناب ابراہیمؑ کے بعد یہ سلسلہ حضرت اسمٰعیل کے ذریعہ آگے بڑھا جن کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

" واذکر فی الکتاب اسماعیل انہ کان صادق الوعد وکان رسولا نبیا "

(اسمٰعیل کا ذکر کرو جو صادق الوعد اور اللہ کے پیغمبر تھے)

جناب اسمٰعیل کے بعد تاریخ میں جن افراد کا تذکرہ ملتا ہے ان کی وفاداری کے آثار بھی جا بجا نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

آخر امر میں یہ سلسلہ جناب ابو طالب تک پہنچتا ہے۔ آپ کا اسم گرامی وفا کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ ایک دن اپنے بھتیجے سے کہہ دیا تھا کہ تم توحید و رسالت کا اعلان کرو۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں تو بیٹوں کو قتل گاہ میں لٹانا پڑا۔ درختوں سے پتے چبانا پڑے۔ مشرکین عرب سے شدید دشمنی مول لینا پڑی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی اولاد و ذریت کو محل خطر میں ڈالنا پڑا ———— لیکن اپنے وعدے سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ اور آخر وقت تک اپنے عہد کو اس شان سے نباہتے رہے کہ آپ کی زندگی تک مرسل اعظم نہایت ہی سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے وطن عزیز میں قیام پذیر رہے اور آپ کے سایۂ عاطفت کے اٹھتے ہی مالک کائنات نے حکم دے دیا۔

" میرے حبیب! اب مکہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ آپ مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔

تاریخ اسلام میں ہجرت کا واقعہ ایک طرف علیؑ کی جان نثاری کی علامت ہے تو دوسری طرف ابو طالب کی ان قربانیوں کی بھی یادگار ہے جن کے ہوتے ہوئے مرسل اعظمؐ کو وطن عزیز نہیں چھوڑنا پڑا تھا۔

اسلام کی تاریخ ہی پر منحصر نہیں ہے۔ اسلام کے اعلان سے پہلے جب جناب عبدالمطلب کے انتقال کے وقت جناب ابو طالب نے پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اور یہ کہہ دیا تھا کہ اس کی نگہداشت میرے حوالے ہے۔

عرب نے ہر امکانی کوشش کی کہ ابو طالب بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دیں اور آپ کو قوم کے حوالے کر دیں۔ لیکن آپ راضی نہیں ہوئے اور ہجوم مصائب میں اپنے بھتیجے کا تحفظ کرتے رہے۔

اپنے بچوں کو فاقے کرائے لیکن بھتیجے کو فاقہ نہیں کرنے دیا۔ اپنے بچوں کو جدا کیا لیکن خدا کے رسول کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ اپنے گھرانے پر مصائب برداشت کئے لیکن باپ کی امانت کا تحفظ کرتے رہے۔

جناب ابو طالب کی نسل میں یوں تو سب ہی کسی نہ کسی منزل وفا پر فائز تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ مولائے کائنات کا نام "مہر نیمروز" کی طرح آسمان وفا پر جگمگا رہا ہے۔ آپ کی وفاداری کے لئے قرآن حکیم کا یہ کھلا ہوا اعلان کافی ہے۔

" من المومنین رجال صدقوا ما عاہدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا "

(مومنین میں کچھ ایسے مرد بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے اپنے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں کچھ گزر چکے ہیں اور کچھ اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی ایک امتیازی صفت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بات کو بدلا نہیں ہے)

دعوت ذو العشیرہ سے مرض الموت پیغمبر تک کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جہاں علیؑ نے اپنے وعدے کو نظر انداز کر دیا ہو۔ میدانوں کی سختیاں سامنے آئیں سفر کے مصائب برداشت کرنا پڑے ———— تیغوں کی چھاؤں میں سونا پڑا۔

تن تنہا پورے لشکر سے مقابلہ کرنا پڑا۔ دشمنوں کے طعنے سہنا پڑے۔ "ایظاہر" چاہنے والوں کے طنز آمیز کلمات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وفا میں فرق نہیں آیا اور جس شان سے وعدہ کیا تھا اسی انداز سے پورا کیا۔

مرض الموت ہی کا کیا ذکر ہے ــــــــ وفات پیغمبرؐ کے بعد بھی تجہیز و تکفین کے جملہ مراحل علیؑ ہی نے طے کئے ــــــــ دفن کے سارے مشکلات کا سامنا علیؑ ہی نے کیا۔

گھر کی تاراجی، جاگیر کی بربادی۔ تخت و تاج کی غارت گری، منافقین کے حملے۔ "مسلمانوں" کی جنگیں علیؑ ہی کے لئے تیار کی گئیں۔ لیکن ابوطالب کا لال تھا کہ اس کی زبان پر صرف ایک فقرہ تھا۔ "ابوطالب کا لال موت سے نہیں ڈرتا۔ موت مجھ تک آجائے یا میں موت پر جا پڑوں۔

"ابوطالبؑ کا لال موت سے اس سے کہیں زیادہ مانوس ہے۔ جتنا بچہ شیر مادر سے مانوس ہوتا ہے۔

اسی وفادار مجاہد اسلام و ایمان کے وفادار کا نام ہے "عباسؑ"

عباسؑ ــــ نسل ابراہیم۔ ذریت اسمٰعیل۔ آل ابی طالب اولاد علیؑ کی وفاؤں کا خلاصہ ہیں۔

عباسؑ کے کردار میں ہر وفا کا نقش نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ عباسؑ کی زندگی میں وفا اس طرح رچ بس گئی ہے کہ نہ عباسؑ کا وفا سے جدا کرنا ممکن ہے اور نہ وفا کا عباسؑ سے جدا کرنا۔

آل ابی طالب میں عباسؑ کی وفا کا تعلق خود عباسؑ کے عہد و پیمان سے نہیں ہے کہ ایک غیر معصوم کے عہد و پیمان کی عظمت پر بحث کی جائے اور اس کے بعد اندازہ لگایا جائے کہ عباسؑ نے کیا عہد کیا تھا اور کس طرح پورا کیا؟

اس عہد وفا کا تعلق مولائے کائنات سے ہے جنہوں نے عباسؑ کو اسی مقصد کے لئے مہیا کیا تھا کہ اگر وفائے عباسؑ میں ادنیٰ سا فرق پیدا ہو جائے تو یہ عباسؑ کے کردار کی کمزوری نہ ہوگی بلکہ اعتماد علیؑ کی کمزوری ہوگی جس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

عرفانی نظریہ سے جس قدر وزن عہد قرۃ العیشرہ میں پایا جاتا ہے اس قدر وزن عہد عباسؑ میں بھی ہے۔ دونوں کا تعلق ایک امام معصوم سے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک عہد علیؑ نے اپنی ذات کے بارے میں کیا تھا اور ایک اپنے وفادار فرزند کے بارے میں۔

یوں ابتدا وفا کی ملتی ہے انتہا سے
جس طرح قرۃ العیشرہ مل جائے کربلا سے

جوادی

درجاتِ وفا

علماء اخلاق نے وفاداری کے چھ درجات بیان کئے ہیں۔

۱ اَلْوَفَاءُ بِکَلِمَتَیِ الشَّهَادَةِ۔
کلمۂ شہادتین کے ساتھ وفا کرنا۔

۲۔ اَلْوَفَاءُ بِالْعِبَادَاتِ الْمَفْرُوضَةِ وَالْمَنْدُوبَةِ
واجب و مستحب عبادات سے وفا کرنا

۳۔ اَلْوَفَاءُ بِتَرْكِ الْكَبَائِرِ وَالاِجْتِنَابِ عَنِ الصَّغَائِرِ۔
گناہان کبیرہ کو ترک کر کے گناہان صغیرہ سے یکسر پرہیز کر کے وفا کرنا۔

۴۔ اَلْوَفَاءُ بِالْفَضَائِلِ النَّفْسَانِيَّةِ وَالاِجْتِنَابِ عَنْ رَذَائِلِهَا
نفس میں فضائل پیدا کر کے اور اس کے رذائل کو دور کر کے وفا کرنا۔

اَلْوَفَاءُ بِعُهُوْدِ النَّاسِ وَمَوَاثِيْقِهِمُ الْمُوَافِقَةِ لِلْقَوَانِيْنِ الشَّرْعِيَّةِ

لوگوں کے معاہدوں سے وفا کرنا جو شرعی قوانین کے موافق ہوں۔

اَلتَّعَرِّيْ عَنْ اَغْطِيَةِ الْبَشَرِيَّةِ بِالتَّجَرُّدِ وَالْاِسْتِضَاءَةِ بِالْاَنْوَارِ الرُّبُوْبِيَّةِ وَالْاِسْتِغْرَاقِ فِيْ بَحْرِ التَّوْحِيْدِ بِحَيْثُ يَغْفُلُ عَنْ نَفْسِهٖ فَضْلًا عَنْ غَيْرِهٖ۔

نفس کو مادیت سے اتنا الگ کر لینا کہ بشریت کے پردے ہٹ جائیں اور انسان ربوبیت کے انوار کی روشنی حاصل کرنے لگے توحید کے سمندر میں غرق ہو جائے۔

اور منزل وہ آ جائے کہ غیر تو غیر خود انسان اپنے نفس سے بھی غافل ہو جائے اور نظر کے سامنے صرف توحید الٰہی کا جلوہ رہ جائے۔

وفا کے یہ تمام درجات شریعت اسلامیہ کے تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے گئے ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان جس قدر زیادہ احکام شریعت کا پابند ہوگا اور اپنی زندگی کو مرضی الٰہی کے سانچے میں ڈھال دے گا۔ اتنا ہی بڑا وفادار کہا جائے گا۔

وفا کے اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ انسان فطری طور پر مالک کائنات کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔

اسی کا ایک اشارۂ فیض وجود حیات کی طاقتیں عطا کرتا ہے اور اسی کا ایک ارادۂ فنا حیات کائنات کی سجی سجائی محفل کو ویران کر دیتا ہے۔

انسانی وجود مالک کائنات کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ ہے کہ جس کی امانت ہے اسی کو واپس کی جائے گی اور جس کی عطا کی ہوئی طاقتوں سے اعمال انجام دیئے جاتے ہیں اسی کی مرضی پیش نظر رکھی جائے گی۔

یہی حقیقت وفا ہے اور یہی منزل اخلاص۔

جو انسان اپنے مالک سے وفا نہیں کرتا وہ کسی دوسرے کے ساتھ وفا نہیں کر سکتا۔ اور جو انسان اپنے مالک کی مرضی کو نظر انداز کر سکتا ہے اس کی نظر میں غیر کی مرضی کی کیا اہمیت ہے؟

محسن حقیقی کی احسانات کو فراموش کر دینے والا انسان عالم مجاز کا کیا اعتبار کرے گا۔

اور رب العالمین کی اطاعت سے باہر نکل جانے والا کسی پرورش کرنے والے کو کیا اہمیت دے گا۔

معصومین کے کردار کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انھیں مالک کائنات نے وفا کے جملہ درجات پر فائز بنایا تھا۔ اور ان کی زندگی کے ہر موڑ پر شریعت کی حکمرانی اور احکام کی برتری نظر آتی تھی۔

خصوصیت کے ساتھ جس سلسلۂ نسل سے حضرت عباسؑ کا تعلق ہے اس میں جناب ابراہیمؑ سے لے کر مولائے کائنات تک ہر ایک کی زندگی وفا کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور ہر ایک اخلاص کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

جناب ابراہیمؑ کی وفا کا یہ عالم تھا کہ قوم کے سامنے آنے کے بعد سب سے پہلے "فرض پیغام توحید ادا کیا اور بے ثباتی دنیا سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال قائم کیا۔"

جناب اسمٰعیل زیر خنجر بھی اپنے عہد کو وفا کرتے رہے اور "سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ" کی عملی تفسیر پیش کرتے رہے۔

مولائے کائنات کی حیات طیبہ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں پوری زندگی عصمت کا پیکر۔ بلند کردار کا نمونہ۔ عصمت نفس کا نمونہ اور ایسی پاک و

پاکیزہ تھی کہ خانۂ کعبہ کے سجدہ سے آغاز ہوا اور مسجد کوفہ کے سجدہ پر انتہا ہو گئی۔

توحید کے سمندر میں غرق ہونے کا اس سے بہتر نمونہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور انوار ربوبیت کا اس سے بالاتر کون سا منظر ممکن ہے۔

مقام بحث میں ایک ایسے ہی صاحب کردار کا تذکرہ مقصود ہے جہاں عصمت نے بلندی کردار کی ضمانت نہیں لی ہے۔

منصب الٰہی درمیان میں نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وفا و اخلاص کا وہ عالم ہے کہ نام آتے ہی وفا کی تصویر نگاہوں کے سامنے کھینچ جاتی ہے۔

عباسؑ ایک ایسے ہی وفاشعار انسان کا نام ہے جو منصب الٰہی کا حامل نہ ہونے کے باوجود وفا کے جملہ مدارج پر فائز ہے اور بحر توحید میں استغراق کا یہ عالم ہے کہ باپ کی گودی میں ایک کے بعد دو کہنا گوارہ نہیں کرتا ہے۔

نفس سے کنارہ کش ہو کر مرضی مولا کے اہتمام کی یہ کیفیت ہے کہ جہاں حکم الٰہی سامنے آجائے وہاں نہ جذبات کا خیال ہے نہ رجحانات کا۔

احساسات کی پرواہ ہے نہ میلانات کی۔ دربار ولید سے شہادت زار کربلا تک کے جملہ واقعات گواہ ہیں کہ عباسؑ نے مرضی مولا کے سامنے کبھی اپنے نفس کی پرواہ نہیں کی اور مشیت ایزدی کے بعد اپنے جذبات و احساسات کو پامال کر دینا ہی اپنے کردار کا سرمایۂ افتخار اور طرۂ امتیاز سمجھا۔

عبادات مستحب و واجب ——— ترک کبائر و صغائر ——— فضائل نفسانیہ ——— اہتمام عہد و پیمان ——— یہ ساری منزلیں ہیں جنہیں عباس نے بدرجۂ اتم طے کیا اور اپنے کردار کو اس منزل پر پہنچا دیا جہاں علمائے حق کو یہ بحث کرنا پڑی کہ عباس کو معصوم کہا جائے یا غیر معصوم۔؟

ان کی زندگی کو عصمت سے الگ کیا جائے تو اس بلندیٔ کردار کا کیا نام رکھا

جائے؟

اور عصمت سے ملا دیا جائے تو عصمت ائمہؑ اور عصمت عباسؑ میں کیا فرق کیا جائے؟

یہ بحثیں اس بات کی گواہ ہیں کہ تاریخ کو عباسؑ کے کردار میں کوئی عیب نہیں ملا ہے۔ اور میدان کارزار میں خون کے پیاسے بھی طرز عمل میں کوئی کمزوری نہیں تلاش کر سکے . . . . ورنہ تلوار چلانے اور خون بہانے سے پہلے اس کمزوری کا اعلان کرتے۔

دنیا کا دستور ہے کہ حزب مخالف اپنے دشمن کے کردار کو داغدار بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ اور ہر صحیح و غلط بات کا سہارا لے کر حریف کی زندگی کو مشکوک بنانا چاہتا ہے۔ لیکن شہدائے کربلا اور خاص طور سے حضرت عباسؑ کا کردار اتنا بے عیب تھا کہ "سردار لشکر" ہونے کے باوجود محل اعتراض میں نہ آسکا اور دشمن انگلی اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا۔

امام جعفر صادقؑ نے انھیں کمالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد فرمایا تھا۔

"اَشْهَدُ لَكَ بِالتَّسْلِيْمِ وَالتَّصْدِيْقِ وَالْوَفَاءِ"!

ہم آپ کی تسلیم و تصدیق و وفا سب کی گواہی دیتے ہیں۔

کمالِ علم و فقہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اس دنیا میں جاہل مطلق ہی پیدا ہوتا ہے۔

"اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا"

وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے بھی باخبر نہیں ہوتا۔ اسے اپنے پیدا کرنے والوں کی معرفت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن اسی فطری جہالت کے پردہ میں صلاحیتوں کا ایک ذخیرہ بھی

لیکر آتا ہے۔

مساعد معاشرہ اور ساز گار ماحول ان صلاحیتوں کو بروئے کار لے آتا ہے اور انسان رفتہ رفتہ علم کی ان منزلوں پر پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنے کے بعد یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتا کہ میرا سفر حیات انتہائی جہالت کی منزل سے شروع ہوا تھا۔

علم کسی انسان کا موروثی وصف نہیں ہے۔ اس کا شمار انسان کے کسبی کمالات میں ہوتا ہے۔ لیکن عیاشی کے بارے میں علم کو بھی وراثتی صفات میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ وراثت سے مراد صرف وہی کمالات نہیں ہیں جو ابتداء وجود سے ساتھ آیا کرتے ہیں۔ وراثتی صفات میں ان اوصاف کا بھی شمار ہوتا ہے جن میں ماں باپ کے علاوہ کسی تیسری شخصیت کا دخل نہیں ہوتا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ علم "بظاہر" اکتسابی ہونے کے باوجود اپنی استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے فطری بھی کہا جا سکتا ہے جس شخص کو جیسی صلاحیت ملتی ہے اسی اعتبار سے اس کا کسب بھی مفید اور کارآمد ہوتا ہے۔

فطری صلاحیت کے اختلاف کا منشا کیا ہے؟

یہ ایک طولانی بحث ہے جس کے بعض مقدمات کی طرف نسب کی بحث میں اشارہ کیا جا چکا ہے؟

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فطری طور پر انسانی صلاحیتوں میں اختلاف ضرور ہوتا ہے اور ہر انسان ایک جیسی صلاحیت کا حامل نہیں ہوتا۔

ایک باپ اور ایک ماں کے دو بیٹے ایک جیسی صلاحیت کے مالک نہیں ہوتے اور دونوں کی صلاحیتوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی تعلیم و تربیت اور ایک ہی ماحول کے بعد ایک بیٹا نہایت درجہ ہونہار اور ہوشیار ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرا بیٹا انتہائی غبی اور کند ذہن۔

اس اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی صلاحیت کی تشکیل اس کے حقیقی ماحول سے ہوا کرتی ہے۔ اور حقیقی ماحول ماں باپ کے مختلف ذہنی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ذہنی رجحانات کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر "جنسی رابطہ" کے موقع پر یکساں حیثیت رکھتے ہوں ——— ان کا اختلاف ہمہ وقت مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔

جنسی ارتباط ایک خواہش ہے جو ہر حال میں پیدا ہو سکتی ہے ——— اور صرف خواہش کے ساتھ حالات کا بدل جانا تقریباً ناممکن ہے۔ انسانی ذہن کبھی پرسکون ہوتا ہے اور کبھی منتشر ——— اس کے اندرونی حالات کبھی طرب خیز ہوتے ہیں اور کبھی وحشت انگیز۔

ایسے حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آنے والی مخلوق ہمیشہ ایک جیسے ذہن کی مالک ہو اور اس کی صلاحیتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ماں باپ کے کچھ مشترکہ اثرات بھی ہوتے ہیں جو بہرحال باقی رہ جاتے ہیں۔ اور ان میں تغیر نہیں ہوتا۔

یہی اثرات تمام اولاد میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن ان کے علاوہ باقی اثرات میں اختلاف کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے والدین عام طور سے آنے والی مخلوق کی تخلیق سے قطعی بے خبر ہوتے ہیں ——— انھیں نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سا جنسی ارتباط آئندہ نسل کے لئے سنگ بنیاد بنے گا۔ اور نہ یہ خبر ہوتی ہے کہ کس آنے والی مخلوق کے ابتدائی علامات تخلیق کیا ہیں۔

ایسے حالات میں وہ اگر کوشش بھی کریں کہ با صلاحیت مخلوق پیدا ہو تو مشکل ہے۔ انسان دو چار اوقات میں تخلیق میں جملہ مصالح اسباب فراہم کر سکتا ہے۔ جملہ صلاحیت میں یہ بات

"عامۃ الناس" کے لئے ناممکن ہے۔ جنسی ارتباط کے حالات نامحدود اختلاف رکھتے ہیں اور انسانی اختیارات بڑی حد تک محدود ہیں۔

اب اگر کوئی شخص ایسا پیدا ہو جائے جو جملہ حالات میں اپنے نفس پر مکمل اختیار رکھتا ہو۔ ——— اور تخلیق کے اسباب پر مکمل نظر رکھتا ہو تو اس کے یہاں یہ بات ممکن بھی ہے۔ جیسا کہ عام طور پر انبیاء و اولیاء کے یہاں ہوتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں بھی ایسا کم وقوع پذیر ہوا ہے اس لئے کہ آنے والا فرزند صرف ایک طرف کے افکار و خیالات کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے وہ طرفین کے ذہن کا عکاس ہوتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک طرف انتہائی پاکیزہ نفس، پاکیزہ نظر اور محتاط ہو لیکن دوسری طرف یہ اوصاف و کمالات نہ ہوں اور آنے والا مولود اس اختلاف سے متاثر ہو جائے۔

یہ امتیاز پوری کائنات میں صرف حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کی اولاد کو حاصل ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں معصوم بلند کردار، پاکیزہ نفس اور کمال احتیاط کے درجہ پر فائز تھے ——— اب آنے والی نسل میں منصب کردار کی ضمانت نہ بھی لے تو بھی کردار میں کوئی کمزوری نہیں ہو سکتی۔

اولادِ علیؑ و فاطمہؑ میں صرف امام حسنؑ اور امام حسینؑ ہی نہیں ہیں کہ ان کی بلندی کردار کو منصب کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

ان میں عقیلہ بنی ہاشم جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ بھی تھیں جن کے کردار کی بلندی کسی منصب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا تعلق اس معصوم وراثت سے ہے جس میں ان کا شریک و سہیم کوئی نہیں ہے۔

جناب عباسؑ کو ایسا شرف حاصل نہیں ہے اور آپ ماں کی طرف سے کسی معصوم خاتون کے فرزند نہیں ہیں ——— لیکن اس کے باوجود آپ کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے جو اولادِ امیرالمومنینؑ میں دوسری شخصیتوں کو حاصل نہیں ہے۔

وہ امتیاز یہ ہے کہ مولائے کائنات نے عباسؑ کو ایک خاص مقصد کے لئے مہیا کیا تھا۔ اور جب کسی شے سے امام معصوم کا کوئی مقصد وابستہ ہو جاتا ہے تو وہ عالم تخلیق میں وہ تمام تصرفات کر سکتا ہے جس کا اختیار ایک امام برحق کو دیا جاتا ہے اور جس کے استعمال کے لئے عالم غیب و شہود میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

حالات و واقعات کے تحت یہ دعویٰ بالکل حق بجانب ہے کہ مولائے کائنات نے حضرت عباسؑ کی فطری صلاحیت کے بارے میں امامت کے اختیارات صرف فرمائے ہیں اور آپ کو ایسا فرزند عطا ہوا ہے جو دنیا کے عام بچوں سے ممتاز اور آل محمدؐ میں بھی ایک نمایاں انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔

تعلیم و تربیت

وراثتی استعداد و صلاحیت کے علاوہ انسانی علم و عرفان پر اس کے ماحول کا بھی اثر پڑا کرتا ہے۔ ماحول کی تاثیر ہی کا نام تعلیم و تربیت ہے۔ چاہے اس کا تعلق گھر کے باہر کے ماحول سے ہو یا گھر کے اندر کے ماحول سے

انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے سب اس کے ماحول کا عطیہ ہوتا ہے وہی فنون دیتا ہے اور وہی علوم ——— وہی فضائل کا سرچشمہ بنتا ہے اور وہی کمالات کا مصدر۔

اچھا ماحول اچھی استعداد کو ابھارتا ہے اور برا ماحول اس صلاحیت کو بھی پامال کر دیتا ہے۔

ماحول کا زیر بحث تصور عام تصور سے ذرا مختلف حیثیت رکھتا ہے ———

آج کل کی دنیا میں تعلیمی ماحول کا مطلب اسکول، کالج، درسگاہ اور دانش گاہ کا ماحول ہے جہاں ایک معلم ہوتا ہے اور ایک متعلم۔ چند ہم جماعت ہوتے ہیں اور چند اہل مذاکرہ و مباحثہ

لیکن صدر اسلام میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس وقت کی تعلیم کا زیادہ تر تعلق گھریلو تعلیم ہی سے تھا اور تربیت کا انداز بھی کچھ جداگانہ حیثیت ہی کا تھا۔ جن گھروں میں علم و ہنر کا چرچا نہیں ہوتا تھا وہاں صاحبان علم کا پیدا ہو جانا بعید و مشکل تھا۔

آج کی دنیا میں یہ بات بالکل آسان ہو گئی ہے کہ جاہل مطلق کے گھر میں صاحب علم پیدا ہو جائے لیکن کل کے ماحول میں ایسا بالکل نہ تھا اور اس کے لئے غیر معمولی اسباب فراہم کرنے پڑتے تھے۔

کل نہ یہ مکاتب تھے نہ مدارس ——— نہ یہ علوم تھے نہ فنون ——— کچھ مختصر معلومات تھے اور محدود درسگاہیں۔

ایسے ماحول میں وسیع معلومات فراہم کرنے کے لئے عظیم ترین شخصیت کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسانی معلومات پر اس کے ماحول کا بیحد اثر پڑتا ہے۔ دیہات کے ماحول میں تربیت پانے والا بچہ مختلف علمی مدارج طے کرنے کے بعد بھی وہ صلاحیتیں نہیں پیدا کر سکتا جو شہر کا کمسن ترین بچہ فراہم کر لیتا ہے۔

دیہات کا بچہ بجلی کا بٹن نہیں جانتا ——— ریڈیو کی سوئی نہیں پہچانتا، ریل کے سفر کے طریقوں سے باخبر نہیں ہوتا ——— ہوائی جہاز کے ہیئت و کیفیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔

لیکن شہر اور شہر میں بھی متمول گھرانے کا بچہ ان تمام باتوں کو انتہائی کمسنی کے زمانے سے جانتا ہے۔ اسے ان مسائل کے لئے نہ اسکول جانے کی ضرورت ہوتی ہے نہ علمی درسگاہوں کی سیر کرنے کی نہ کچھ سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ پڑھنے کی۔ گھر کا ماحول معلم ہوتا ہے اور بزرگوں کا ساتھ مربی۔

مطلب یہ ہے کہ انسانی علوم پر ماحول کا بیحد اثر پڑتا ہے ——— اور گھر مطلوبہ

علوم کے لئے علوم کے ماہرین کا ماحول مل جائے تو درس و تدریس پر کافی وقت صرف کئے بغیر انسان اتنا حاصل کر سکتا ہے جتنا مدتوں کی ریاضت کے بعد بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس تمہید کے بعد امام زین العابدینؑ کے ان فقرات کا جائزہ لیا جائے جو آپ نے کوفہ کے بازار میں جناب زینبؑ سے فرمائے تھے۔ تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ثانی زہرا کو علوی ماحول نے علوم کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا تھا جہاں تک پہنچنے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی انسان پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب کوفہ کے بازار میں علیؑ کی بیٹی نے خطبہ دینا شروع کیا اور بیان اس منزل پر پہنچا جس کے بعد آثار قیامت بھی نمودار ہو جاتے تو کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی تو ایک مرتبہ امام سجادؑ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

"اُسْكُتِي يَا عَمَّةُ فَأَنْتِ بِحَمْدِ اللّٰهِ عَالِمَةٌ غَيْرُ مُعَلَّمَةٍ فَهِمَةٌ غَيْرُ مُفَهَّمَةٍ"

"پھوپھی جان! اب خاموش ہو جائیے۔ آپ خدا کے فضل و کرم سے بغیر کسی تعلیم کے عالمہ ہیں اور بغیر کسی تفہیم کے سمجھدار اور ہوشمند ہیں۔"

(احتجاج طبرسی ص ۱۶۶ طبع نجف)

یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ علوی گھرانے کا ماحول اور مولائے کائنات کی آغوش تربیت خود ایک مدرسہ علم و ہنر تھی جس کے بعد کسی تعلیم و تفہیم کی ضرورت نہ تھی اور نہ انسان کو کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی احتیاج تھی۔

اس سے زیادہ واضح وہ کلمات ہیں جو خود جناب زینبؑ نے بیمار کربلا کی تسلیت کے لئے ارشاد فرمائے تھے۔

جب لٹا ہوا قافلہ گیارہویں محرم کو مقتل سے گزر رہا تھا اور باپ کے لاشے کو دیکھ کر بیٹے کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا تو ایک مرتبہ ثانی زہرا نے بھتیجے کو دیکھ کر ارشاد فرمایا۔

"مَا لِی اَرَاکِ تَجُوْدُ بِنَفْسِکِ یَا بَقِیَّةَ جَدِّیْ وَاَبِیْ وَاِخْوَتِیْ فَوَاللّٰهِ اِنَّ هٰذَا لَعَهْدٌ مِّنَ اللّٰهِ اِلٰی جَدِّکِ وَاَبِیْکِ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ اُنَاسٍ لَا تَعْرِفُهُمْ فَرَاعِنَةُ هٰذِهِ الْاَرْضِ وَهُمْ مَعْرُوْفُوْنَ فِیْ اَهْلِ السَّمٰوَاتِ اِنَّهُمْ یَجْمَعُوْنَ هٰذِهِ الْاَعْضَاءَ الْمُقَطَّعَةَ وَالْجُسُوْمَ الْمُضَرَّجَةَ فَیُوَارُوْنَهَا وَیَنْصِبُوْنَ لِهٰذَا الطَّفِّ عَلَمًا لِقَبْرِ اَبِیْکِ سَیِّدِ الشُّهَدَاءِ لَا یُدْرَسُ اَثَرُهُ وَلَا یَمْحٰی رَسْمُهُ عَلٰی کُرُوْرِ اللَّیَالِیْ وَالْاَیَّامِ وَلَیَجْتَهِدَنَّ اَئِمَّةُ الْکُفْرِ وَاَشْیَاعُ الضَّلَالِ فِیْ مَحْوِهِ وَتَطْمِیْسِهِ فَلَا یَزْدَادُ اَثَرُهُ اِلَّا عُلُوًّا"۔

کامل الزیارات ص ۲۶۱

(بیٹیا یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ تم نانا، بابا اور بھیا کی یادگار ہو۔ تم کیوں اپنی جان دیئے دے رہی ہو۔ یہ پروردگار کا تمہارے دادا اور بابا سے ایک عہد تھا۔

یہ عہد و پیمان ان بندوں کے لئے ہے جنہیں اس زمین کے فرعون نہیں پہچانتے اور آسمان والے خوب پہچانتے ہیں۔ وہ لوگ ان ٹکڑے ٹکڑے اعضاء اور خون آلود اجسام کو جمع کرکے دفن کریں گے۔ اور اس پر ایک پرچم تمہارے باپ کے نام سے نصب کریں گے۔ اس قبر کے آثار مٹ نہیں سکتے۔ اس کے نشانات محو نہیں ہو سکتے۔ زمانہ کسی قدر گزر جائے یہ آثار زندہ رہیں گے۔ کفر کے رہنما۔ اور گمراہی کے پیرو اس کے مٹانے کی کوشش کریں گے لیکن ہر کوشش کے بعد بلندی اور بڑھتی جائے گی۔

ان کلمات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ثانیٔ زہراؑ کو ان الٰہی معاہدوں کا بھی علم تھا جن کا تعلق صرف صاحبانِ منصب سے ہوتا ہے۔ اور جن کے مخاطب اللہ کے مخصوص بندے ہی ہوا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جناب زینبؑ نے یہ فقرات جناب امام زین العابدینؑ سے فرمائے جو خود الٰہی منصب دار تھے اور ان تمام حقائق سے باخبر تھے جن سے ایک صاحبِ منصب باخبر ہوتا ہے

ایسی بلند و بالا شخصیت سے اس انداز سے گفتگو کرنا اور شدتِ مصائب میں اسے تسکین دینا کسی معمولی عزم و ہمت اور عام علم و فضل کی خاتون کا کام نہیں ہے۔

بازار کوفہ و شام میں جناب زینبؑ کے خطبات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ علم و فضل کی کن بلندیوں پر فائز تھیں۔ اور آپ کے کمالات و کرامات کا کیا عالم تھا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب پردہ نشین خاتون ہونے کے بعد جناب زینبؑ کے علم و عرفان کا یہ عالم تھا تو بزمِ امامت میں رہنے والے عباسؑ کے علم کا کیا عالم ہوگا۔ عباسؑ صرف علوی ماحول کے پروردہ نہیں تھے، بلکہ آپ کے علوم و کمالات کو امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی تربیت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اہل نظر تصور کر سکتے ہیں کہ ظرفِ صالح پر تین معصومین کی تربیت و پرداخت کیا نقوش چھوڑے گی۔

ایک اہم مقصد کے لئے وجود ——— اور اس پر علیؑ کی تربیت اور پھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی پرداخت ایک انسان کو علوم و فنون کی کن بلندیوں تک پہنچا سکتی ہے ان کا صحیح تصور بھی ممکن ہو تو عباسؑ کی علمی جلالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ جناب عباسؑ کو اسی طرح زبان چساتے تھے جس طرح رسول اکرمؐ نے خود امام حسینؑ کو زبان چسائی تھی۔ (شرح زیارتِ ناحیہ) امام حسینؑ ابتدائے خلقت سے امام معصوم تھے۔ ان کی شخصیت پر کسی تبصرہ کا امکان نہیں ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی امامت، کی زبان کا اثر کوئی معمولی نہیں ہوتا۔

ابو ہاشم جعفری راوی ہیں کہ ایک شخص امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے ہندی زبان میں گفتگو کرنا شروع کر دی۔ حضرت اسی زبان میں جواب دیتے رہے۔ میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا۔ ابو ہاشم! ذرا زمین سے ایک کنکری تو اٹھاؤ۔ میں نے کنکری اٹھا کر حضرت کے دست اقدس پر رکھ دی۔ آپ نے اسے منہ میں رکھا اور پھر نکال کر دے دیا۔

ابو ہاشم! ذرا اس کنکری کو اپنے منہ میں رکھ لو ——— میں نے اسے منہ میں رکھ لیا ——— زبان پر کنکری کا رکھنا تھا کہ میں ۷۳ زبانوں کا ماہر ہو گیا جن میں سے ایک ہندی زبان بھی تھی۔

ظاہر ہے کہ امامت کا لعاب دہن کنکری سے مس ہو کر اس میں یہ اثر پیدا کر سکتا ہے کہ انسان ۷۳ زبانوں کا ماہر ہو جائے تو جس نے براہ راست امامت کا لعاب دہن چوسا ہو اسکے علوم و کمالات کا کیا عالم ہو گا؟

ان حقائق کا تو اندازہ کرنا بھی غیر معمولی علم و استعداد کا طالب ہے اور یہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ مسئلہ کی اس تحلیل کے بعد اس مشہور واقعہ کی تصدیق میں کوئی تأمل نہیں رہ جاتا کہ ایک عالم دین نے اپنے درس کے دوران یہ فقرہ کہہ دیا کہ "عباسؑ کی شجاعت و ہمت میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن   کی فقہی کوئی شخصیت نہیں تھی"

تو دن گزرنے کے بعد جب رات آئی اور بستر پر لیٹے تو عالم رویا میں دیکھا کہ جناب عباسؑ تشریف لائے ہیں اور ایک مسئلہ دریافت فرما رہے ہیں۔ یہ پریشان ہو گئے ——— مسئلہ کا حل بھی معلوم نہیں تھا ——— گھبرا کر عرض کی کہ فرزند امیر المومنینؑ! یہ مسئلہ بہت مشکل ہے" آپ نے فرمایا کہ تمہیں تو بڑے علم کا دعویٰ ہے۔

افسوس صد افسوس کہ میرے باپ کا علم متعدد معتبر اور غیر معتبر راویوں کے ذریعہ تم تک پہنچ گیا۔ تو تم عالم دین ہو گئے اور اپنے علم پر ناز کرنے لگے۔ اور اس شخص کے علم کے

بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں جس کو یہ سارے علوم علیؑ سے براہ راست ملے ہوں اور درمیان میں کسی راوی کا فاصلہ نہ رہا ہو۔

ابو الفضل العباس معرفت آلہی کے ساتھ علم شریعت کے زبردست عالم تھے۔ آپ نے شریعت کے اسرار و رموز اپنے پدر بزرگوار اور اپنے برادران عالی مقدار سے حاصل کئے تھے

آپ کے ظرف کی صلاحیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں باپ کی گودی میں توحید کی عظمت کا اعلان کیا تھا۔ اور امامت کے فیضان کے بارے میں تو کوئی شبہ کیا ہی نہیں کیا جا سکتا۔

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد مبارک اس دعوی کی بہترین دلیل ہے۔

"كَانَ عَمُّنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عَلِی نَافِذَ الْبَصِيْرَةِ صَلْبَ الْاِيْمَانِ"

نفوذ بصیرت اور صلابت ایمان کے بعد علم و عرفان میں شک کرنا دونوں الفاظ کے معانی سے ناواقفیت کی بہترین علامت ہے۔

علامہ مامقانی نے تنقیح المقال ص۱۲۸ میں بالکل صحیح استنتاج کیا ہے۔

"قَدْ كَانَ مِنْ فُقَهَاءِ اَوْلَادِ الْاَئِمَّةِ وَكَانَ عَدْلًا ثِقَةً تَقِيًّا نَقِيًّا"

"حضرت عباسؑ اولاد ائمہ کے فقہا کرام میں تھے۔ آپ کردار کے اعتبار سے عادل، موثق، متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپ کا علمی پایہ ایک عظیم فقیہہ کا تھا اور روایتی اعتبار سے ایک انتہائی معتبر اور موثق راوی تھے۔

اس سے بالاتر کسی درجہ کا تصور کرنا غیر معصوم کو معصوم کی صف میں لا کھڑا کر دینے کے مرادف ہے۔

صاحب اسرار الشہادۃ صـ۳۲۴ نے معصومین کا یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے۔

"اِنَّ الْعَبَّاسَ بْنُ عَلِی زُقَّ الْعِلْمُ زَقّاً"

" عباسؑ بن علیؑ کو علم اس طرح بھرا گیا تھا کہ جس طرح طائر کے بچے کو دانہ بھرا جاتا ہے۔

قمر بنی ہاشم

جنابِ عباسؑ کے مشہور و معروف القاب میں ایک قمر بنی ہاشم بھی ہے۔

مقتل عوالم صـ۹۴ ۔ ناسخ التواریخ ۶ صـ۲۹۸

محدود معلومات کی بناء پر نفی کا دعوٰی تو نہیں کر سکتا لیکن جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے مجھے یہ لقب معصومین علیہم السلام کے کلمات میں نہیں ملا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس لقب کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ کلمات معصومین میں اس لقب کا تذکرہ مل جاتا تو قرائن و متعلقات سے یہ اندازہ کیا جاتا! کہ اس کا استعمال کس اعتبار سے کیا گیا ہے۔؟

مقصد صرف ظاہری وجاہت اور صوری حسن و جمال کا اعلان ہے یا اس کی پشت پر کوئی مخصوص معنویت بھی کام کر رہی ہے؟

اہل تاریخ کے استعمال سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم صرف ظاہری حسن و جمال ہی ہے۔ مورخین میں اس سے زیادہ دقت نظر اور نکتہ رسی کا جذبہ اہلبیت کے گھرانے کے

بارے میں نہیں دیکھا گیا۔

لیکن میں نے اس وصف کا شمار القاب کے بجائے وراثتی اوصاف میں کیا ہے۔ جس کا مقصود یہ ہے کہ حضرت عباسؑ صرف حسن و جمال ہی کی بناء پر ایسے نہیں تھے کہ آپ کو لفظ "قمر" سے تعبیر کیا جاتا۔ بلکہ آپ کی ہستی میں اس لفظ کی مکمل معنویت پائی جاتی تھی۔ اور آپ اپنے پورے گھرانے کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ نے ہر دور میں ہاشمی گھرانے کی مخصوص وجاہت اور اس کے نمایاں افراد کے غیر معمولی حسن و جمال کا اعتراف کیا ہے۔ اور یہ "قمریت" اس خانوادہ کا طرۂ امتیاز رہی ہے!

جناب ہاشم کے والد ماجد جناب عبد مناف "قمر بطحا" تھے۔

جناب عبد اللہ حضورؐ اکرم کے والد گرامی قمر حرم کے نام سے مشہور تھے

سرور کائنات کے بارے میں حدیث کساء میں فاطمہؑ نے ان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

"کَاَنَّہُ الْقَمَرُ فِی لَیْلَةِ تَمَامِہٖ وَکَمَالِہٖ"

(بعض نسخوں میں لفظ بدر وارد ہوا ہے)

مولائے کائنات حضرت علیؑ کے بارے میں قرآن حکیم کا اعلان ہے۔

"وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا"

امام حسینؑ کے بارے میں مورخ کربلا کا بیان ہے۔

"وَاِنَّہُ قَمَرٌ زَھْرِیٌّ"

(سر امام مظلوم نوک نیزہ پر اس طرح چمک رہا تھا جیسے چاند)

جناب قاسم میدان جہاد میں آئے تو مورخ نے جمال مبارک کی عکاسی اس انداز سے کی۔ کَفَلْقَةِ الْقَمَرِ۔

غرض جسے دیکھئے قمر نظر آتا ہے۔ جس کے کردار پر نظر ڈالئے مثل ماہتاب درخشاں و تابندہ ہے ——— جس کے جمال مبارک کو دیکھئے "قمریت" کے جملہ آثار و مظاہر نمایاں نظر آتے ہیں۔

ایسے عالم میں جناب عباسؑ کا قمر ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے اور نہ اس سے بظاہر کوئی خاص فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اس خاندان کے بزرگوں میں سبھی قمر رہے ہیں اور بعد میں آنے والے سلسلے میں بھی ہر معصوم ایک "قمر امامت" ہی تھا۔

لیکن ذرا دقت نظر سے کام لیا جائے تو حضرت عباسؑ کی ایک انفرادیت ضرور ہے "قمریت" اس گھرانے کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ بزرگوں میں متعدد شخصیتیں "قمر" کے نام سے مشہور رہی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ایک کی قمریت کا انداز جدا جدا ہے۔ جناب عبد مناف بطحا کے قمر تھے، جناب عبد اللہ حرم کے قمر تھے۔ نہ بطحا میں عبد مناف کا مثل تھا اور نہ حدود حرم میں جناب عبد اللہ کا جواب۔ جناب عباسؑ کا یہ امتیاز ہے کہ ان کی قمریت بنی ہاشم کی طرف منسوب ہے۔

اب اگر بنی ہاشم میں کوئی قمر نہ ہوتا تو یہ کہنا آسان تھا کہ عادی اور معمولی وجاہت کے افراد میں عباسؑ کا حسن و جمال ایک انفرادی شان رکھتا تھا۔

لیکن مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

عباسؑ اس گھرانے اور خاندان کے قمر ہیں جس گھرانے میں ہر ایک اپنے مقام پر ایک ماہتاب درخشاں تھا۔ عباسؑ کو ان شخصیتوں میں نمایاں امتیاز حاصل ہے جن میں ہر ایک زہرہ جبین، ماہ طلعت اور قمر پیکر تھا

---

* حضور سرور کائنات کے بارے میں احیاء العلوم کی روایت ہے کہ آپ کے روئے منور کی روشنی میں ام المومنین عائشہ سوئی تلاش کر لیا کرتی تھیں۔

ایسے حالات میں یہ کہنے میں تکلف نہیں ہے کہ "تاریخی اعتبار" سے بطحا کے اہل حسن و جمال جمع کر لئے جائیں تو حضرت عبد مناف قمر ہیں۔ حرم کے حسینوں کا اجتماع ہو جائے تو جناب عبد اللہ قمر ہیں۔ کساء یمانی کا پردہ کر لیا جائے تو مرسل اعظم قمر ہیں۔ اتباع رسالت میں قدم آگے بڑھ جائیں تو حضرت علیؑ قمر ہیں۔ راہ خدا میں سر کٹا کر نیزہ پر سر بلند ہوں تو حسینؑ قمر ہیں اور سب ایک مرکز پر جمع ہو جائیں تو "عباسؑ" قمر ہیں۔ ہر ایک کے حسن و جمال کا پرتو اور ہر ایک کی طلعت و وجاہت کا آئینہ!

سرکار وفا کے اس حسن و جمال پر اس رخ سے نظر ڈالی جائے تو ایک عجیب انداز نظر آتا ہے اور نظر کو جرأت نظارہ نہیں ہوتی۔

خدا جانے یہ ام البنین کا لال کتنا حسین و جمیل تھا۔ یہ علیؑ کا نور نظر کس قدر وجیہ و شکیل تھا کہ تاریخ نے آسمان حسن بنی ہاشم پر ایک ہی ماہتاب درخشاں دیکھا اور روز اول "قمر بنی ہاشم" کہہ دیا تو عباسؑ صورت و سیرت میں قمر بنی ہاشم ہی ثابت ہوئے۔

قمر کا ایک معنوی وصف یہ بھی ہے کہ وہ خود "ذاتی نور" کا حامل نہیں ہوتا۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب مہر تاباں کا عطیہ ہے اور اسی کا فیض وجود ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے سامنے خاضع رہتا ہے اور اس کے نقش قدم پر قدم جماتا رہتا ہے۔

حضرت عباسؑ اس اعتبار سے بھی قمر کہے جانے کے قابل تھے کہ انھوں نے اپنی کائنات کردار کو کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ بلکہ سب مولا کا فیض ہی سمجھتے رہے اور اس طرح ان کے نقش قدم پر چلے کہ بھائی ہونے کے باوجود بھائی کہنے کی ہمت نہیں کی اور ہمیشہ اپنے کو حسینؑ کا غلام ہی کہتے رہے۔

اس مقام پر یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ جس طرح "قمر امامت" نے "آفتاب رسالت" کا اتباع کیا ہے اور کسی منزل پر ایک قدم آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔

قدرت نے بھی اس فطری اتباع کی لاج رکھی ہے اور طلوع قمر کی تاریخ کو طلوع "مہر امامت" سے ملا دیا ہے ——— ۴ھ میں تیسری شعبان کو قمر امامت امام حسینؑ کی شکل میں طلوع ہوا ——— اور ۲۶ھ میں چوتھی شعبان کو "ماہتاب وفا" مطلع ارمان پدر پر جلوہ گر ہوا۔

شعبان میں حیدرؑ نے دو لعل عجب پائے۔

عصمت

عربی زبان کے اعتبار سے عصمت تحفظ کے معنی میں ہے اور معصوم اس شخص کو کہہ جاسکتا ہے جو محارم آلہیہ سے اجتناب کرنے والا ہو اور اپنے کردار کو پاک و پاکیزہ رکھتا۔ اصلاحی اعتبار سے عصمت کے مفہوم میں علماء اسلام کے درمیان بیحد اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ عصمت کے کمال کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو خود درجۂ عصمت پر فائز ہوں۔

علماء اسلام میں کوئی بھی اس بلند درجہ پر فائز نہیں تھا کہ اسے معصوم کے نفس کی کیفیت اسکے جذبات کی طہارت اور اسکے کردار کی بلندی کا علم ہو سکے۔

حالات و کیفیات یا عقائد و نظریات کی روشنی میں اس کمال نفس کی مختلف تعبیریں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔

کبھی معصوم کے کردار کی بلندی سامنے آئی ہے تو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اگر عصمت کو غیر اختیاری تسلیم کر لیا جائے تو معصوم کا کمال ہی کیا رہ جائے گا۔ اور اس کی خوبی ہی کیا ہوگی؟ اور کبھی اختیاری عصمت کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اسے جد و جہد اور محنت و

مشقت کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔

ابتداء فطرت سے حاصل ہونے والے کمال کو اختیاری کہنے کا کیا مطلب ہے۔ بالآخر نظریہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ عصمت ایک نفسانی ملکہ ہے جس کی بناء پر معصوم اختیارات حاصل ہونے کے باوجود خطاؤں کی طرف قدم آگے نہیں بڑھاتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ عصمت کی تفسیر کا مسئلہ نہایت درجہ پیچیدہ اور دشوار گزار ہے۔ اس میں ایک طرف کمال اختیار کا ذکر آتا ہے تو دوسری طرف آغاز جبلت سے ہر قسم کے تحفظ کا۔

یہی دشواری تھی جس کے پیش نظر علمائے اسلام نے اس کی تفسیر میں صراحت کے بجائے اشارات سے کام لیا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ عصمت ایک " لطفِ خفی " ہے جسے پروردگارِ عالم اپنے مخصوص بندوں کے شامل حال کر دیا کرتا ہے اور اس کے بعد وہ ہر قسم کی خطا و معصیت سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لطف کیا ہے؟ اور پروردگار اسے اپنے مخصوص بندوں کو کیوں عطا کرتا ہے۔ عطا میں ان بندوں کا کیا کمال ہے کہ ان کے حسنِ کردار کی تعریف کی جائے؟

یہ سوالات اس وقت تک لاجواب رہیں گے جب تک عصمت کا صحیح مفہوم سامنے نہ آجائے اور معصوم کے کردار کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے اور یہ بات ایک غیر معصوم کے لئے تقریباً ناممکن ہے ——— مناسب یہی ہے کہ ان مباحث میں الجھنے کے بجائے عصمت کے آثار و مظاہر پر نظر کی جائے اور معصوم کے اعمال و کردار کی نوعیت کا اندازہ کیا جائے۔

عصمت کے بارے میں ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق صرف اختیاری اعمال سے ہوتا ہے یا اس کا دائرہ کسی قدر وسیع ہے

علماء اسلام کے نزدیک عصمت صرف اختیارات سے تعلق رکھتی ہے ———

خطا ونسیان عصمت کے حدود سے باہر ہیں۔ اسی لئے وہ حضرات مرسل اعظمؐ کو معصوم مانتے ہوئے بھی آپ کی زندگی میں سہو ونسیان کے قائل ہیں۔ اور ان کی نظر میں سہو ونسیان کی خطائیں خطا شمار نہیں کی جاتیں اور نہ ایسے آدمی کو گنہگار کہا جاسکتا ہے۔

یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے ــــــ لیکن مسئلہ سہو ونسیان کے اعمال کو خطا و گناہ کہے جانے یا شمار کرنے کا نہیں ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ معصوم سے خطا ونسیان کا امکان بھی ہے یا نہیں اور ضرورت عصمت کے دلائل سہو ونسیان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں یا نہیں؟

"صاحب عماد الاسلام" علامہ سید دلدار علی مرحوم "غفرانمآب" نے عصمت کے موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اور یہ واضح کیا ہے کہ عصمت ہر قسم کی غلطی سے منزہ و مبرا ہونے کا نام ہے۔

اس مقام پر اس بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کے دلائل کا تقاضا کیا ہے اور اس عظیم عصمت کے اثبات کے وسائل و دلائل کیا ہوں گے؟

یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عصمت کی تعبیر ایک "لطف خاص" کے علاوہ اور کچھ نہیں کی جاسکتی ــــــ اور لطف خاص میں سوائے رحمت الٰہی کسی اور بات کا دخل نہیں ہوتا وہ جسے چاہتا ہے یہ کمال عطا کر دیتا ہے اور جب عطا کر دیتا ہے تو اس میں یہ شان پیدا ہو جاتی ہے کہ سارے اختیارات رکھتے ہوئے بھی گناہوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اس طرح معصوم کا عمل قابل تعریف نہ ہوگا اور یہ کہنے کی گنجائش باقی رہے گی کہ پروردگار نے یہ کمال ہمیں عطا کر دیا تو ہمارا کردار بھی اتنا ہی پاکیزہ ہوتا اس لئے کہ یہ بات اپنے مقام پر صحیح ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک "تعریف" کا تعلق ہے اس کے لئے یہی کیا کم ہے کہ پروردگار نے انھیں اس لطف کے لائق سمجھا اور ہمیں نہیں سمجھا۔ وہ اس کمال کے سزاوار تھے اور ہم نہیں ہیں۔

اب یہ تفریق کیوں قائم کی گئی اور پروردگار نے یہ امتیاز کیوں رکھا؟ ــــــ

یہ الگ ایک سوال ہے جس کا مختصر جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مالک کائنات نے تمام بندوں کو ایک ہی مقصد کے لئے نہیں پیدا کیا ہے۔ حکیم علی الاطلاق کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا ــــــ حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جس شخص کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کی شخصیت کو مقصد کے تمام لوازم و ضروریات سے آراستہ کر کے پیدا کیا جائے۔

اس کے بغیر مقصد پر وارد ہونے والے نقائص کی ذمہ داری "خالق عالم" کے علاوہ کسی اور ہستی پر نہ ہوگی۔

اور جب یہ بات مسلم ہے کہ تخلیق کو مقصد کے مطابق ہونا چاہئیے تو معصوم اور غیر معصوم کی تفریق میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔

دنیائے انسانیت کے افراد دو قسم کے ہیں ــــــ بعض افراد وہ ہیں جنہیں ہدایت حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اور بعض افراد وہ ہیں جنہیں ہدایت یافتہ بنا کر ہدایت خلق کے لئے ہی مبعوث کیا گیا ہے۔

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ"

"اس رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی اور انسان کو پیدا کیا۔"

اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض افراد انسانی کو تعلیم قرآن کے بعد عالم مادیات میں خلق کیا گیا ہے۔

جناب آدمؑ کے بارے میں خلقت بشری سے پہلے ہی منصب خلافت کا اعلان ہو گیا تھا اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ آنے والا بشر خلافت و نیابت کے جملہ لوازم لے کر آئے گا اور اس کی تخلیق کا اہتمام دیگر افراد بشریت سے الگ کیا جائے گا۔

اب اگر روز اول تخلیق آدمؑ میں یہ تفریق ممکن ہے کہ آدمؑ کو منصب دار بنانے کے بعد

بشر بنایا جائے اور باقی افراد نوع کو بشر بنانے کے بعد کسی لائق قرار دیا جائے تو معصومین کے بارے میں بھی یہ امکان ہے کہ ان کی تخلیق میں ایک مخصوص اہتمام برتا جائے اور غیر معصومین کی محفل میں انھیں ابتداء خلقت ہی سے معصوم بنا کر بھیجا جائے۔

دیگر افراد کا وجود ہدایت حاصل کرنے کے لئے ہے اور معصومین کا وجود ہدایت دینے کے لئے ہے۔

ہدایت دینے والے کو ہدایت لینے والے سے ہر طرح ممتاز و بلند تر ہونا چاہئیے۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ اس طرح معصومین کے کردار کا کوئی کمال نہ رہ جائے گا اور پروردگار عالم جسے ابتدائے خلقت سے معصوم بنا دے گا۔ وہی بلند کردار اور پاکیزہ نفس ہو جائے گا اس لئے کہ یہ امتیاز و انتخاب خود ایک کمال و رفعت ہے جس کی نظیر عالم امکان میں نہیں ملتی ہے ——— اس کے علاوہ یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا جب مالک کائنات کسی بندے کو معصوم پیدا کرتا۔ اور کسی کو غیر معصوم۔

اور پھر غیر معصومین سے یہ تقاضا کرتا کہ تمہارا کردار بھی معصومین جیسا ہونا چاہئیے — تمہارے اعمال میں بھی عصمت کی پاکیزگی ہونی چاہئیے

تمہارے افکار پر بھی عصمت کی چھاپ ہونی چاہئیے۔ اور تمہاری زندگی میں کبھی سہو و نسیان کا گزر نہ ہونا چاہئیے۔

مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مالک نے جسے جن صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اس کی ویسی ہی ذمہ داریاں رکھی ہیں۔ اور ویسا ہی محاسبہ رکھا ہے۔ غیر معصوم کی ذمہ داریاں اور ہیں اور معصوم کی ذمہ داریاں اور ——— غیر معصوم سے محاسبہ کا انداز اور ہے اور معصوم سے محاسبہ کا انداز اور۔

غیر معصوم سے اس کے اعمال و کردار کے بارے میں محاسبہ ہوگا۔ اور معصوم سے اصل دین و ایمان کے بارے میں حساب لیا جائے گا۔

غیر معصوم میدان جہاد میں جان دینے کا ذمہ دار ہے۔ عزت دین کا ذمہ دار نہیں ہے اور معصوم تحفظ دین و ایمان کا بھی ذمہ دار ہے اور مجاہدین کے جان و مال کا بھی۔

اقسام عصمت

عصمت کے مباحث علم میں نہایت تفصیل سے نقل کئے گئے ہیں یہاں ان مباحث کے چھیڑنے کا محل نہیں ہے۔ صرف اس قدر تذکرہ کرنا مقصود ہے کہ عصمت کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے صرف واجبات و محرمات کا پاس و لحاظ شامل ہے۔ اصطلاحی عصمت بھی ایک خدائی ضمانت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

عصمت میں سہو و نسیان سے مبرا ہونے کی قید یا ترک اولیٰ نہ ہونے کی شرط لفظ عصمت کے مفہوم سے نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے جداگانہ دلائل ہیں جنکی روشنی میں ان شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل عصمت کردار کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ اس میں سہواً کوئی لغزش کبھی ہو جائے تو لفظ "عصمت" کے خلاف نہ ہوگا۔ عصمت کے ساتھ منصب کا امتزاج ذمہ داریوں کو بڑھا دیتا ہے۔ اور مالک کائنات کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اپنے مقصد کے تحفظ کے لئے صاحبان منصب کو ایسی عصمت عطا کرے جس میں

سہو و نسیان کا بھی گزر نہ ہو۔

سہو و نسیان کے ہوتے ہوئے شریعت کی بربادی کا امکان باقی رہے گا، اور یہ بہت ممکن ہوگا کہ صاحب منصب بہت سے احکام سہو و نسیان کی بناء پر چھوڑ دے اور انکی واقعی تبلیغ نہ ہو سکے۔

ان بیانات پر نظر کرنے کے بعد یہ بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ اصل عصمت کا مفہوم اور ہے اور منصب کے ساتھ شامل ہونے والی عصمت کا انداز اور۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب رب العالمین نے ایک غیر منصب دار خاتون کی عصمت کو ظاہر کرنا چاہا تو ایسا بلیغ لہجہ اختیار کیا جس کے بعد منصب اور غیر منصب کی عصمت میں فرق نہ رہ جائے۔

"یطھرکم تطھیرا"

حق طہارت صدیقۂ طاہرہ کی اس عصمت کا اعلان ہے جو صاحبان منصب کو دی جاتی ہے۔ اور جس میں کسی نقص یا عیب کا گزر نہیں ہوتا۔

عصمت و عدالت

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر عصمت و عدالت کے فرق کو بھی واضح کر دیا جائے کہ بعض سادہ لوح اہل علم کا خیال ہے کہ عصمت اپنے عمومی مفہوم کے اعتبار سے عدالت کے ہم معنی ہے۔ عادل کو اس وقت تک عادل نہیں کہہ سکتے جب تک کہ وہ واجبات شرع کا پابند اور محرمات شرع سے پرہیز کرنے والا نہ ہو۔ اور معصوم کو اس وقت تک معصوم نہیں کہہ سکتے جب تک وہ احکام الٰہیہ کی مکمل پابندی نہ کرے۔ اس کے بعد عصمت و عدالت میں فرق کرنا ایک لاطائل بحث ہے

لیکن دقت نظر کے بعد یہ خیال انتہائی مہمل معلوم ہوتا ہے۔ عصمت و عدالت کے

ساتھ اس بات میں مشترک ضرور ہے کہ دونوں میں احکام شرعی کی پابندی کی شرط ہے لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔

عدالت اپنی ریاضت اور کوشش سے پیدا کی جاتی ہے اور عصمت مالک کائنات کا عطیہ ہوتی ہے۔ عدالت کے بارے میں رب العالمین کی طرف سے کوئی ضمانت نہیں ہوتی اور عصمت کے بارے میں مالک کائنات کی ضمانت ہوتی ہے کہ اس کے کردار میں کوئی نقص و عیب نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ضمانت کے طریقے مختلف ہیں۔ کبھی یہ ضمانت صریحی آیات و بیانات کے ذریعہ لی جاتی ہے اور کبھی منصب اور عہدہ کے ذریعہ۔

منصب کے ذریعہ انبیاء کرام اور ائمہ معصومینؑ کی عصمت کی ضمانت لی گئی ہے اور دیگر بیانات کے ذریعہ بقیہ معصومین کی عصمت کی ضمانت لی گئی ہے۔ ضمانت دونوں مقامات پر ضروری ہے۔

ضمانت کے مفہوم کا ایک جزو ہے جس کے بغیر "اصطلاحی" عصمت کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اس تفصیل کے بعد جب ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور علماء اعلام کے ان بیانات پر نظر ڈالتے ہیں۔ جہاں بہت سے اکابر علماء نے حضرت عباسؑ، حضرت زینبؑ حضرت علی اکبر اور حضرت ام کلثوم جیسی شخصیتوں کے لئے عصمت کا دعویٰ کیا ہے تو ہمیں اس عصمت کی تحقیق کرنا پڑتی ہے اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر عصمت سے مراد کیا ہے؟

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہاں عصمت سے مراد وہ درجہ عصمت نہیں ہے جو آل محمدؐ کے منصب کا خاصہ ہے۔ یہ عصمت صرف انھیں حضرات کے لئے ہے ان کے علاوہ سابق کے منصب داروں کو بھی عطا نہیں کی گئی۔ غیر منصب دار افراد کا کیا تذکرہ ہے؟ یہاں وہ عصمت بھی مراد نہیں ہے جو عام منصب کا خاصہ ہوتی ہے اور جس

کی ضمانت منصب کے ذیل میں لی جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات منصب کے حامل نہیں تھے ان کی عصمت صدیقہ طاہرہ جناب فاطمہؑ کی جیسی "عصمت مطلقہ" بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے لئے آیت تطہیر کی صراحت موجود ہے۔ اور یہاں ایسی کوئی صراحت و وضاحت نہیں ہے۔

اس کے بعد عصمت کا صرف ایک مفہوم رہ جاتا ہے کہ انسان اتنا پاکیزہ کردار ہو کہ اس کی زندگی میں کوئی واجب ترک نہ ہوا ور کسی حرام کا ارتکاب نہ ہوا ہو بلکہ مکروہات و مستحبات کا بھی پاس و لحاظ رہا ہو ــــ اور اس مطلب کا ان بلند و بالا شخصیتوں کے لئے ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ نہ اس کے لئے کسی حیرت کی ضرورت ہے اور نہ غلو یا مبالغہ کے تصور کی۔

ارشادات معصومینؑ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عباسؑ کردار کی اس منزل پر فائز تھے۔ جہاں کسی خطا کے سرزد ہونے کا عادی امکان نہ تھا ــــ یہ اور بات ہے کہ اس کی ضمانت مالک کائنات کی طرف سے نہیں تھی ورنہ اسے "عصمت مطلقہ" سے تعبیر کیا جاتا۔

اسی بنا پر میں نے عصمت کی بحث کو وراثتی اوصاف میں درج کیا ہے کہ عصمت "پاکیزہ نسل" اور "پاکیزہ ماحول" کا نتیجہ ہے جہاں پیش نگاہ ہمیشہ کردار طیب و طاہر ہوتا ہے ــــ اور تربیت اتنی بلند و برتر ہوتی ہے کہ معصیت و گناہ کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہو سکتی۔

علم و عرفان رہنمائی کرتا ہے اور طہارت نفس برائیوں کے راستوں پر پہرے بٹھاتی رہتی ہے۔

حضرت عباسؑ کے بارے میں بعض علماء کرام کے کلمات میں جس علم لدنی کا ذکر کیا گیا ہے ــــ اس کا تعلق بھی غالباً اسی پاکیزہ وراثت سے ہے جہاں علم علیؑ رگوں

میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ اور زینبؑ و عباسؑ کسی دنیوی تعلیم و تربیت کے بغیر امام معصوم کی نگاہ میں "عالم" کا درجہ رکھتے تھے۔

عباسؑ کو اپنے امتیازی اور مقصدی" وجود کی بناء پر مولائے کائنات سے کیا کیا ملا۔ اس کا اندازہ کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

مولائے کائنات نے جس مقصد کے لئے عباسؑ کو مہیا کیا تھا ان کے جملہ خصوصیات ولوازم عباسؑ کی فطرت میں ودیعت فرما دیئے تھے اور ام البنین کا یہ فرزند روز اول سے ان کمالات کا حامل تھا جن کے حامل گزشتہ ادوار میں انبیاء کرام ہوا کرتے تھے۔ بلکہ وجود کی یہ مقصدیت ایک ایسا شرف ہے جس نے عباسؑ کو دیگر شہداء سابقین سے بھی بالاتر بنا دیا ہے۔

جس کا زندہ ثبوت امام زین العابدینؑ کا یہ ارشاد ہے کہ:-

"میرے چچا عباسؑ کو وہ درجہ حاصل ہے جسے دیکھ کر روز قیامت شہداء اولین و آخرین غبطہ کریں گے۔"

اس مقام پر یہ توہم نہ ہونا چاہیئے کہ انبیاء و مرسلین اصطفیٰ اعتبار سے ضمانتی عصمت کے حامل تھے۔ اور حضرت عباسؑ اس اعتبار سے معصوم نہ تھے۔ یا انبیاء کرام درجۂ نبوت پر فائز تھے۔ اور حضرت عباسؑ کو منصب الٰہی کا شرف حاصل نہ تھا۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ ایک منصب دار معصوم غیر منصب دار کے درجہ پر غبطہ کرے اور غیر منصبدار کو ایسا درجہ مل جائے جو منصبدار کو بھی میسر نہ ہو سکے۔

اس لئے کہ قیامت کے درجات دنیا کے درجات سے مختلف ہیں۔ دنیا کے درجات "ذمہ داریوں" کے اعتبار سے تقسیم کئے جاتے ہیں اور آخرت کے درجات ذمہ داریوں پر عملدرآمد کے اعتبار سے۔

انبیاء کرام کی نبوتیں تبلیغ دین کی ذمہ داریوں کی بناء پر تھیں جس کے ذمہ جیسی

تبلیغ تھی اتنی ہی اہم اس کی نبوت تھی اور جب وہ ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کر کے مالک کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو اسی اعتبار سے انھیں درجہ بھی عطا ہوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو درجہ تبلیغی ذمہ داریوں کی بناء پر دیا جائے گا وہ کسی اور اہم ذمہ داری کی ادائیگی میں نہ دیا جائے گا یا کسی ذمہ داری کی ادائیگی پر اس سے اہم درجہ نہ دیا جائے گا۔

انبیاء کرام کی تبلیغی ذمہ داریاں اور ان کی ادائیگی مسلم ہے

لیکن مالک کائنات نے ایک ذمہ داری حضرت عباسؑ کے سر رکھی تھی جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے انبیاء کی تبلیغی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ اور اس کی ادائیگی پر ان معصومین کے درجہ سے بلند درجہ بھی مل سکتا تھا۔

یہ سوال الگ ہے کہ یہ شرف ایک غیر منصب دار ہی کو کیوں دیا گیا؟ اور اس کے لئے کسی منصب دار کا انتخاب کیوں نہیں کیا گیا۔

اس کا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ دور سابق میں یہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔ اس شرف کا تعلق آخری شریعت کے تحفظ سے تھا۔ اسے سابق کے کسی بھی انسان کو دیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

غیر منصبدار کو عطا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ منصبدار دین کا تحفظ کرتا ہے خود منصبدار کا تحفظ نہیں کرتا۔ اس کام کے لئے دوسرے ہی افراد ہوتے ہیں۔ مالک کائنات نے یہ شرف انھیں افراد کے لئے رکھا ہے جو صاحبان منصب کے تحفظ میں اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اور ہر طرح دین اور صاحب دین کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

سقایت

کسی تشنہ لب اور تشنہ جگر کو سیراب کرنا ایک ایسا عمل خیر ہے جس کے حسن پر عقل و شرع دونوں کا اتفاق ہے۔

عقلی اعتبار سے سیرابی ایک ضرورت مند کی حاجت روائی اور ایک "مرنے والے" کی زندگی کے مرادف ہے جس کے استحسان میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

شرعی اعتبار سے یہ عمل خیر اتنا عظیم عمل ہے کہ خود مالک کائنات نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

انسانوں کو سیراب کرنا تو بڑی بات ہے مالک کائنات نے تو جانوروں کے سیراب کرنے کو بھی اپنے عظیم احسانات اور پانی کے اسباب تخلیق میں شمار کیا ہے۔

"وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا لِنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا"

(ہم نے آسمان سے پانی اس لئے نازل کیا ہے کہ اس سے مردہ زمینوں کو زندہ بنائیں اور حیوانات و انسان کو سیراب کریں)

زمینوں کے زندہ کرنے کا تذکرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی اسباب حیات میں ہے ـــــــ پانی زمین کو بھی دے دیا جائے تو زمین کو زندہ کرنے کا مرتبہ رکھتا ہے۔ صادق آل محمدؑ سے پوچھا گیا۔

مولا! پانی کا ذائقہ کیا ہے۔

فرمایا جو زندگی کا ذائقہ ہے ـــــــ یعنی پانی اور حیات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حیات ہی نہیں ـــــــ پانی ہر ذی حیات کی اصل اور اس کا قوام ہے۔

"وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ"

ہم نے ہر ذی حیات کو پانی سے خلق کیا ہے۔ پانی اور زندگی میں ایک ایسا گہرا رابطہ ہے جس سے کسی قیمت پر انکار نہیں کیا جا سکتا ـــــــ پانی قوام زندگی ہے پانی اصل زندگی ہے۔ پانی جان زندگی ہے ـــــــ پانی روح زندگی ہے ـــــــ پانی خود زندگی ہے۔

خالق عالم نے پانی کی تخلیق کا بار بار تذکرہ فرمایا ہے۔ اور اسے انسان کے مقابلہ میں اپنا کرم و احسان قرار دیا ہے۔

"اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ"

کامل مبرد ص ۳۰۸ میں یہ واقعہ درج ہے کہ قیصر روم نے شام کے حاکم معاویہ کے پاس ایک شیشی بھیجی اور یہ کہا کہ اس میں دنیا کی ہر شے رکھ دی جائے؟ حاکم شام اس مطالبہ پر حیران ہو گیا اور اس نے ابن عباس سے مدد چاہی۔ ابن عباس نے فرمایا کہ اس شیشی میں پانی بھر دو۔ وہی ہر شے کی اصل روح ہے۔

معاویہ نے پانی بھر کر بھیجا اور قیصر روم یہ دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ کہ حقیقتاً اس مسئلہ کا حل یہی ہے۔

اس واقعہ سے جہاں ابن عباس کے علم اور ان کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی اصالت و اہمیت ایک عقلی مسئلہ ہے جس پر امت قرآن کے علاوہ امت انجیل کا بھی اتفاق ہے۔

اس واقعہ کی روشنی میں جب ابن عباس کے مشہور و معروف اعلان پر نظر جاتی ہے تو تاریخ کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

واقعہ مشہور ہے کہ ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آپ کے اور علیؑ کے علم میں کیا فرق ہے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ "علیؑ" کے علم کے مقابلہ میں میرا علم ویسا ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں قطرہ ہوا کرتا ہے ——— علیؑ ایک بحر ناپیدا کنار ہیں اور میں ایک قطرۂ ناچیز۔

کاش حاکم شام اس نکتہ پر بھی توجہ دیتا اور اسے یہ بھی اندازہ ہوتا کہ قطرہ سے تمسک کرنے کے بعد سمندر سے اختلاف کرنا کسی طرح کی دانشمندی نہیں ہے۔ یہ ایک علمی خیانت ہے کہ سمندر سے اختلاف کر کے اس کے قطرہ سے استفادہ کیا جائے۔

پانی کی عظمت سے سقائی کی عظمت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور روایات و احادیث کا سہارا لئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی تشنہ جگر کو پانی پلانا ایک مردہ کو زندگی دینے کے مرادف ہے۔ تاہم مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے دونوں فرقوں کی بعض حدیثیں نقل کر کے ان کی روشنی میں سقائی کی عظمت کا اعلان کیا جائے۔

امام احمد و ابو داؤد نے بیہقی کے حوالہ سے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضور سرور کائنات نے فرمایا۔ "پانی پلانے سے زیادہ باعث اجر و ثواب کوئی کار خیر نہیں ہے۔"

امام احمد ہی نے سعید بن عبادہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضور سے عرض کی۔ "میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے کوئی صدقہ دے سکتا ہوں؟"

آپ نے فرمایا: "بے شک"

سعد نے کہا: "تو بہترین صدقہ و عمل خیر کیا ہے؟"

فرمایا: "سیرابی"

ابن ماجہ نے حضور کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ نے عائشہ سے خطاب کر کے فرمایا۔

" جس نے کسی شخص کو اس جگہ پانی پلایا جہاں پانی میسر ہے، اس نے گویا ایک نفس کو آزاد کیا۔ اور جس نے وہاں پانی پلایا جہاں پانی میسر نہیں ہے۔ اس نے گویا ایک نفس کو زندہ کیا۔" (تاریخ ابن عساکر ص ۲۴۷)

مکارم الاخلاق ص ۵۰ پر یہی روایت صادق آل محمدؑ سے نقل کی گئی ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے کہ جس نے ایک نفس کو زندہ کیا اس نے گویا پوری دنیائے انسانیت کو زندہ کر دیا۔

شیخ طوسی کے فرزند اپنی امالی میں روایت درج کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے اس عمل کے بارے میں سوال کیا جو جنت سے قریب تر کرنے والا ہے ——— تو آپ نے فرمایا کہ ایک مشک خرید لو اور اس وقت تک اس سے سیراب کرتے رہو جب تک وہ پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ یہی وہ عمل ہے جو جنت تک پہنچا سکتا ہے۔"

دار السلام ۳ ص ۱۶۲ کی روایت کی بناء پر تشنہ جگر کو سیراب کرنا بہترین اعمال میں سے ہے چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ سیراب کیا جائے۔

ان روایات سے صاف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب جانوروں کو سیراب کرنا بہترین اعمال میں ہے۔

اور سیرابی زندگی دینے کے مرادف ہے تو جتنی بڑی شخصیت کو سیراب کیا جائے گا اتنی ہی باعظمت زندگی عطا کرنے کا اجر و ثواب ملے گا۔

اور یہی آئینہ ہے جس میں حضرت عباسؑ کی سقائی کا عکس نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔"

اس مقام پر صرف سقائی اور اس کے فضائل و مناقب کا تذکرہ مقصود نہیں ہے تاریخی اعتبار سے یہ ذکر بھی کرنا ہے کہ حضرت عباسؑ کو یہ شرف بھی وراثت میں ملا تھا اور اس کا سلسلہ تاریخ میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

ہاشمی بزرگوں میں اس فہرست میں سب سے پہلے جناب قصیؔ کا نام آتا ہے جن کی سقائی کے سامنے تمام قریش کی گردنیں بار احسان سے خم تھیں۔ اور آپ حاجیوں کو "شیریں پانی" سے سیراب کیا کرتے تھے۔

بلکہ اس راہ میں یہ زحمت بھی برداشت فرماتے تھے کہ بیرون مکہ سے مکہ کے اندر پانی لایا جائے تاکہ حاجیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ نے ایک کنواں بھی کھودا تھا جو آپ کے لئے سرمایۂ افتخار بن گیا اور یہ مشہور ہوگیا کہ اس انداز کی سقایت کسی نے نہیں کی۔ فتوح البلدان ص۵۴۔

آپ کے بعد یہ ورثہ جناب عبدالمطلب کو ملا۔ انھوں نے اپنے آبائی آثار کو زندہ رکھنے کے لئے چاہِ زمزم کی تجدید کی اور یہ طے کیا کہ نیا کنواں کھودنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کنواں کو برآمد کیا جائے جو حضرت اسمٰعیل کی پیاس کی نشانی اور ان کی کرامتوں کی یادگار ہے۔

چاہِ زمزم آباد ہوا۔ عرب دور دراز سے سیراب ہونے کے لئے آنے لگے اور ایک مرتبہ سقائی کی عظمت کا پھر اعلان ہوگیا۔

دین اسلام نے اس عمل خیر کو اس قدر اہمیت دی کہ ایک اللہ کے مخلص بندے کو سیراب کرنے کے لئے ہاجرہ نے دو پہاڑیوں کے درمیان دوا دوش کی تو اسلام نے اس انداز دوش کو ارکان حج میں شامل کردیا۔ حج کے مبارک موقع پر مسلمانوں کی سعی ہاجرہ

کے اخلاص کی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ سقائی کی عظمت کا اعلان ہے کہ یہ عمل خیر ایک ایسی عبادت ہے جو نسلاً بعد نسلٍ زندہ رکھی جاسکتی ہے۔

قریش نے اپنے حسد کی بنا پر چاہا کہ اس کنواں کو ختم کردیا جائے اور عبدالمطلب کا امتیاز ختم ہوجائے لیکن قدرت نے یہ اہتمام کیا کہ جس جس نے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی وہ کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہوگیا۔ (شرح نہج البلاغہ ص۴۶)

آپ نے اس نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کیا اور اس میں کشمش ڈال کر لوگوں کو شیریں پانی پلانا شروع کردیا۔ ایک حوض میں دودھ بھی جمع کردیا کہ حجاج کرام اس سے بھی سیراب ہوسکیں۔ (سیرہ وحلافی ا ص۳۶)

آپ کے بعد یہ ذمہ داری جناب ابوطالب نے سنبھالی اور اس حسن و خوبی سے ادا کی کہ قرض لے کر اس آبائی یادگار کو قائم کیا اور حسن عمل کا یہی امتیاز تھا کہ آپ کو سب سے پہلے "ساقی الحجیج" کے لقب سے یاد کیا گیا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ نفوس قدسیہ کتنے بلند و باعظمت تھے جنھیں اپنے گھروں کا فاقہ گوارا تھا۔ اپنی پشت پر بار قرض برداشت تھا۔ لیکن یہ برداشت نہ تھا کہ دور دراز سے آئے ہوئے حجاج عرب کی دھوپ سے جھلسے ہوئے چہرے۔ دیگر ارجاز سے طیبہ اللہ کے مہمان پیاسے رہ جائیں اور ان کے چہروں پر پژمردگی کے آثار نمایاں ہوسکیں۔

ابوطالب کی زندگی یہی تھی کہ حجاج کرام کو زندگی مل جائے۔ ان کی شادابی یہی تھی کہ اللہ کے مہمانوں کے چہروں پر شادابی کی لہر دوڑ جائے

جناب ابوطالب کے بعد سقائی کا یہ منصب مولائے کائنات امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب کے حصہ میں آیا۔

آپ کی سقائی کے واقعات تاریخ کے اوراق پر بکھرے ہوئے ہیں۔

اس مقام پر صرف تین مواقع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ایک حیات پیغمبرؐ میں۔ اور دوسرے بعد وفات پیغمبرؐ۔

ان مواقع کا امتیاز یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے عام امت پر احسان فرمایا ہے۔ اور دوسری مرتبہ مسلمانوں کے حاکم کی مشکل کشائی فرمائی ہے۔ تیسری مرتبہ دشمن کے مقابلہ میں اپنے بلند کردار کا ثبوت دیا ہے۔

پہلا موقع

ماہ مبارک رمضان کی سترہویں تاریخ ہے۔ اسلام کا مختصر سا لشکر مقام بدر تک پہنچ چکا ہے۔ اندھیری رات ہے۔ پیاس کا غلبہ ہے۔ مجاہدین پریشان ہیں۔ اور مرسل اعظم ذمہ دار لشکر۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے علم غیب کی بنا پر مسلمانوں کو خبر دی کہ اس مقام پر ایک کنواں ہے۔ تم میں سے کوئی شخص جا کر اس کنویں سے پانی لے آئے۔ اور لشکر اسلام کو سیراب کر دے۔

اسلام کے مجاہدین "اصحاب بدر" دم بخود تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر پیاسے مسلمانوں کو سیراب کر سکتا۔

مجمع کا سکوت دیکھ کر ابوطالب کے لال اور عبدالمطلب کے وارث کو جوش آ گیا اور آپ نے فوراً اپنے خدمات پیش کر دیئے اور مشکیزہ دوش پر رکھ کر چاہ بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اندھیری رات، نئی جگہ۔ " راہ در چاہ گم۔" صاحب علم لدنی کے قدم بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کا شیر بلا خوف و خطر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

یہاں تک کہ چاہ بدر تک پہنچے۔ عرب کے کنویں، رسیاں مفقود۔ تاریکی کا عالم۔ ایک ہمت مردانہ کے ساتھ کنویں کے اندر اترے اور مشکیزہ کو بھر کر مرسل اعظمؐ کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستہ میں ایک تیز آندھی آئی اور آپ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آگے بڑھے اور پھر آندھی آئی پھر ٹھہر گئے۔ کچھ دیر دم لے کر پھر چند گام چلے اور ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

تین منزلیں طے کرنے کے بعد مرسل اعظمؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے پانی مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "یا علیؑ! تم نے آنے میں بڑی دیر لگائی۔ سوال کا لہجہ بتا رہا تھا کہ مرسلؐ اعظم اپنی زبان مبارک سے کسی حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت علی نے بھی نہایت ادب سے فرمایا۔ حضورؐ مجھ سے زیادہ باخبر ہیں ـــــــــ تین مرتبہ شدید آندھیوں نے راستہ روکا اور مجھے ٹھہر جانا پڑا۔ ۔ ۔ آپ نے فرمایا۔ یا علیؑ! یہ آندھیاں نہیں تھیں۔ یہ تمہارے مجاہدات کو دیکھ کر مالک کائنات نے جبرئیل و میکائیل و اسرافیل کو ایک ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ تمہارا استقبال کریں اور تم پر سلام کریں ـــــــــــــــ چنانچہ ان فرشتوں نے تم پر سلام بھی کیا ہے۔"

ظاہر ہے کہ امیرالمومنینؑ سے بہتر اس حقیقت سے باخبر کون تھا ـــــــ لیکن آپ نے اس علم کو حضور اکرمؐ کے حوالے کر دیا تا کہ اپنی عظیم فضیلت کا اعلان بھی زبان فیض ترجمان رسالت سے ہو اور دنیائے اسلام کو معلوم ہو جائے کہ علیؑ کی شان کرم کیا ہے اور

علیؑ کو آسمان والے کیا سمجھتے ہیں۔

مولائے کائنات کی یہی فضیلت تھی جس کے پیشِ نظر کسی "صاحب البصیرت" نے کہا تھا کہ اس علیؑ کے فضائل و کمالات کا کیا احتصاء ہو سکتا ہے جس نے ایک شب میں تین ہزار تین فضائل حاصل کر لئے ہوں۔

سید حمیری نے بھی اپنے قصیدہ میں اس منقبت کو نظم کیا ہے۔ قصیدہ کے آخری اشعار یہ ہیں۔

ذَاكَ الَّذِی سَلَّمَ فِی لَیْلَةٍ ـ عَلَیْهِ مِیْكَالُ وَجِبْرِیْلُ

مِیْكَالُ فِی اَلْفٍ وَجِبْرِیْلُ فِی اَلْفٍ وَیَتْلُوْهُمْ سَرَافِیْلُ

لَیْلَةَ بَدْرٍ مَدَدًا نَزَّلُوْا كَاَنَّهُمْ طَیْرًا اَبَابِیْلُ

علیؑ وہ صاحبِ کمال انسان ہے جس پر ایک رات میں میکائیل، جبرئیل اور اسرافیل نے ایک ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ سلام کیا ہے۔ یہ سب بدر کی رات ویسے ہی مدد کیلئے نازل ہوئے تھے جیسے[1] تحفظ کعبہ کے لئے ابابیل کا لشکر آیا تھا۔

---

[1] فرق صرف یہ ہے کہ کل بیت کے لئے ابابیل کا لشکر آیا تھا۔ اور آج اہل بیت کیلئے جبرائیل و میکائیل و اسرافیل کا لشکر آیا ہے۔
(جوادی)

دوسری منزل

مسلمانوں کے تیسرے حکمراں "ــــ" عثمان بن عفان" قلعہ بند ہو چکے ہیں۔ انتقامی طاقتوں نے چاروں طرف سے قصر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ آمد و رفت کے سلسلے مسدود ہیں۔ شام سے آنے والی امدادی فوجیں بھی مدینہ سے دور خیمہ زن ہیں۔ اور کسی خاص موقع کا انتظار کر رہی ہیں۔

کوئی نہیں۔ جو "خلیفۂ وقت" کی امداد کو پہنچے۔ اور انھیں ان کے دشمنوں سے نجات دلائے ــــ "قوم کا حکمراں" قصر کی چھت سے فریاد کر رہا ہے ــــ اور قوم تماشائی بنی کھڑی ہے۔

وہ ابوطالبؑ کا لال ہی تھا جس نے بنو امیہ کے بادشاہ اور ابو سفیان کے خیر خواہ کی زندگی کی آخری تدبیر کی اور مختلف ذرائع سے قلعہ تک پانی پہنچا دیا۔

مولائے کائنات علیؑ بن ابی طالب پر قتل عثمان کا الزام لگا کر جمل و صفین کے میدان آراستہ کر دینا بہت آسان ہے ــــ لیکن ایسے نازک وقت میں ایک "تشنہ لب" کی جان بچانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ صرف "ساقی کوثر"[1] کا فیض تھا۔ کہ انھوں نے سقایت کی اہمیت کا اعلان کرتے ہوئے حکومت کو سیراب کرنے کا انتظام کیا اور مسلمانوں کو ایک عظیم

---

[1] یہ واقعہ دلیل ہے کہ جس طرح علیؑ نے دنیا میں اہل دنیا کو سیراب کیا ہے اسی طرح آخرت میں کوثر کے کنارے صاحبانِ ایمان کو سیراب کریں گے۔ (جوادی)

سبق دے دیا کہ "انتقامی اقدامات" اپنے مقام پر ہیں۔ کسی پیاسے پر پانی بند نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ جس تاریخ نے ان واقعات کو درج کیا ہے ـــــــ

سی تاریخ نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ ابن زیاد نے امام حسینؑ اور ان کے بچوں پر پانی بند کرنے کے حکم میں یہ حوالہ دیا تھا کہ انھیں اسی طرح پیاسا رکھو جس طرح خلیفہ عثمان کو پیاسا رکھا گیا تھا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

کاش اولادِ رسولؐ کی طرح "ابوسفیان کی اولاد" کو پیاسا رکھا جاتا۔ جس کا لشکر مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈالے رہا اور ایک قدم آگے نہ بڑھا ـــــــ یہاں تک کہ خلیفہ کا قتل واقع ہوگیا۔

امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ عثمان کے بارے میں معاویہ کا کردار تین حال سے خالی نہیں تھا۔ اگر وہ انھیں ظالم سمجھتا تھا تو اس کا فرض تھا کہ انھیں ظلم سے روکتا اور مخالفین کی امداد کرتا ـــــــ اور اگر مظلوم سمجھتا تھا تو ان کی کمک کرنا ضروری تھا۔ اور اگر محلِ شک میں تھا تو توقف کرنا چاہیئے تھا۔ یہ اپنی غفلت یا تغافل کا ذمہ دار مجھے قرار دے کر میرے خلاف مسلمانوں کو ورغلانے کا کیا جواز ہے اور اس کی کیا وجہ ہے؟

اربابِ تاریخ جانتے ہیں کہ یہ "حضرت عثمان" وہی "بزرگ" تھے جو مولائے کائنات کے مقابلہ میں خلافت کے دعویدار بن کے آئے تھے ـــــــ موقع تو یہ تھا کہ آپ اس وقت کو غنیمت سمجھتے اور انھیں پیاسا ہی مرجانے دیتے۔ انتقام کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں تھا۔ لیکن آپ نے ایسا نہ کیا اور پانی کا انتظام کرکے واضح کر دیا کہ ہم اہلبیتؑ ایسی انتقامی کاروائیاں نہیں کرتے جن سے ہمارے دامنِ عظمتِ کردار پر کوئی دھبہ آجائے عثمان تو پھر عثمان ہیں ـــــــ انھوں نے تو صرف خلافت میں حضرت علیؑ سے مقابلہ

کیا تھا۔ اور منصب حکومت کو حضرت علیؑ سے سلب کر لے گئے تھے۔ آپ کا کرم تو اس قدر عام تھا کہ جب حالت سجدہ میں سر اقدس پر ضربت لگانے والے ابن ملجم کو قیدی بنا کر لایا گیا ـــــــ اور جراح کی تجویز پر آپ کے لئے جامِ شربت مہیا کیا گیا تو آپ نے ابن ملجم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

پیاسا یہ بھی ہے۔ تم لوگوں نے جس طرح مجھے سیراب کیا ہے اسے بھی سیراب کرنے کا انتظام کرو۔

مولا کی وصیت پر عمل ہوا اور تاریخ میں یہ کردار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہوگیا کہ علیؑ اس کریم النفس انسان کا نام ہے جو اپنے قاتل سے بھی انتقام نہیں لینا چاہتا۔ ـــــــ اور اس کی حالت زار پر بھی رحم کھا کر اس کے لئے جامِ شیر کا انتظام کرتا ہے۔

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

دنیا میں کوئی ایسا حکمراں اور رہنما ہے جو اپنے قاتل کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے شبہات پر قتل کرا دینا سب کو آتا ہے اور قاتل کو جامِ شربت پلانا صرف علیؑ کا کردار ہے۔

یہ عبد مناف کا ترکہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ علیؑ تک پہنچا ہے۔ یہ الٰہی منصب کا فرض ہے جس کا بار علیؑ کے دوشِ اقدس پر رکھا گیا ہے

تیسری منزل

صفین کا میدان ہے۔ معاویہ کی فوجیں پیش قدمی کر کے فرات پر قبضہ کر چکی ہیں۔ دشمن کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو چکا ہے کہ اب علیؑ کا لشکر پیاس ہلاک ہو جائے گا اور لڑنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

اصحاب امیر المومنینؑ نے یہ منظر دیکھا تو گھبرا کر حضرت سے شکایت کی۔ آپ نے اتمام حجت کے لئے معاویہ کے پاس پیغام بھیجا کہ یہ اسلام کا طریقۂ جنگ نہیں ہے۔ دریا سے پہرے ہٹالو۔ اس نے اپنے رفقاء کار سے مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ علیؑ کے لشکر میں عثمان کے قاتل بھی شامل ہیں۔ ان پر پانی بند ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے پانی دینے سے انکار کر دیا۔

اصحاب امیر المومنینؑ میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور آخر کار حضرت اشتر اور اشعث مولا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی مولا! اس طرح ہمارا لشکر تباہ ہو جائیگا۔ آپ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم شام کے لشکر کو ان کے کئے کا مزہ چکھا دیں ——— مولا نے اجازت دی۔

"اروّوا السیوف من الدماء ترووا من الماء"

(تلواروں کو خون سے سیراب کر دو۔ تم پانی سے سیراب ہو جاؤ گے)

(نہج البلاغہ)

اور ۱۲ ہزار کے لشکر نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ شام کے لشکر کو شکست ہوئی اور نہر پر قبضہ ہو گیا

قبضہ ہونا تھا کہ لشکر شام کے ہوش اڑ گئے۔ اب علیؑ کا طرز عمل بھی وہی ہو گا جو ہم نے ان کے لشکر کے ساتھ اختیار کیا تھا۔

دھیرے دھیرے یہ فریاد حاکم شام کے کانوں تک پہنچی۔ اور اس نے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ علیؑ ایک مرد شریف ہیں۔ وہ کسی پر پانی بند نہیں کر سکتے۔ نتیجہ میں ایسا ہی ہوا جب شام کے نمائندے حضرت کے پاس فریاد لیکر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ ہم کسی پر پانی بند نہیں کرتے۔ پانی شریعت اسلام کی رو سے ہر ایک کے لئے مباح ہے جس کا جی چاہے سیراب ہو جائے۔ تاریخ اسلام، مناقب شہر آشوب مناقب خوارزمی۔

تاریخ بیان کرے یا خاموش رہے ——— نفسیات انسانی کا مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ ایسے نازک مواقع پر علیؑ کے ذہن میں کربلا کا تصور آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

آج وہ دن ہے کہ میں نے پانی پر قبضہ کرنے کے بعد اہل شام کو سیراب ہونے کی اجازت دے دی ہے اور کل وہ دن آنے والا ہے جب میرے فرزند اور میری اولاد پر ہی پانی بند کیا جائے گا۔

یہ اشارہ اس لئے ضروری تھا کہ اکثر تاریخ کے اہم واقعات ایسے ہیں جنہیں نام نہاد مورخین نے اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے اور ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والا یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ یہ واقعہ کسی "مستند" تاریخ میں نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارباب تاریخ نے دنیا کے تمام واقعات کا احصاء کر لیا ہے۔ اور تاریخ واقعات کے ساتھ نفسیات کا بھی کوئی آئینہ ہے۔

تاریخ کے مندرجات پر تفصیلی تبصرہ کر چکا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ صفین کے راستے میں مولائے کائنات کے سامنے کربلا کا مرحلہ آچکا تھا اور آپ اس سرزمین

پر ٹھہر کر آنسو بہا چکے تھے ــــــــــــ اب یہ ناممکن تھا کہ ایسا نازک وقت آئے اور آپ کے ذہن مبارک میں کربلا کی یاد نہ آئے۔

پانی کی منزل میں کربلا کی یاد یہ لزوم رکھتی ہے کہ عباسؑ کی یاد بھی آئے ــــــــــــ اور صفحۂ ذہن پر یہ تصویر بھی ابھرنے لگے کہ آج جس نہر کا پانی میں نے اپنے دشمنوں پر مباح کر دیا ہے۔ کل اسی نہر کے ایک مشک پانی کے لئے میرے عباسؑ کے شانے قلم ہوں گے اور وہ شہید کر دیا جائے گا۔

نفسیات کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خود حضرت عباسؑ بھی حضرت کے ہمراہ موجود تھے اور کمسنی کے عالم میں تھے جس کے بعد جذبات کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ زندگی کے ایک حد تک پہنچنے کے بعد قربانی کا تصور اتنا دلدوز اور الم انگیز نہیں ہوتا جتنا کمسنی کے ساتھ شہادت کا تصور "گریہ خیز" ہوتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کی یہ وہ سقائی تھی جس کا احسان حکومت شام تاحشر نہیں بھول سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ "احسان فراموش طبائع" احسان کا بدلہ نہ دے سکیں۔ ــــــــــــ نازک حالات اور سخت واقعات صفحۂ ذہن سے محو نہیں ہوا کرتے یہ حالات ہمیشہ ذہن کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں اور انسان کی ملامت کرتے رہتے ہیں کہ احسان کا بدلہ وہ نہیں ہے جو آج اپنے محسن کو دیا ہے۔

معراج سقایت

جناب قصیٰ سے چلنے والا سلسلۂ سقایت امیر المومنینؑ تک پہنچتے پہنچتے معراج کمال کو پہنچ گیا ــــــــــــ اور آپ کی سقائی کا انداز، وہ نہیں ہے جو گزشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے یا جس کا نشان آپکے اسلاف میں پایا جاتا ہے۔

آپ کی سقائی کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ نے یہ "فریضۂ انسانیت" بلا تفریق یگانہ و بیگانہ اور بلا امتیاز دوست و دشمن انجام دیا ہے۔ خالق کائنات کو آپ کی یہ ادا اس قدر محبوب تھی کہ اس نے آپ کے سلسلۂ سقایت کو دنیا کے ساتھ محدود نہیں بنایا بلکہ اپنے حبیب کی زبان فیض ترجمان سے اعلان کرا دیا کہ "یا علیؑ! میں مالک کوثر ہوں اور تم ساقیٔ کوثر ہو"۔

علیؑ کا کمال سقایت دیکھنا ہے تو حوض کوثر پہ دیکھنا۔ جہاں چاروں طرف "بادہ کشان محبت" کا جھرمٹ ہوگا اور بیچ میں بنت اسد کا لال۔ پینے والے پی رہے ہوں گے اور پلانے والا۔ اپنے کرم بے حساب کا مظاہرہ کر رہا ہوگا۔

علیؑ کی دنیا و آخرت کی سقائی میں ایک ذرا فرق ضرور ہے۔ کہ دنیا دار عمل ہے۔ اور آخرت دار جزاء۔

آپ دنیا میں سقائی کرتے ہیں تو اپنے حسن عمل کے اعتبار سے اور آخرت میں یہ فرض انجام دیں گے تو پینے والوں کی لیاقت جزا کے لحاظ سے۔ یہاں دوست و دشمن سب کو سیراب کر دیا گیا ہے لیکن وہاں ایسا نہ ہوگا۔

وہاں کے بارے میں صحیح بخاری کی حدیث یہ ہے کہ کچھ لوگ کوثر کے کنارے سے ہٹائے جائیں گے تو حضور سرور کائنات ارشاد فرمائیں گے۔

"پروردگار! یہ میرے اصحاب اور میرے ساتھی ہیں۔ انھیں کیوں ہٹایا جا رہا ہے ارشاد ہوگا۔" انھوں نے آپ کے بعد دین میں بڑی بدعتیں ایجاد کی ہیں اور اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

کتنا سچا ہے خدا کا رسولؐ ــــــــــــ کہ قدرت نے اس کے اس دعویٰ کی تردید نہیں کی کہ "یہ میرے ساتھی ہیں"، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ انھوں نے آپ کے بعد فتنہ پیدا کیا ہے اور دین میں رخنہ ڈالا ہے۔

حضرت عباسؑ

سقائی کا یہ سلسلہ درجۂ کمال تک پہنچنے کے بعد پدر بزرگوار کی وراثت میں حضرت عباسؑ علمدار کو ملا اور اس شان سے ملا کہ آج تک آپ کے نام کے ساتھ لفظ "سقاء" زندہ رہ گیا۔

عمدۃ الطالب، تاریخ الخمیس ۲ ص۳۱۷ نور الابصار شبلنجی ص۹۳ کبریت احمر ص۳۲۔

"حیرت" کی بات ہے کہ امیر المومنین کو "ساقی" کہا جاتا ہے۔ جو مبالغہ کا صیغہ نہیں ہے اور عباس کو "سقاء" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔

شاید یہ اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ عمل اپنی دشواریوں کے اعتبار سے اہمیت پیدا کر لیتا ہے۔ پرسکون ماحول کی نماز اور ہوتی ہے اور تیروں کی بوچھار کی نماز اور۔ زیر سایہ سجدہ اور ہوتا ہے اور زیر خنجر سجدہ اور۔

مولائے کائنات کی معراج سقایت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن القاب کی شہرت حالات کی تابع ہوا کرتی ہے۔

ائمۂ معصومین علیہم السلام اوصاف و کمالات میں یکسانیت کے باوجود ایک لقب سے مشہور نہ ہو سکے۔ کسی کا صبر مشہور ہوا تو کسی کی شجاعت۔ کسی کے علم کی شہرت ہوئی تو کسی کے تقوی و طہارت کی۔

سقایت کا بھی یہی انداز ہے ——— علیؑ ساقی دنیا بھی ہیں اور ساقی آخرت بھی ——— لیکن دونوں مقامات پر تاریخ و روایات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مولائے سقایت کی منزل میں وہ زحمتیں نہیں برداشت کیں جو "سقاء" حرم کو برداشت کرنا پڑیں۔

آپ بدر کی منزل میں کنویں سے پانی لے آئے لیکن کنواں کھودا نہیں ——— محاصرۂ عثمان کے موقع پر آپ نے پانی پہنچا دیا ہے، فراہم نہیں کیا ——— صفین کے میدان میں لشکر کو نہر پر قبضہ کے لئے بھیج دیا ہے آپ دریا پر نہیں گئے۔

لیکن عباسؑ کے لئے یہ سارے مصائب ایک منزل پر جمع ہو گئے تھے۔ آپ کو کربلا میں متعدد کنواں بھی کھودنے پڑے ——— دشمنوں کے حصار سے پانی کو بچا کر چلنا بھی پڑا اور نہر پر قبضہ کرنا بھی کوئی معمولی مرحلہ نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب غازی کے ہاتھ میں تلوار بھی نہ ہو۔

ایسے حالات میں تاریخ "سقاء" کے لقب سے یاد نہ کرتی تو ظلم عظیم ہوتا۔

اس سے بڑی ایک نزاکت یہ بھی ہے کہ مولائے کائنات نے جس سقایت کے لئے اقدام کیا تھا وہ آخری مرحلہ تک پہنچ بھی گئی تھی۔ بدر میں لشکر کو پانی مل گیا اور صفین میں مجاہدین سیراب ہو گئے۔

انقلابی جماعت کے محاصرہ کے باوجود دار الامارہ تک پانی پہنچ گیا۔ اور اولاد و اعزا کی موجودگی میں قاتل کو جام شیر دے دیا گیا۔

لیکن عباسؑ کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ کنویں کھودے مگر پانی برآمد نہ ہوا فرات پر گئے لیکن بھتیجی کی مشک خیمہ تک نہ لا سکے اور پانی ملا بھی تو بچوں کے کام نہ آسکا۔

دنیا کی ہر تاریخ میں جہاں واقع ہونے والے حادثات کی اہمیت ہوتی ہے وہاں حسرتوں کو بھی ایک بڑا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مورخ اس درد کے احساس سے قاصر ہوتے ہیں یہ کام ماہر نفسیات اور صاحب دل کے حوالے ہوتا ہے۔

شجاعت

حضرت عباسؑ کے امتیازی صفات میں ایک صفت شجاعت بھی ہے۔ منتقل عوالم ص۹۴ العبار العین ص۲۶ تاسخ التواریخ ج۶ ص۲۸۹ روضۃ الشہداء ماتین۔

شجاعتؑ کے بارے میں علماء اخلاق نے بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں اور اسے انسانی کردار کے تعمیری عناصر میں شمار کیا ہے۔ تعمیر کردار کے چار عناصر قرار دیئے گئے ہیں۔ حکمت عدالت، عفت اور شجاعت۔

شجاعت کی زیادہ اہمیت اس لئے ہے کہ اس کا مظاہرہ ہمیشہ سخت اوقات میں ہوا کرتا ہے اور ایسے حالات انسانی توجہات کو خود بخود جذب کر لیا کرتے ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شجاعت کا تعلق زور بدن اور قوت دست و بازو سے ہے۔ جس کا جتنا بدن قوی ——— جثہ مضبوط، ہیکل مستحکم اور ڈیل و ڈول غیر معمولی ہو گا وہ اتنا ہی بڑا بہادر کہلائے گا ——— انسان کو شیر سے تشبیہ دیتے وقت بھی درجہ تشبیہ اعلیٰ کو قرار دیا گیا ہے

لہ معراج السعادۃ ملا احمد نراقی ص۸۹ طبع تہران۔

حالانکہ یہ ایک اشتباہ ہے ——— شجاعت تعمیر کردار کے عناصر میں ہے۔ اور کردار نفسانی کیفیات سے مرتب ہوا کرتا ہے ——— کردار کی تعمیر میں نفس کے کیفیات اور دل و دماغ کے رجحانات کام کرتے ہیں۔ استقامت دست و بازو کی طاقت کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

شجاعت کے پہلو بہ پہلو ایک عنصر طاقت اور بھی ہے جس کا نام "جرأت" ہے۔ ——— شیر ببر میں جرأت ہوتی ہے۔ شجاعت نہیں۔ شجاعت کا وجود وہیں ہو سکتا ہے جہاں "ذی شعور" نفس اور "باہوش" دماغ ہو تاکہ بہادر یہ فیصلہ کر سکے کہ کہاں قوت کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے اور کہاں نہیں؟ اور پھر اسی کے مطابق عملدرآمد بھی کرے۔

تحلیل اور تجزیہ کے اعتبار سے شجاعت و صبر میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں نفس کی قوت کے آثار ہیں۔ دونوں میں قوت ارادی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اور دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواہشات پر قابو حاصل کیا جائے۔

قوتِ نفس کا مظاہرہ میدان میں ہوتا ہے تو اس کا نام "شجاعت" ہوتا ہے۔ اور اظہار قوت کے لئے میدان میسر نہیں ہوتا ہے تو اس کا نام صبر ہوتا ہے۔ صبر توامِ شجاعت ہے اور شجاعت لازمۂ صبر۔

یہ کہنا غلط ہے کہ فلاں شخص صبر کا حامل ہے اور فلاں شخص شجاعت کا ——— صبر شجاعت سے کسی منزل پر جدا نہیں ہو سکتا اور جس شخص میں قوتِ صبر نہ ہو گی وہ شجاعت کے میدان میں قدم نہیں جما سکتا۔

یہ اور بات ہے کہ منزل اظہار میں دونوں کے میدان الگ الگ ہوتے ہیں شجاعت کا میدان معرکۂ کارزار ہوتا ہے اور صبر کا میدان "جبر و اختیار"!

دین اسلام نے جن جن مقامات پر صبر کی تعریف کی ہے ان سے ضمناً شجاعت کی اہمیت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے ۔ حضور سرکار کائنات نے یہاں تک فرما دیا ہے کہ ۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الشَّجَاعَۃَ وَلَوْ عَلٰی قَتْلِ حَیَّۃٍ "

" پروردگار شجاعت کو دوست رکھتا ہے چاہے اس کا اظہار ایک سانپ کے قتل ہی کے ذریعہ ہو "

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے شجاعت کا "ادنیٰ ترین" معیار سانپ کا قتل کرنا ہے ۔ اب اگر کوئی شخص اتنا بھی نہ کر سکے اور سانپ کے خوف ہی سے رونا شروع کر دے تو اسے شجاعت کی کسی منزل پر شمار نہیں کیا جا سکتا ؟

مولائے کائنات امیر المومنینؑ نے اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے روز اول گہوارہ میں اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے کہ اہل دنیا کو معلوم ہو جائے کہ آنے والا بچہ کس قدر قوت قلب کا حامل ہے اور اس کے دست و بازو میں کس قدر زور بدن پایا جاتا ہے ۔

شجاعت کے نفسانی کمال ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مرسل اعظمؐ نے ایک طرف شجاعت کا معیار "قتل" قرار دیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے ۔

"عَدُوُّکَ نَفْسُکَ فَاقْتُلْھَا "

تمہارا حقیقی دشمن تمہارا نفس ہے اسے بھی قتل کر دو ۔

خواہشات نفس کو قتل کئے بغیر کسی شجاعت کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا ۔ اور یہ علامت ہے کہ شجاعت کوئی ظاہری وصف نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق نفس کے کمالات سے ہے جو جس قدر کمال نفس کا حامل ہوگا اتنا ہی بڑا شجاع اور بہادر کہا جائے گا ۔

یہی وجہ ہے کہ کبھی دشمن پر وار کرنا اور اسے تہہ تیغ کر دینا شجاعت ہے اور کبھی ضبط نفس کا مظاہرہ کر کے دشمن کو چھوڑ دینا ہی کمال شجاعت ہے ۔

* یہ تصور بالکل غلط ہے کہ مولائے کائنات کا عمرو بن عبدود کا سینے پر سوار ہو جانا

شجاعت ہے اور اس کی بے ادبی پر سینے سے اتر آنا شجاعت نہیں ہے ۔

درحقیقت یہ دو رخ تھے جنہیں مولائے کائنات ایک ہی میدان میں پیش کر رہے تھے ۔ دشمن کو زیر کر کے سینے پر سوار ہو جانا شجاعت کا ظاہری رخ ہے اور دشمن پر قابو پا کر بلندی نفس کا مظاہرہ کرنے کے لئے اسے چھوڑ دینا شجاعت کا باطنی رخ ہے ۔

شجاعت کی نزاکتوں سے بے خبری کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے میدان جنگ میں مولائے کائنات کے مجاہدات کا تذکرہ سن کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس طرح علیؑ کا مرتبہ نبیؐ سے بھی بڑھ جائے گا ۔

ایسا تذکرہ کرنے والے عظمت نبوت سے باخبر نہیں تھے اس لئے علیؑ کے مرتبہ کو نبیؐ سے آگے بڑھا رہے تھے ۔

حالانکہ یہ بات ایک توہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے ——— حیدر کرار کی شجاعت کا تذکرہ کرنے والے شجاعت کی حقیقت سے باخبر ہیں ۔ اور اس کے حدود پر نظر رکھے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے کبھی رسول اکرمؐ کے لئے میدان سے فرار کا دعویٰ نہیں کیا ——— وہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ میدان جہاد میں جہاں علیؑ تھے وہیں نبی تھے ——— فرق صرف یہ تھا کہ علیؑ کے ہاتھ میں ذوالفقار تھی اور نبی خالی ہاتھ تھے ۔

ظاہر ہے کہ مجاہدات دونوں قابل قدر ہیں ——— ثبات نفس و قدم دونوں لائق تعریف ہیں ——— لیکن اتنا کہنے کا امکان بہرحال ہے کہ علیؑ کے ثبات میں تلوار نے اپنا حصہ لے لیا تھا اور نبی کے ثبات قدم میں کوئی حصہ دار نہیں بن سکا تھا ۔

اب اس کے بعد بھی علیؑ کے بڑھا دینے کا الزام آتا ہے تو آیئے دیکھئے ——— نبی و وصیؑ کا فرق باطنی مراتب کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے ۔ اظہار کی منزل میں وصیؑ نبیؐ

سے آگے بڑھ ہی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اسلامی روایات میں اس کے مختلف ثبوت موجود ہیں ــــــــ خانۂ کعبہ میں بت شکنی کے موقع پر نبوت زیر قدم تھی اور امامت دوشِ نبوت پر عروج پا رہی تھی۔

جنت میں داخلہ کا منظر ــــــــ سرورِ کائنات نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ علیؑ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور جب راوی نے سوال کیا کہ کیا آپ سے بھی پہلے؟

"فرمایا بے شک! علمدار ہمیشہ آگے رہتا ہے اور سردار ہمیشہ پیچھے رہتا ہے۔"

علیؑ و نبیؐ کی شجاعت کا راز اسی ایک فقرہ میں مضمر ہے۔ شجاعت نبیؐ میں بھی تھی اور علیؑ میں بھی۔

فرق صرف یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں علمدار آگے آگے رہتا تھا اور سردار پیچھے پیچھے اس فرق کو کسی قیمت پر بھی نہیں مٹایا جا سکتا چاہے دنیا میں ایک نہیں ایک لاکھ الزامات عائد کر دیئے جائیں۔

شجاعت اپنے اسی عظیم اور وسیع مفہوم کے ساتھ حضرت عباسؑ کو وراثت میں ملی تھی۔

آپ کی اس وراثت کا تعلق بھی عہدِ قدیم سے تھا اور اس میں آباؤ اجداد کا ایک نمایاں حصہ تھا۔

ننہال کے اعتبار سے اتنا کافی ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ سے عقد ہی اسی بنیاد پر ہوا تھا کہ بہادر خاندان میں عقد ہوگا اور حضرت عقیلؑ نے وقت عقد اعلان ہی یہ کیا تھا کہ ام البنین کے آباؤ اجداد سے زیادہ شجاع عرب میں کوئی نہیں ہے۔

نیزوں سے کھیلنے والے اسی خاندان میں پیدا ہوئے ہیں ــــــــ تلواروں پر تکیہ کرنے والے اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ اس شجاعت میں جرأت و ہمت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اور ضبطِ نفس، ثباتِ عزم، قوتِ ارادی جیسے عناصر اتنے روشن انداز سے نظر نہیں آتے ہیں۔"

اس جرأت و ہمت پر صیقل اس وقت ہوئی جب یہ خاندان خاندانِ ابوطالب سے وابستہ ہو گیا اور حضرت ام البنین مولائے کائنات کے عقد میں آگئیں۔

علیؑ کی شجاعت تنہا ہی کیا کم تھی کہ اس پر خاندانِ ام البنین کی شجاعت کا "اضافہ" بھی ہو گیا ــــــــ اب جو فرزند دونوں خانوادوں کی وراثت لے کر دنیا میں آئے گا۔ اس کی شجاعت و ہمت کا کیا عالم ہوگا ــــــــ ذہن انسانی اس منزل کے تصور سے قاصر ہے۔

نفسیات کے اس تجزیہ سے بہت سے وہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جنہیں دنیائے اعتراض "عقدۂ لاینحل" سمجھتی ہے اور عالم عقیدت بھی اپنے کو جواب کی منزل میں عاجز تصور کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت عباسؑ انجام کربلا سے باخبر تھے اور وہ ایک امام کی فوج کے سپاہی تھے تو تاریخ میں ایسے مقامات کیوں ملتے ہیں جہاں عباسؑ کو جلال آگیا اور امام حسینؑ کو روکنا پڑا۔

دربارِ ولید ــــــــ ساحلِ فرات ــــــــ شب عاشور جیسے متعدد مقامات ہیں جہاں "تاریخی بیان کے اعتبار سے" عباسؑ کو غیظ آگیا اور امام مظلوم کو مختلف وسائل سے عباسؑ کو خاموش کرنا پڑا، جس کا مطلب دونوں کے نظریات و رجحانات میں فرق کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عباسؑ کی زندگی ایک عجیب و غریب کشمکش سے گزر رہی تھی۔ آپ کو ایک طرف اپنے جذبات و احساسات کا پاس و لحاظ تھا اور دوسری طرف

حکم امام کا احترام۔ جذبات گھٹتے تھے تو چہرہ کا رنگ بدل جاتا تھا اور امام روک دیتے تھے تو فوراً رک بھی جاتے تھے۔

عباسؑ کی ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ دشمن کو قدم قدم پر متوجہ کرتے رہیں کہ میرے مولا کا سکوت مشیت الٰہی اور مصلحت اسلام کی خاطر ہے۔ ہم لوگ مجبور و بے بس ہو کر تمہارے محاصرہ میں نہیں آگئے ہیں۔

یہی تصور جب شدت کے ساتھ ابھرتا تھا تو غازی کو جلال آجاتا تھا اور اسی عالم جلال میں ارشاد فرما دیتے تھے تو عباسؑ خاموش ہو جاتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس طرح عباسؑ اپنی دہری وراثت کا اعلان کر رہے تھے اور دنیا کو بتا رہے تھے کہ مجھے ماں کی طرف سے جرأت و ہیبت ملی ہے اور باپ کی طرف سے صبر و شجاعت۔

جب جرأت و ہمت کی منزل آتی ہے تو تیور بگڑ جاتے ہیں اور جب باپ کا "حقیقی وارث" اشارہ کر دیتا ہے تو بابا کی شجاعت کے اظہار میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

تاریخ میں حضرت عباسؑ کی شجاعت کے مختلف مواقع ہیں ـــــــ جنہیں سوانح حیات کے ذیل میں نقل کیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک تاریخی فقرہ نقل کرنا ہے اور چند معصومین کے ارشادات۔

مؤرخ واقعۂ کربلا کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کربلا میں شہید ہونے والوں کی تعداد تو ۷۲ بہتر یا اس سے زیادہ ہے لیکن "جنگی نقطۂ نظر سے شہیدوں کی تعداد کے بجائے ان "مجاہدین" پر غور کرنا پڑے گا جو کربلا میں ایک عظیم مقصد کے لئے جان قربان کر رہے تھے۔

اور اس طرح واقعۂ کربلا کو کسی قیمت پر جنگ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ یہ کہنا ممکن ہے کہ امام حسینؑ کسی جنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ جنگ کے قانون سے کربلا میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے سپاہی یا فوجی کہا جا سکے۔

کچھ افراد تھے جن کی عمریں پچاس یا ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھیں ـــــــ کچھ کمسن اور نوجوان بچے تھے ـــــــ اور ایک تو چھ مہینے کا شیر خوار بچہ تھا۔ ایسے حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سپاہ حسینی میں حضرت عباسؑ کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جسے سپاہی کا درجہ دیا جا سکے کہ یہ لشکر حسینی کا ایک فوجی ہے۔

حسینؑ کے پاس صرف عباسؑ تھے۔ "وہی سپاہی تھے اور وہی سپاہ۔" ـــــــ اس کے علاوہ تمام مجاہدین دنیا کے "جنگی قوانین کے اعتبار سے" فوجی اور لشکری کے حدود سے خارج تھے۔"

مؤرخ کے اس تجزیہ پر ایک فقرہ کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ کہ یہ امام حسینؑ کی دور رس نگاہ تھی۔ کہ آپ نے عباسؑ کو سقائی کی ذمہ داری دے کر جنگ کرنے سے روک دیا تھا اور تلوار کے بجائے مشکیزہ دے کر میدان جنگ میں بھیج دیا تھا تاکہ جہادِ کربلا پر کسی رخ سے جنگ ہونے کا الزام نہ آنے پائے۔

کربلا کے میدان میں شجاعت عباسؑ کا یہ ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی ہے کہ عباسؑ نے حکم امام کے بعد تلوار کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہایت درجہ بیکسی سے شہید ہونا قبول کر لیا تاکہ میرے مولا کے دامنِ کردار پر کوئی دھبہ نہ لگنے پائے۔

ورنہ عباسؑ اس صبر و ضبط کا مظاہرہ نہ کرتے اور صرف جرأت و ہمت اور طاقت و قوت ہی سے کام لیتے تو آج کربلا کی جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔

"امام زین العابدینؑ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔"

فَنِعْمَ الصَّابِرُ الْمُجَاهِدُ الْمُحَامِي النَّاصِرُ وَالْاَخُ الدَّافِعُ عَنْ اَخِيْهِ الْمُجِيْبُ طَاعَةَ رَبِّهٖ۔"

(کیا کہنا عباسؑ کا ـــــــ وہ بہترین صابر و مجاہد اور حامی و مددگار تھے)

وہ بہترین بھائی جو اپنے بھائی سے دفاع کر سکے اور اطاعت رب کی آواز پہ لبیک کہہ سکے۔

جہاد کے ساتھ صبر اور دفاع کے ساتھ اطاعت رب کا تذکرہ عباسؑ کی شان شجاعت کا اعلان اور میرے دعویٰ کا مکمل ثبوت ہے۔

علمداری

حضرت عباسؑ کو بزرگان خاندان سے وراثتاً ملنے والے اوصاف و کمالات میں ایک علمداری بھی ہے۔

علم، نشان، پرچم، لواء، رایت، بند، عقاب تقریباً ہم معنی لفظیں ہیں جو مختلف زبانوں میں مختلف حالات کے اعتبار سے استعمال ہوتی ہیں۔ علمداری کی عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہے جب قوموں کی تاریخ میں خود علم اور پرچم کی عظمت کا اندازہ کر لیا جائے گا؟

تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم نے اپنے پرچم کی اپنی عزت و عظمت کا نشان سمجھا ہے اور اسے اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی پورے ملکی یا قومی وقار کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

پرچم کا رواج کل کی دنیا میں بھی تھا اور آج بھی ہے ——— وہ جاہلیت میں بھی رائج تھا اور اسلام میں بھی ——— اس کا سلسلہ مشرق میں بھی ہے اور مغرب میں بھی ہے۔

یعنی یہ کہنا صحیح ہے کہ ملک کے پرچم محدود ہو سکتے ہیں لیکن پرچم کا پرچم ہر ملک و قوم کے سر پر لہرا رہا ہے ——— اور اس کی سربلندی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

یہی وہ باعزت عنصر ہے جس کی خاطر قوموں کی جانیں قربان کی گئی ہیں ——— اور سر و تن کی بازی لگائی گئی ہے۔

تاریخ باضابطہ طور پر نشاندہی سے قاصر ہے کہ دنیا کی تاریخ میں پرچم کا رواج کب سے ہوا اور اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ ——— اس کی عظمت و اہمیت کا حقیقی راز کیا ہے۔

لیکن اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دورِ قدیم میں قوموں کی انفرادیت اور ملکوں کی تشکیل کا واحد ذریعہ لشکر کشی اور جنگ و جدل کا سلسلہ تھا اور میدان جنگ میں جانے والے سپاہی غیر منظم و غیر مرتب ہونے کی بناء پر نہ کوئی باہمی نشان رکھتے تھے اور نہ فوجوں کو باخبر کرنے کا کوئی ذریعہ رکھتے تھے۔

فوج بہر حال ایک ترتیب و تنظیم چاہتی ہے اس لئے یہ سوچا گیا کہ اگر ہر قوم اور ہر لشکر اپنا ایک امتیازی نشان مقرر کر لے تو فوجوں کو یکجا کرنے میں آسانی ہوگی ——— اور سپاہیوں کو دوست و دشمن کے امتیاز میں بھی سہولت ہوگی جو جس پرچم کے نیچے آ جائے گا اسی جماعت میں شمار کیا جائے گا۔

رفتہ رفتہ یہ پرچم میدان جنگ سے ہٹ کر ایک استقلال پیدا کرنے لگا اور قوموں نے اسے مستقل شناخت کا ذریعہ بنا لیا۔ اب ہر قوم کا ایک پرچم ہوتا ہے ——— اور ہر ملک کا ایک امتیازی نشان معین ہے۔

امتیازات قائم کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے ——— اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں اور اور ہر قوم کے ذوق کے اعتبار سے اس کا تعین ہوتا ہے۔ کوئی قوم مزاجی اعتبار سے جنگجو ہوتی ہے اس کا منشایہ ہوتا ہے کہ نشان پر جنگی علامتیں بنائی جائیں ——— کسی قوم کو رقص و رنگ سے دلچسپی ہوتی ہے وہ نشان پر ویسے ہی نقش و نگار پسند کرتی ہے۔ کسی قوم کے پیش نظر اسلاف کے کارنامے ہوتے ہیں وہ اپنے پرچم پر ان کارناموں کی

یادگار قائم کرنا چاہتی ہے ——— اور کوئی پرچم کو مذہبی نشان سمجھ کر اس پر مذہبی کلمات تحریر کرتا ہے۔

جس قدر مقاصد و مزاج کا اختلاف ہوتا ہے۔ اسی قدر پرچم کے نقش و نگار میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک مرحلہ رنگ کا بھی آتا ہے اس میں بھی قوموں کے مزاج کو شدید دخل ہوتا ہے ——— کوئی شرافت کا اعلان کرنا چاہتا ہے تو سفید رنگ اختیار کرتا ہے کوئی خونی انقلاب لانا چاہتا ہے تو سرخ رنگ منتخب کرتا ہے۔ کسی کے پیش نظر صلح و امن کا پیغام ہوتا ہے تو سبز رنگ پسند کرتا ہے۔

رنگوں کو مختلف مقاصد کی نشانی قرار دیا گیا ہے اور ہر قوم نے اپنے مقصد کی روشنی میں اپنے پرچم کے لئے ایک رنگ کا انتخاب کیا ہے۔ بسا اوقات تو یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی قوم کے دو مختلف رنگ کے پرچم رہے ہیں اور دونوں کو الگ الگ مواقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ سفید رنگ شرافت کی نشانی بن چکا ہے تو سبز رنگ میدان جنگ میں صلح و آشتی کا پیغام بن گیا ہے۔

[illegible] پرچم اور ان کے نقش و رنگ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس موقع پر ان باتوں کے تذکرہ کا کوئی محل نہیں ہے۔

پرچم کی ضرورت کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ اس سے پرچم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور پرچم بلند کرنے والے کی مزاج اور اس کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے ——— اس کے علاوہ مزید تذکرہ تاریخ کا موضوع بن سکتا ہے۔ سیرت نگار کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عربی زبان میں پرچم کے لئے دو لفظیں استعمال ہوتی ہیں۔ لواء۔ رایت۔

علمائے اسلام نے اس موضوع پر بھی بحث کی ہے کہ ان دونوں میں کون بڑا ہوتا ہے اور کون چھوٹا۔

بعض حضرات نے رایت کو بڑے پرچم کا نام دیا ہے اس لئے کہ حدیث خیبر میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اور وہاں مختلف علموں کا کوئی ذکر نہ تھا ——— بعض حضرات کا خیال ہے کہ لواء بڑے پرچم کا نام ہے کہ محشر کے علم کا نام "لواء الحمد" ہے جس کے زیر سایہ ایک پوری کائناتِ محبت سمٹ کر آجائے گی۔

اس مقام پر یہ بحث چنداں دلچسپ نہیں ہے۔ آئندہ کسی موقع پر ان دونوں اقوال کے درمیان محاکمہ کیا جا سکتا ہے۔

اہمیت پرچم

اقوام عالم کی تاریخ میں پرچم کی اہمیت کا ایک مختصر خاکہ یہ ہے کہ پرچم میدانِ کارزار میں فتح کی نشانی سمجھا گیا ہے۔ جنگ کے دوران دونوں فوجیں اپنا اپنا علم بلند رکھتی ہیں۔ اور لڑائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جیسے ہی لڑائی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوتا ہے اور کوئی ایک فریق شکست خوردہ ہو جاتا ہے فوراً اس کا پرچم سرنگوں کر دیا جاتا ہے اور یہ علامت ہوتی ہے کہ حزبِ اختلاف نے فتح حاصل کر لی۔

دوسری بات یہ بھی ہوتی ہے کہ پرچم علاقائی حکومت کی ایک علامت ہوتا ہے۔ سمندروں میں چلنے والے جہاز اپنے "مالک" کے ملک کا پرچم بلند کر کے دریاؤں کی سیر کرتے ہیں اور اپنے پرچم سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ علاقہ کسی حکومت کے زیر اثر یا کسی سلطان وقت کی ملکیت نہیں ہے۔ صرف ایک پرچم جہاز کی ملکیت کی نشاندہی کے لئے لہراتا رہتا ہے۔

اس کے بعد جب جہاز کسی ملک کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو فوراً اس ملک کا پرچم بھی لہرا دیا جاتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ علاقہ "بین الاقوامی" نہیں ہے بلکہ ایک خاص ملک کی ملکیت ہے اور کسی خاص بادشاہ کے زیر اثر ہے۔

اس کے علاوہ پرچم ایک قسم کی وراثت کا بھی اعلان ہے۔ جب تک کسی قوم کے سر پر اس کا والی و وارث زندہ رہتا ہے اس کا پرچم سربلند رہتا ہے اور جب ملک و قوم پر کوئی زوال آتا ہے تو سوگ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کا پرچم سرنگوں کر دیا جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر اہل دنیا نے مختلف امتیازات رکھے ہیں۔

غیر ملکوں کی ہمدردی میں پرچم کا جھکا دینا اور ہوتا ہے اور اپنے غم میں پرچم کا سرنگوں کر دینا اور ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں علامت ہیں کہ قومی دنیا میں پرچم کی بڑی اہمیت ہے اور اس کے وجود و عدم سے قوموں کی زندگی بے حد متاثر ہوتی ہے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر علاقہ میں عباسؑ کے علم کی سربلندی اس بات کا واضح اعلان ہے کہ کربلا میں فتح عباسؑ ہی کی ہوئی ہے ——— اور عباس اس فاتح کا نام ہے جس کی فتح کا کوئی علاقہ معین نہیں ہے دنیا کا ہر ملک اور ہر خطہ اس کے مفتوحہ علاقہ میں شامل ہے۔

اس مجاہد نے صرف کربلا و دمشق ہی کا علاقہ نہیں فتح کیا ہے ——— بلکہ "تنظیم لشکر" کے سہارے عالم انسانیت کے دل جیت لئے ہیں۔ اور جب تک کائنات میں انسانوں کا وجود رہے گا اور انسانوں کے دلوں میں مظلوم کی ہمدردی رہے گی عباسؑ کا پرچم لہراتا رہے گا۔

قومی نظریات سے قطع نظر خود مذہبی تاریخ میں بھی پرچم کی بے حد اہمیت ہے

مولائے کائنات جنگ صفین کے موقع پر فوجوں کو آمادہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔

وَلَا تُمِيْلُوا بِرَايَاتِكُمْ وَلَا تُزِيْلُوْا وَلَا تَجْعَلُوْهَا إِلَّا مَعَ شُجْعَانِكُمْ فَإِنَّ الْمَانِعَ لِلذِّمَارِ وَالصَّابِرَ عِنْدَ نُزُوْلِ الْحَقَائِقِ أَهْلُ الْحِفَاظِ وَاعْلَمُوْا أَنَّ أَهْلَ الْحِفَاظِ هُمُ الَّذِيْنَ يَحُفُّوْنَ بِرَايَاتِهِمْ وَيَكْتَنِفُوْنَهَا وَيَصِيْرُوْنَ خَلْفَهَا وَأَمَامَهَا وَوَرَائَهَا وَلَا يُضَيِّعُوْنَهَا وَلَا يَتَأَخَّرُوْنَ عَنْهَا فَيُسْلِمُوْنَهَا وَلَا يَتَقَدَّمُوْنَ عَلَيْهَا فَيُفْرِدُوْنَهَا ——— نہج البلاغہ

ترجمہ :۔ ”خبردار پرچم اپنے مرکز سے نہ ہٹنے پائے۔ اسے صرف بہادروں کے پاس رہنا چاہیئے۔ جو شخص مصائب کو برداشت کر سکے اور شدائد کا مقابلہ کر سکے وہی محافظ کہا جا سکتا ہے۔ اور جو محافظت کا اہل ہوتا ہے وہی پرچم کے گرد و پیش رہتا ہے اور چار طرف سے اس کی حفاظت کرتا ہے محافظ افراد اپنے پرچم کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ نہ پیچھے رہ جاتے ہیں کہ پرچم دوسروں کے حوالے کر دیں اور نہ آگے بڑھ جاتے ہیں کہ پرچم کو چھوڑ دیں۔“

ان فقرات سے ایک طرف پرچم کی عظمت و برتری کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص کو علمدار نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لئے شجاع، بہادر، محافظ، غیرت دار، ثابت قدم، مستقل مزاج اور صابر انسان کا ہونا بہت ضروری ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کربلا کے میدان میں بے مثل مجاہدین کے ہوتے ہوئے بھی امام حسینؑ کی نظر انتخاب حضرت عباسؑ پر پڑی اور آپ نے انھیں فوج کا علمدار بنایا۔

حضور سرور کائنات نے بھی پرچم کی عظمت کا شدت سے تحفظ فرمایا ہے۔ اور یہ اہتمام کیا ہے کہ پرچم اسلام ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اس بات کے مختلف تاریخی شواہد موجود ہیں جن میں سے صرف چند شواہد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

احد کی جنگ شباب پر تھی۔ مولائے کائنات تن و تنہا اسلام اور رسول اسلام کا دفاع کر رہے تھے۔ اثنائے جنگ میں آپ کے داہنے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی اور پرچم اسلام سرنگوں ہونے لگا۔

مسلمانوں نے چاہا کہ بڑھ کر علم سنبھال لیں۔ آپ نے فرمایا۔ خبردار! اسے علیؑ کے بائیں ہاتھ میں دے دو۔ وہی دنیا و آخرت میں میرا علمبردار ہے۔ ان کے علاوہ کسی کو یہ علم اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ مناقب ابن شہرآشوب ج ۳ ص ۱۵۹ ناسخ التواریخ ج ۲ طبع بمبئی۔

خیبر کا معرکہ ہے۔ مسلمان ہزیمت اٹھا رہے ہیں۔ پہلے دن حضرت عمر تشریف لے گئے اور واپس آئے۔ دوسرے دن حضرت ابوبکر کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ تیسرے دن حضرت عمر نے پھر ہمت کی لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔ آخرکار حضرت سرکار کائنات نے اعلان فرمایا۔ ”کل اس کو علم دوں گا جو کرار غیر فرار ہوگا اور صبح کو علم لشکر علیؑ کے حوالے کر دیا۔ علیؑ رایت لے کر گئے تو میدان کو فتح کئے بغیر واپس نہ آئے۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۲۳)

دنیائے اسلام خیبر کی اس تفصیل پر نظر کرے تو اندازہ ہوگا کہ جس طرح ۲۴ رجب کی تاریخ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی فتح کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے اسی طرح ۲۲، ۲۳ رجب بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

مستدرک حاکم وغیرہ میں خیبر کی پوری روایت دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات نے اپنے علمبردار کے لئے پانچ شرائط کا اعلان کیا تھا۔

۱۔ رَجُلاً ـــــ مردِ میدان ۔
۲۔ کَرَّارًا ـــــ بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا ۔
۳۔ غَیْرَ فَرَّارٍ ـــــ میدان سے قدم پیچھے نہ ہٹانے والا ۔
۴۔ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ـــــ خدا و رسول کا دوست ۔
۵۔ یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ـــــ خدا و رسول کا محبوب ۔

(طبری ۳ ص۹۳ ؛ مستدرک ۳ ص۳۴)

اور حضرت علیؑ ابن ابی طالب انھیں پانچوں صفات کے حامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ یہ علمبردار کے پانچ صفات نہیں تھے ۔

عالم معنی میں علم اسلام کا پنجہ تھا جو فتح اسلام کی علامت بنا ہوا تھا اب جس علم میں یہ "معنوی" پنجہ ہوگا وہ فتح کی نشانی بنے گا۔ اور جس پرچم میں یہ پنجہ نہ ہوگا وہ جھنڈا ہوگا۔ فتح مبین کی علامت نہ ہوگا۔

اسلامی لشکر جنگ موتہ کے لئے جا رہا ہے۔ حضور سرور کائنات لشکر کی ترتیب کے ساتھ یہ قانون مقرر فرما رہے ہیں کہ سب سے پہلے علم لشکر جعفر طیار کے ہاتھ میں ہوگا اس کے بعد وہ شہید ہو جائیں تو زید بن حارثہ علمبردار ہوں گے۔ ان کے بعد نشان فوج عبداللہ بن رواحہ کے ہاتھوں میں رہے گا۔

لشکر کی تنظیم کے ساتھ علمداری کی ترتیب اس بات کا ثبوت ہے کہ مرسلِ اعظم کی نگاہ میں ہر مسلمان مجاہد بھی اس منصب کا اہل نہیں ہے ۔

تاریخ یہاں تک بیان کرتی ہے کہ جس وقت یہ مجاہدین میدان جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ حضور سرور کائنات مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے اپنے علم غیب کی بنا پر جنگ کے معاملات بیان فرما رہے تھے۔ عالم یہ تھا کہ آپ کی چشم مبارک سے آنسو جاری تھے اور آپ اس حد تک گریہ فرما رہے تھے کہ ہچکی بندھ گئی تھی ۔

آپ مسلمانوں کو برابر آگاہ کر رہے تھے کہ اب جعفر کی شہادت واقع ہوئی۔ اب زید بن حارثہ کام آئے ـــــــــــ اب عبداللہ بن رواحہ نے جام شہادت پیا۔

یہ اہتمام بھی مسلمانوں کو آگاہ کر رہا تھا کہ علمداری کا مسئلہ اتنا نازک ہے کہ میں اب بھی تم کو باخبر کر رہا ہوں کہ میرے علمداروں نے میری ہدایت پر مکمل طور پر عمل کیا ہے اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔

تاریخ کا بیان ہے کہ اسی اثنا میں جناب جعفرؓ کے دونوں ہاتھ قلم ہو گئے ـــــ اور قدرت نے اسلام کے علمدار کو یہ مخصوص انعام دیا کہ جنت میں دو پر پرواز عطا کر دیئے اب جہاں بھی چاہیں پوری فضائے جنت کی سیر کر سکتے ہیں ملائکہ ان کے ہمراہ ہوں گے اور رحمتِ الٰہی سر پر سایہ فگن ۔

درحقیقت یہ انعام علمدار کی عظمت اور علمدار کے مرتبہ کا ایک اعلان ہے جس سے یہ محسوس کرایا جا رہا ہے کہ ہر قانون اپنے پرچم اور اس کے حامل کا احترام کرتا ہے تو اسلام نے بھی اپنے علمداروں کو نظر انداز نہیں کیا۔

جعفر طیار کو جنت میں پر پرواز عطا کرنے کے بعد قدرت نے زید بن حارثہ کی امتیازی جزا کا اہتمام کیا اور اسلام کے "آخری لشکر" میں ان کے فرزند اسامہ بن زید کو باپ کی وراثت میں لشکر کی سرداری عطا کر دی ۔

مسلمانوں نے اس علمداری اور سرداری پر اعتراض بھی کیا۔ لیکن مشیتِ الٰہی نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور مرسلِ اعظمؐ نے صاف اعلان کر دیا کہ یہ اعتراض تم ان کے باپ کے بارے میں بھی کر چکے ہو ـــــــــ تمہارے اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں ہے ـــــــــ

مسلمانوں کا اعتراض اور مرسلِ اعظم کا جواب دونوں گواہ ہیں کہ علمداری ایک ذی مرتبت عہدہ ہے جسے نہ رسولؐ ہر کس و ناکس کو دینا چاہتے ہیں اور نہ مسلمان ہی اس

کے بارے میں یہ برداشت کرسکتے ہیں کہ جسے "بزعم خود" نااہل سمجھ رہے ہیں اسے یہ عہدہ دے دیا جائے۔

اس کے علاوہ تاریخ میں اور بھی موارد و مواقع ملیں گے جہاں علم اور علمدار کی عظمت کا اعلان ہوا ہے اور تاریخ اسلام نے اعتراف کیا ہے کہ مرسلؐ اعظم نے اپنا علم کسی نااہل کے ہاتھ میں نہیں جانے دیا۔

علیؑ نہ رہے تو جس مرد میدان کو مناسب سمجھا۔ حامل علم بنا دیا اور علیؑ موجود رہے تو کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیا۔

تاریخ علم

تاریخی روایات میں حضرت آدمؑ کے زمانے ہی سے پرچم و علم کا ذکر ملتا ہے اور ملائکہ سماوات کے ہاتھوں میں پرچم کا وجود نظر آتا ہے۔

لیکن مذہب کی تاریخ میں سب سے پہلے پرچم کا تذکرہ جناب ابراہیمؑ کے حالات میں ملتا ہے جہاں آپ نے پرچم بلند کرکے روم سے مقابلہ کیا تھا اور جناب لوطؑ کو انکی قید سے چھڑا کر لائے تھے۔

اس کے بعد روایات میں کوئی صراحت نہیں ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب الٰہی کا یہ پرچم اولاد ابراہیمؑ ہی میں رہا اور وہی وقت ضرورت اسے بلند کرتے رہے۔ چنانچہ ارباب سیر کا بیان ہے کہ قریش کا پرچم قصیٰ بن کلاب کے پاس تھا۔ ان سے جناب عبدالمطلب کی طرف منتقل ہوا۔ اس کے بعد حضور سرور کائناتؐ کی بعثت ہوئی تو آپ نے مستقل طور پر یہ پرچم بنی ہاشم کے حوالے کر دیا اور پہلی ہی جنگ میں حضرت علیؑ

کو علمبردار بنا دیا۔

اس کے علاوہ ایک لوا جنگ بنی عبدالدار میں مصعب بن عمیر کے پاس تھا اس لئے کہ یہ قبیلہ تازہ تازہ اسلام لایا تھا۔ اور مشرکین نے اپنا علم اسی قبیلہ کے ایک آدمی کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔

جناب مصعب بن عمیر نے پوری ہمت و جوانمردی کے ساتھ علم کا تحفظ کیا یہاں تک کہ جب دونوں ہاتھ قلم ہو گئے تو سینے سے علم کو لگا لیا اور جنگ کرتے رہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب ان کی پشت پر نیزہ لگا اور خاک پر گر پڑے۔ رسول اکرمؐ نے فوراً وہ علم بھی حضرت علیؑ کے حوالے کر دیا اور آپ رایت و لوا دونوں کے مالک ہو گئے۔

ارشاد مفید ا ۲۲ مناقب ابن شہر آشوب ۳ ۱۵۹، طبری ۳ ۱۷، ابن اثیر ۲ ۷۵ وغیرہ۔

تاریخ کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسلام کے تین عظیم علمدار تھے اور تینوں کے ہاتھ قلم ہو گئے۔

جنگ احد میں جناب مصعب کے شانے قلم ہو گئے، جنگ موتہ میں جناب جعفر کے ہاتھ کام آئے اور کربلا میں حضرت عباسؑ نے اپنے شانے قربان کر دیئے اور یہ در حقیقت میرے دعویٰ کی ایک دلیل ہے کہ اقوام عالم میں علم کی بے حد اہمیت ہے اور میدان جنگ میں ہر فریق کا خیال ہوتا ہے کہ اگر علم کو سرنگوں کر لیا تو فتح دور نہیں ہے اور اگر علم دار قتل ہو گیا تو لشکر کی ہمت شکنی میں کوئی کسر نہیں ہے۔

امیرالمومنینؑ کی شان علمداری کے سلسلے میں "ایک روایت" یہ بھی ملتی ہے کہ رسولؐ اکرم کا رایت جنگ مستقل طور پر سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا اور جنگ کا موقع آتا تو آپ سعد سے لے کر حضرت علیؑ کو دیدیا کرتے تھے۔

جس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ حیات مرسل اعظمؐ میں اسلام کی علمداری کا شرف صرف حضرت علیؑ کے لئے تھا اور اگر کبھی تالیف قلب یا "کسی مصلحت" کی بناء پر

کسی دوسرے صحابی کو علم دیا بھی تو فوراً واپس لے لیا گیا۔ یہ صرف حضرت علیؑ کی ہستی تھی جس سے علم اسلام واپس نہیں لیا گیا اور روایات نے مختلف شکلوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

ابن عبد البر اور علامہ ترمذی کا اعتراف ہے:-

"هُوَ الَّذِي كَانَ لِوَائُهُ مَعَهُ فِي كُلِّ زَحْفٍ"

علیؑ ہی وہ مجاہد ہے جس کے پاس ہر جنگ میں علم اسلام رہا کرتا تھا

استیعاب۔ ترمذی۔

صاحب ارجح المطالب کے الفاظ یہ ہیں:-

"كَانَ آخِذَ رَايَةِ رَسُولِ اللّٰهِ يَوْمَ بَدْرٍ وَالْمَشَاهِدِ كُلِّهَا"

جنگ بدر اور تمام معرکوں میں رسول اکرمؐ کا رایت حضرت علیؑ ہی کے ہاتھ میں تھا

جنگ احد کے بارے میں ابھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہاں بھی رایت و لواء دونوں حضرت علیؑ کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ خیبر میں علیؑ کے ہاتھوں میں رایت اسلام اظہر من الشمس تھا۔

خصوصیات علم اسلام

علم اسلام کے بارے میں اس خصوصیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہ علم دوسری قوموں کے پرچموں کی طرح دست بدست نہیں چلا ہے بلکہ اس کے اٹھانے والوں میں ایک مخصوص امتیاز دیکھا گیا ہے اور اسے مکمل طور پر عزت اسلام کا نمائندہ سمجھا گیا ہے۔

جنگ خیبر کے بارے میں مورخین کا بیان ہے کہ جس وقت مرسل اعظمؐ نے رایت خیبر کا اعلان کیا اور حضرت علیؑ کے حوالے یہ پرچم اسلام کیا تو آپ نے ایک فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔

"يَأْخُذُهَا بِحَقِّهَا"

آج وہ مجاہد مرد میدان بنے گا جو علم کو اس کے حق کے ساتھ اٹھائے گا۔

اسلام میں علم کا بھی ایک حق ہے اور علمدار کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم کو اٹھائے تو اس کا حق بھی ادا کرے۔ اسی بات کی طرف جنگ موتہ اور جنگ احد میں اشارہ کیا گیا تھا جس کے بعد قدرت نے صلہ کے طور پر حضرت جعفر طیار کو پرواز عطا فرمائے تھے۔

جنگ جمل کے موقع پر مولائے کائنات نے اپنے عزیز فرزند محمد بن الحنفیہ کو علم لشکر دے کر میدان میں بھیجا تو یہ فرمایا:-

"هٰذِهِ رَايَةُ رَسُولِ اللّٰهِ تُرَدُّ قَطُّ"

یہ رسول اللہ کا پرچم ہے جو پلٹا نہیں کرتا۔ اور محمد بن الحنفیہ نے بھی باقاعدہ داد شجاعت دی جیسا کہ شیخ مفید نے کتاب الجمل صـ ۱۶۵ پر بالتفصیل ذکر فرمایا ہے لیکن ایک مرحلہ وہ بھی آگیا جب محمد کے قدم ایک لمحہ کے لئے رک گئے اور انہوں نے عرض کی:-

"أَلَا تَرَى السِّهَامَ كَأَنَّهَا شَآبِيبُ الْمَطَرِ"

بابا آپ دیکھ رہے ہیں کہ تیروں کا مینہ برس رہا ہے۔ تو آپ نے فرمایا:-

"فِيكَ عِرْقٌ مِنْ أُمِّكَ"

یہ تمہاری رگ مادری کا اثر ہے۔

(شرح نہج البلاغہ)

معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن الحنفیہ جیسے مجاہد کے یہاں بھی اگر مادری سلسلہ میں شجاعت و ہمت نہیں ہے تو کسی بھی وقت میدانِ جہاد میں قدم رک سکتے ہیں۔

اب عباسؑ کی عظمت کا اندازہ کیا جائے جہاں قدم کا رکنا کیسا۔ تلوار ہاتھ میں نہیں ہے۔ مشکیزہ کی ذمہ داری سر پر ہے اور مجاہد خالی ہاتھ فوجوں سے مقابلہ کر رہا ہے۔

تیروں کی بارش ہو رہی ہے اور عباسؑ یہ نہیں کہتے مولا کسی سپر کا انتظام کر دیجئے یا تلوار ہی دے دیجئے!

شانے قلم ہو رہے ہیں لیکن مجاہد پریشان نہیں ہوتا اور کمال اطمینان کے ساتھ حق پرچم ادا کر رہا ہے۔ جس علم کو بابائے مرسل اعظمؐ سے لیا تھا اسکی عزت آج بھی سلامت ہے۔

علامت علم اسلام

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ابتدائی طور پر اپنے پرچم کے لئے کوئی مخصوص علامت مقرر نہیں کی ہے اور عرب کے عام دستور کی طرح اسلام کا پرچم بھی سفید ہی تھا۔

اس کے بعد مختلف میدانوں میں مختلف قسم کے پرچم استعمال کئے گئے۔ جنگِ بدر میں جناب حمزہ کا علم سرخ تھا اور امیرالمومنینؑ کا علم زرد۔ جنگ احد و خیبر میں لواء اور رایت دونوں سفید تھے۔

(مناقب شہر آشوب ۳۲۳، قمر بنی ہاشم علامہ مقرم طاب ثراہ)

اس کے بعد ہر قوم نے اپنا ایک مخصوص رنگ قرار دے دیا۔ بنی امیہ نے سرخ رنگ کا انتخاب کیا۔۔ بنی عباس نے سیاہ رنگ پسند کیا اور علویین کے حصہ میں سفید رنگ آیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد علویین نے رنگ پرچم بدل دیا اور مستقل طور پر سبز رنگ کا انتخاب کر لیا۔

یہ انتخاب اس قدر رائج ہوا کہ حضرت امام رضاؑ کو ولی عہد مملکت بنا دیا گیا تو مامون نے بھی اعلان کر دیا کہ اب حکومت کا رنگ سیاہ کے بجائے سبز ہوگا اور سیاہ رنگ یکسر ترک کر دیا جائے گا۔

امامت کا یہ ایک احسان تھا کہ ولی عہدی کا منصب سنبھال کر بنی عباس کی سیاہی کو زائل کر دیا اور انہیں بھی صلح و آشتی کا رنگ دے دیا۔ خدا جانے سبز رنگ میں کیا خصوصیت ہے کہ دنیا کی ساری قومیں اسے صلح و آشتی اور امن و امان کی علامت سمجھتی ہیں۔ اور آج بھی سرخ رنگ جنگ کی علامت ہے۔ اور سبز رنگ صلح و اتحاد کی نشانی؟

عجب نہیں کہ ذہن بشر میں یہ بھی کربلا کی دین ہو اور تاریخ نے یہ مزاج دین سے حاصل کیا ہو کہ سرخ پرچم والے اپنے نبی کے گھرانے کا خون بہانے پر آمادہ تھے اور سبز پرچم کا علمدار ہاتھ کٹا کر بھی تلوار اٹھانے پر تیار نہ تھا۔

وراثت علم

علمداری کو وراثتی اوصاف میں شمار کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی مادی میراث

ہے جو باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوا کرتی ہے۔ ایسا ہوتا تو علم اسلام محمد حنفیہ ہی کے ہاتھ میں رہ جاتا۔

یا باری باری عباسؑ کے تمام بھائیوں کو عطا ہوتا ـــــــ یا پھر امام حسینؑ خود مستقل طور پر اپنے قبضہ میں رکھ لیتے۔

اس میراث کا مطلب صرف یہ ہے کہ علمداری عباسؑ کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اور یہ شرف اس گھرانے میں جناب ابراہیمؑ کے دور سے چلا آرہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ حالات کی سختی کے اعتبار سے اس کے شرائط و اصول میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور امیرالمومنین علی ابنؑ ابی طالب تک پہنچ کر شرائط معراج کمال کی منزل پر پہنچ گئے ـــــــ جس کے بعد علم اسلام کا اٹھانا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

یہ تنہا حضرت عباسؑ کا شرف تھا کہ سرکار سید الشہداء نے "علمدار کربلا" انھیں کو قرار دیا۔ عباسؑ کے علم کا نام رایت ہو یا لواء یہ بہرحال مسلم ہے کہ لشکر امام حسینؑ کا مرکزی علم جناب عباسؑ کے ہاتھ میں تھا۔

روایت میں حضرت حبیب کے ذکر کے ذیل میں بارہ رایتوں کا ذکر ملتا ہے صبح عاشور بھی ترتیب لشکر کے دوران پرچم کا ذکر موجود ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بلند مرکزی حیثیت جناب عباسؑ ہی کی تھی، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بارہ اصحاب رایات میں بھی عباسؑ کی حیثیت ایک انفرادی حیثیت ہے۔ اور شہداء کربلا میں انھیں کو افضل الشہداء کہا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض روایات میں وارد بھی ہوا ہے۔

(معالم الزلفی ص ۱۲۶ طبع ایران)

ہندوستانی عزاداری اور علم

پرچم اسلام کی مذہبی عظمت کے علاوہ اصل پرچم کی قومی اور سماجی اہمیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہندوستانی عزاداری میں پرچم کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ جلوس عزا میں مختلف تبرکات الگ الگ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن ہر تبرک کے ساتھ پرچم ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک امتیازی شان ہے کہ پرچم تمام تبرکات سے الگ آگے آگے رہتا ہے۔

جو اپنی "یادگار فتح" کے اعلان کے علاوہ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتا ہے کہ علمدار نے آخری وقت تک قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ اور ہر مشکل لمحہ میں فوج سے آگے آگے ہی رہتا ہے۔

اسلامی قانون کے اعتبار سے جنگ اور جہاد کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ "جنگ کا ہیرو" جان کی فکر کرتا ہے اور جہاد کا ذمہ دار ایمان کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے۔

جنگ کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر تنظیم کے ساتھ فوجوں کو محاذ جنگ پر بھیج دے اور خود دارالحکومت کی پناہ میں بیٹھ کر "اخبار" کا انتظار کرتا رہے۔ سپاہی میدان میں کام آجائیں تو ان سے ہمدردی کا اعلان کر کے ان کے ورثاء کے وظائف مقرر کر دے۔ اور سپاہی حریف کو شکست دیکر میدان پر چھا جائیں تو اپنے سر پر "فاتح اعظم" ہونے کا سہرا باندھ لے۔

جہاد کا انداز اس سے بالکل مختلف ہے ـــــــ جہاد کا ذمہ دار فوجوں کو میدان جنگ کے حوالے نہیں کرتا ہے بلکہ خود بہ نفس نفیس میدان جنگ میں آتا ہے اور

اسے فوجوں کی شکست و فتح کی فکر نہیں ہوتی، اصول اور مقصد کے تحفظ کی فکر ہوتی ہے۔ اس کا تمام تر منشا یہ ہوتا ہے کہ میری زندگی رہے نہ رہے میرے اصول زندہ رہیں۔ اور میرا مقصد جہاد باقی رہ جائے۔

مرسلِ اعظم کے بعد مسلمانوں کی لڑائیوں پر جنگ کی چھاپ کا بنیادی راز یہی ہے کہ مسلم سربراہوں نے میدان کا رخ نہیں کیا اور فوجوں کو محاذِ جنگ کی طرف ڈھکیل کر خود کو قصرِ حکومت میں استراحت کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً اپنی فتح کا اعلان بھی کرتے رہے۔

اسلامی مجاہدات کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ مرسلِ اعظم کا تنہا سپاہی اور اسلام کا واحد مجاہد سرِ محاذِ جنگ پر بنفسِ نفیس حاضر رہا اور آخر وقت تک دشمن کو اپنے پیغام سے صلح و آشتی کی دعوت دیتا رہا۔

کربلا کے میدان میں صبح عاشور سے عصرِ عاشور تک امام حسینؑ کے متعدد خطبات اعلان کر رہے ہیں کہ امام حسینؑ جہاد راہِ خدا کے لئے نکلے تھے جنگ اقتدار کے لئے نہیں۔ اور شام کے دارالحکومت میں بیٹھ کر فوجوں کا محاذِ جنگ پر بھیج دینا ——— اس بات کا ثبوت ہے کہ یزید ایک جنگجو انسان تھا اور اسے جہاد راہِ خدا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت عباسؑ کا علم اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ فوجِ حسینی کا منتظم محاذِ جنگ پر ہمیشہ آگے آگے رہا۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا ——— یہ مجاہد کے مجاہد ہونے کا بھی ثبوت ہے، اور جہادِ کربلا کے جہاد ہونے کا بھی اعلان ہے۔

پرچم کی قومی، سماجی اور سیاسی عظمت ہی تھی کہ اردو ادب کے عظیم شعرا نے اسے ایک مستقل موضوع بنا دیا اور حضرت انیس نے اپنے مراثی میں علمداری کو موضوع بنا کر

حضرت عون و محمد اور حضرت عباسؑ کے استحقاق پر ایک تفصیلی بحث کی ہے اور آخر کار اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ علم جعفر طیار کی وراثت نہیں ہے حیدرِ کرار کی وراثت ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔

حضرت جعفر طیار ایک جنگ میں اسلام کے علمبردار تھے اور حضرت علیؑ ہر غزوہ و جہاد میں علمداری کا شرف رکھتے تھے۔

انیس مرحوم کا مکالمہ علم کی عظمت اور اس کی برتری کا بہترین اظہار ہے جو ادب کی روح اور بیان کی جان ہے۔ ادب مضمون آفرینی کا نام نہیں ہے۔ بہترین خیالات کے بہترین اظہار کا نام ہے۔

حضرت جمیل مظہری نے اپنے بعض مراثی میں علم کا تذکرہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اس کی عظمت کا اعلان کیا ہے اور آخر میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سہ

دل آفاق کی دھڑکن ہے پھریرا اس کا

شعراء کرام کے تخیلات و افکار کے علاوہ عملی اعتبار سے بھی پرچم کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

قطب شاہی علم آج تک شہرۂ آفاق ہیں۔ حیدرآباد میں عزاداری میں پرچم کو ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے اور اسے "علم مبارک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اربعین کے موقع پر میں نے خود یہ منظر دیکھا ہے کہ جب دو علم باہم ملائے جاتے ہیں تو جوش و خروش اور گریہ و زاری کا عجیب سماں ہوتا ہے۔ مومنین اس قدر بے چینی سے گریہ کرتے ہیں جیسے ان کے سامنے یہ منظر ہے کہ سردارِ لشکر اپنے علمدار سے بغلگیر ہو رہا ہے اور جعفر طیار و مرسلِ اعظم کی طرح امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔

یوپی کے اضلاع جیسے شہر اور جونپور کا علم بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا پنجہ کسی قیمت پر دس پندرہ کلو سے کم وزن کا نہیں ہے اور اسے صرف ایک شخص اٹھاتا ہے جو بیک وقت پنجہ اور پھریرا دونوں کا بار سنبھالتا ہے اور نہایت سکون سے راستہ طے کرتا ہے۔ میں نے بھی اس علم مبارک کی زیارت کا شرف قصبہ بڑے گاؤں کے "جلوس عماری" میں حاصل کیا ہے اور اسکے کرامات کا مشاہدہ کیا ہے۔

مراسم عزا اور علم

اس مقام پر ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پرچم و علم ہر قوم کا ایک امتیازی نشان ہے تو اسے خصوصیت کے ساتھ واقعۂ کربلا کے مراسم عزا میں شمار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ علم صرف لشکر امام حسینؑ ہی میں نہیں تھا کہ اس کی یادگار قائم کی جائے۔ پرچم کا وجود لشکر یزید میں بھی ثابت ہے۔

اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ علم ہر ایک علم کی یادگار نہیں ہے ——— یہ علم اس علم کی یادگار ہے جو لشکر امام حسینؑ کا نشان تھا اور جس کا علمدار قمر بنی ہاشم تھا۔

مراسم عزا میں کسی شے کو بھی اس وقت تک داخل نہیں کیا جاتا۔ جب تک اس کی تبلیغی اہمیت اور مذہبی نوعیت کا جائزہ لے لیا جائے۔

علم کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک وفادار کی وفا کی نشانی ہے جو بلندیوں سے اعلان کر رہا ہے کہ اسے ایک وفادار نے اس شان سے اٹھایا تھا کہ دونوں ہاتھ قلم ہو گئے لیکن لشکر علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سبق دے رہا ہے کہ علمدار بننے کا حوصلہ ہو تو وہ کلیجہ اور وہ جگر بھی پیدا کرو جس کا سبق کربلا کے علمدار اور علیؑ کے لال

منازلِ قمر

"وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ"

منزلِ اوّل

آسمان دنیا پر چمکنے والا قمر اپنی سیر کمال کو پورا کرنے کے لئے چند منزلوں سے گزرتا ہے۔ ان منازل سفر میں دنیا، اس کی خنکی اور تابانی سے استفادہ بھی کرتی رہتی ہے اور وہ نقص و کمال سے اعتبار حالات زمانہ کی عکاسی بھی کرتا رہتا ہے۔

ایک منزل ہوتی ہے جب یہ "قمر فلک" طالع ہوتا ہے۔ سینکڑوں نگاہیں سوئے آسمان رہتی ہیں۔ لاکھوں دعائیں ساتھ ہوتی ہیں۔ ارمانوں کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ اور گھروں میں مسرت کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔

عہد ظلمت کے خاتمہ کی عید۔ عہد نور کے آغاز کی عید۔ دیکھتے دیکھتے یہ ماہتاب جہاں تاب درجۂ کمال کو پہنچتا ہے اور چودہ دنوں کے اندر اپنے کمال کی ساری منزلیں طے کر کے دنیا کے سامنے امکان کے مکمل کمال کی نمائش کرتا ہے۔

اندھیروں کی روشنی۔ راہوں کا اجالا۔ بے چراغ گھروں کا چراغ۔ بے نور نگاہوں کا نور۔ غریبوں کا دیا۔ امیروں کی شمع محفل۔ فقیروں کی زندگی کا سہارا اور رئیسوں

کی خنکی چشم۔

مسافر شمع راہ سے بے نیاز۔ خانہ نشین چراغ خانہ سے مستغنی ایک ماہ کامل چراغ جگمگا رہا ہے۔ اور ساری روشنیاں مدھم پڑی ہوئی ہیں۔

لیکن عزیزو! یہ دنیا ہے دنیا۔ امکان کی دنیا۔ حادثات کی دنیا۔ یہاں کمال ظاہر کے لئے زوال ناگزیر ہے۔ عروج صوری کے لئے ہبوط لازمی ہے۔

ایک رات کا مسافر کمال جب سفر کی منزل میں آگے بڑھتا ہے ـــــ تو رقیبان کمال پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں گردش زمین حائل ہو جاتی ہے ـــــ کہیں سیر شمس ـــــ کوئی اس کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اور کسی میں بھی حوصلہ نہیں ہے کہ کمال ظاہر کی حوصلہ افزائی کر سکے

دھیرے دھیرے یہ کمال ماہتاب پردوں میں چھپنے لگتا ہے۔ حریف کی طاقت کمزور رہتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنا جلوہ دکھا دیتا ہے۔ کسی رخ سے بھی اپنے جمال کی تابندگی کا اظہار کر دیتا ہے۔

لیکن جب حالات بدل جاتے ہیں اور پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے ـــــ تو قدرت بھی "نظم عالم کو برقرار رکھنے کے لئے" پوری طاقت کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ اور نتیجہ کے طور پر چند دنوں کے لئے نگاہ عالم سے روپوش ہو جاتا ہے اور عالم تمام اندھیرے کی گود میں چلا جاتا ہے۔

اسی وقت نور کی قدر ہوتی ہے اور روشنی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ـــــ نگاہوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور بدگمانوں کو اپنے اعتراض کا اقرار و اعتراف ہوتا ہے۔

راہ کمال میں حائل ہونے والوں کو دوام نہیں ـــــ وہ کتنا بڑا کرہ سہی ـــــ وہ کتنی حسین دنیا سہی۔ لیکن ایک وقت ضرور آئے گا جب یہ سب

راستہ چھوڑ کر ہٹ جائیں گے اور ماہتاب درخشاں پھر اپنا جلوہ دکھا کر دنیا کو اپنے کمال سے فیضیاب کرے گا۔

دنیا یہی سمجھے گی کہ "تحت الشعاع ڈوب جانے والا قمر" اب کسی کو روشنی نہیں دے سکتا ہے۔

منازل سفر تمام کر لینے والا مسافر اب دوسرے مسافروں کو فیض نہیں پہنچا سکے گا۔ لیکن چند ہی لمحات میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سارے تصورات غلط تھے اور با کمال اپنے کمال کی روشنی روک نہیں سکتا۔

ماہ فلک کو "قمر بنی ہاشم" سے کوئی نسبت نہیں ہے ـــــ آفتاب کی شعاعوں پر زندہ رہنے والا چاند ـــــ "مہر امامت کی آغوش کے پروردہ قمر" کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے ـــــ لیکن قمر کی تشبیہ اپنے اندر ایک معنویت ضرور رکھتی ہے۔

"قمر بنی ہاشم" کے منازل حیات کو بھی تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

دور تکمیل ـــــ جب بچہ باپ کے سایۂ تربیت سے فیضیاب ہو رہا تھا اور علیؑ پوری توجہ کے ساتھ اپنی تمناؤں کے مرکز کو اپنے مقصد کا آئینہ دار بنا رہے تھے ـــــ حسنینؑ کی محبتوں کی چھاؤں تھی اور ام البنین کی آرزوں کا سایہ ـــــ روح زہراؑ دعائیں دے رہی تھی اور رحمت مرسل اعظمؐ بلائیں لے رہی تھی۔

یہ دور زندگی سنہ ۲۶ھ سے شروع ہو کر سنہ ۴۰ھ پر تمام ہوتا ہے۔ جب آفتاب امامت ضربت ابن ملجم سے اپنے خون میں ڈوب گیا اور "قمر بنی ہاشم" اپنے کمال کی ساری منزلیں طے کر چکا۔

قمر فلک کے استکمال کی چودہ منزلیں ہوا کرتی ہیں۔ قمر بنی ہاشم نے بھی زندگی کی چودہ

منزلیں آفتاب امامت کے زیر سایہ گزاری ہیں۔ ظاہری عمر کے اعتبار سے عباسؑ "نابالغ" کی حدوں میں تھے ——— لیکن رشد و عقل و فہم و ادراک کے اعتبار سے درجۂ کمال پر فائز تھے۔

۱۴ سال کی عمر میں حضرت عباسؑ کے کمال و فہم و ادراک میں شبہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ تاریخ میں "ابن عباس" کی شخصیت کا جائزہ لیں۔ ابن عباس مفسر قرآن، حبر امت، دنیائے اسلام کے معتبر ترین راوی اور علوم دین کے عظیم ماہر شمار کئے جاتے ہیں۔

ان کی شخصیت کے نام پر دنیائے اسلام سر دھن رہی ہے ———
لیکن ان کی عمر بھی مرسل اعظمؐ کے انتقال کے وقت اس سے زیادہ نہ تھی۔

ابن عباس نے رسول اکرمؐ کا اتنا ہی عہد حیات دیکھا ہے جتنا حضرت عباسؑ نے مولائے کائنات کا دور زندگی دیکھا ہے۔

ابن عباس پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ رہ کر اتنے علوم و فنون کے ماہر اور اصحاب خاص میں شمار ہو سکتے ہیں تو حضرت عباسؑ مولائے کائنات کے نور نظر، پارۂ جگر، جان و دل اور روح رواں ہو کر اس عظیم مرتبہ کے حامل کیوں نہیں ہو سکتے۔

۱۴ سال کی عمر با صلاحیت افراد کے لئے کم نہیں ہوتی۔ عباسؑ کی غیر معمولی صلاحیت تاریخ کے مسلمات میں ہے۔ مورخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ عباسؑ ظاہری نشو و نما کے اعتبار سے بھی عام بچوں سے بالکل مختلف تھے۔

مسلمانوں کی چودہ صدیوں کی تاریخ میں بے شمار ہیں جنہوں نے نہایت ہی کمسنی میں اعلیٰ درجہ کے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مذہبی نظریات سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی ایسے انسانوں کا وجود ہے جو غیر معمولی صلاحیت استعداد کے حامل ہوئے ہیں اور عباسؑ یقیناً انھیں افراد میں سے تھے جن کے متعدد شواہد

گزر چکے ہیں اور باقی آئندہ بیان کئے جائیں گے۔

کربلا کے میدان میں بنی ہاشم کے کمسن بچوں کا جہاد اور علی اصغرؑ کا اطمینان نفس گواہ ہے کہ بنی ہاشم کے افراد ایک انفرادی شان کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا قیاس دنیا کے دوسرے بچوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب بنی ہاشم کے عام بچوں کا یہ حال ہے تو قمر بنی ہاشم کا کیا کہنا؟

حضرت عباسؑ نے مولائے کائنات کے زیر سایہ ۱۴ سال کی طویل عمر استعداد و صلاحیت، گزاری تھی اور اس امام برحق سے شرف تربیت حاصل کیا تھا جس کی ایک نگاہِ کرم کائنات میں انقلاب برپا کر سکتی ہے۔

بہ ذرہ گر نگہ مہر بو تراب کند
بہ آسماں رود و کار آفتاب کند

علیؑ کی نگاہ مہر ذرہ کو آفتاب بنا سکتی ہے ——— تو کیا اپنے نور نظر کو ماہتاب نہیں بنا سکتی۔

۱۴ سال کی عمر کے سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک تاریخی لطیفہ کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

یہ لطیفہ تاریخ کے طالب علم کے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے اور صاحب تحقیق کے لئے تنقید کے عجیب و غریب مواقع فراہم کرتا ہے۔

اعظم گڑھ کے مایۂ ناز مصنف مولانا شبلی حضور سرور کائنات کے وقت آخر کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے واقعہ قرطاس پر تبصرہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابل قیاس ہے۔

لہٰذا تیں اعتبار سے صحابۂ کرام کے بارے میں یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ محبوب کردگار قلم و دوات مانگیں اور وہ قلم و دوات دینے سے انکار کر دیں یا ان کی شان

میں کوئی گستاخی کریں۔

روایتی اعتبار سے یہ کمزوری ہے کہ اس واقعہ کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں جو اس وقت ۱۳ - ۱۴ سال کے نابالغ بچے تھے۔ اور نابالغ کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ابن عباس شرعی عمر کے اعتبار سے یقیناً نابالغ تھے لیکن قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ یہ حیاتِ پیغمبرؐ ہیں۔ ان کی عمر کا آخری درجہ تھا اس کے پہلے وہ اس سے کمسن ہی رہے ہوں گے اور اس کے بعد ان کی عمر میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ابن عباس کے جملہ روایات میں سب سے زیادہ سن کی روایت یہی روایت ہے۔

اس کے علاوہ تمام روایتیں دو چار دن یا دو چار سال کم عمر ہی کی ہوں گی۔

اب اگر وہ تمام روایتیں قابل قبول ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس روایت کو نظرانداز کر دیا جائے اور اگر وہ تمام روایتیں ناقابل قبول ہیں تو ابن عباس کا روایات میں کوئی درجہ نہیں ہے کہ انھیں اتنی اہم اسلامی شخصیت بنا کر پیش کیا جا سکے۔

یہ کہنا قطعی غلط ہوگا کہ باقی روایات کو انھوں نے بالغ ہونے کے بعد بیان کیا ہے لہٰذا ان کا اعتبار ہونا چاہیئے؟

اس لئے کہ اولاً تو اس روایت کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں ہے کہ اسے یہ امتیاز حاصل نہیں ہوا۔

بلکہ تاریخ میں اس کے برعکس ثبوت موجود ہے کہ ابن عباس تا حیات "یوم الخمیس" کو یاد کر کے روتے رہے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ علمائے اخبار میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث ہے کہ نابالغ کے روایات کو بلوغ کے عالم میں نقل کر دینا اسے معتبر بنا سکتا ہے یا نہیں؟

اکثر علماء اس بات کا بھی احتمال دیتے ہیں کہ بلوغ کی دیانت داری بچپنے کی شرعی آزادی کا مداوا نہیں کر سکتی اور بلوغ کی حالت میں نقل کر دینا روایت کے اعتبار کی سند نہیں بن سکتا ہے۔

مشاہدات

تاریخی اعتبار سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ حضرت عباسؓ نے اس دور میں کن حالات کا مشاہدہ کیا اور ان سے کیا حاصل کیا۔

انسان کی تکمیلی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ان عناصر کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

۲۶ھ کا زمانہ وہ ہے جب امیر المومنینؑ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے "مسلمان حکومت" کے دور گزر چکے تھے ——— اور "خلافت" تیسرے مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔

خلافت کے دور دوم کے بعد یہ بات تقریباً یقینی ہو چکی تھی کہ امت اسلامیہ میں اس بار گراں کو اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ اور قوم و ملت کے جملہ مسائل کا حل علیؑ ابن طالب کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

لیکن خلیفۂ دوم نے وقت آخر شوریٰ کی ایک ایسی ترتیب مقرر کر دی کہ ابن عباس کو فریاد کرنا پڑی کہ اب خلافت قیامت تک بنی ہاشم میں پلٹ کر نہیں آسکتی ——— نتیجہ بھی یہی ہوا کہ ہوائے کائنات کے سامنے کتاب و سنت کے ساتھ سیرت خلفاء

پر عمل کرنے کی شرط رکھ دی گئی اور آپ نے یہ کہہ کر اس شرط کو ٹھکرا دیا کہ میں کتاب و سنت سے مختلف کسی قانون پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

حضرت عثمان نے وقتی طور پر اس شرط کو منظور کر لیا اور اس کے نتیجہ میں تخت حکومت پر قابض ہو گئے۔ ابن ابی الحدید ۱ ص ۶۳، ابن خلدون ۲ ص ۱۳۶، طبری ۵ ص ۳۷۔

بنی ہاشم کے دل پر یہ واقعہ ایک گہرا گھاؤ بن گیا اور ہر ایک نے یہ سمجھ لیا کہ اب حکومت ان کے ہاتھ میں پہنچ گئی ہے جن سے کسی خیر کی امید نہیں کی جاسکتی۔ (کامل ۱ ص ۲۷، ابو الفدا ۱ ص ۶۵، ص ۶۶)

تاریخ کے پہلے ادوار بھی بنی ہاشم کے حق میں کچھ کم مصیبت کے نہیں تھے لیکن ان میں کم از کم "اسلامی رسوم" اور "ظاہری سادگی" کا رواج تو تھا ——— بنی امیہ سے تو یہ بھی امید نہیں کی جاسکتی۔

سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ جس معاویہ کو خلیفۂ دوم نے اپنے سیاسی مصالح کے تحت گورنر بنا دیا ہے اس کا اقتدار اور مضبوط ہو جائے گا۔ اور بنی امیہ کو اسلام سے باقاعدہ کھیل کھیلنے کا موقع مل جائے گا۔

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ عثمان کی خلافت کے بعد ابو سفیان مبارکباد کے لئے آیا تو سب سے پہلے یہ جملہ کہا کہ:۔

اب تیم و عدی کے بعد خلافت تمہارے ہاتھ میں آگئی ہے اسے گیند کی طرح نچاؤ اور بنی امیہ کو مرکزی حیثیت دو۔ یہ ملک ہے ملک۔ یہاں جنت و جہنم کا کوئی گزر نہیں ہے۔" طبری ۱۱ ص ۳۵۷، مروج الذہب ۱ ص ۴۴۰، ابن عساکر ۶ ص ۴۰۷ اور استیعاب ۲ ص ۶۹۰۔

ظاہر ہے کہ بنی امیہ کے ہر گھر میں اس "جعل سازی" کا ذکر رہا ہوگا اور معاویہ

کے مظالم ان تذکروں میں مزید شدت پیدا کرتے ہوں گے۔

ایسے ہی ایک پرآشوب دور میں ابوالفضل العباس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے گرد و پیش مصائب و آلام کی ایک دنیا دیکھی۔

شدائد کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور مظالم کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ معاشرہ میں ایک ہی چرچا تھا کہ بنو امیہ نہایت ذلیل، خبیث، سرکش اور باغی قوم ہیں اور بنی ہاشم روز اول سے مظلوم ہیں۔

یہ حالات حضرت عباسؑ کے دل و دماغ پر نقش ہوتے رہے اور آپ کے ذہن میں دین و مذہب کے ساتھ قوم و ملت کا درد کروٹیں لیتا رہا۔

علماء نفسیات کا کہنا ہے کہ ۶ برس کی عمر انسانی تاثرات کی ابتدائی عمر ہوتی ہے اور اس عمر میں انسان کے دل و دماغ پر سماج کے اثرات نقش ہونے لگتے ہیں۔

حضرت عباسؑ اپنے پورے معاشرہ میں ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے دل و دماغ پر حالات کے نقش ہونے کے علاوہ ان کے علاج کے تصورات بھی ابھر رہے تھے۔

بچپنے کی حدیں طے ہو رہی تھیں۔ اور بنی امیہ کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

عباسؑ کے کسی جذبہ کا تعلق دنیاداری یا راحت طلبی سے نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر اپنے باپ کا کردار تھا جہاں پچیس برس کی مسلسل خانہ نشینی کے باوجود انقلاب و احتجاج کا کوئی کام نہیں شروع ہوا تھا۔

۶ سال سے ۱۰ سال کے اندر کا زمانہ اور شدت کا تھا ——— پورے اسلامی سماج میں ایک ہیجان برپا تھا اور ہر طرف سے احتجاج و انقلاب کی آوازیں آ رہی تھیں۔

حضرت عثمان کی ناعاقبت اندیشی سے ایک عام طوفان پیدا تھا اور ہر طرف ان کی زیادتیوں کا چرچا ہو رہا تھا ——— کہیں اصحاب رسولؐ کے قتل کا ذکر، کہیں محبان آل محمدؐ کے مصائب کا تذکرہ ——— کہیں حضرت ابوذر کی جلاوطنی کی فریاد ——— اور کہیں احکام شریعت میں ترمیم و تنسیخ کے خلاف "شورِ انقلاب"

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ حضرت ابوذر کو صرف اسلامی احکام کی تبلیغ کے جرم میں شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ مروج الذہب ۱ ص ۴۳۵، ابن ابی الحدید ۱ ص ۲۴ فتح الباری ۳ ص ۲۱۳، تاریخ یعقوبی ۲ ص ۱۴۸ بخاری زکوٰۃ۔

منیٰ میں قصر پڑھی جانے والی نماز پوری پڑھی جانے لگی تھی۔ بخاری ۲ ص ۱۰۲ مسلم ۲ ص ۲۶۰، احمد ۲ ص ۱۴۵۔

بنی امیہ میں داد و دہش کا سلسلہ اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اللہ کی پناہ ——— ایک ایک نااہل کو لاکھوں کی دولت تقسیم کی جا رہی تھی۔ اور مسلمانوں کا بیت المال اقربا پروری پر صرف ہو رہا تھا۔

علامہ امینی طاب ثراہ نے الغدیر میں ان عطایا کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس کا مختصر خاکہ یہ ہے:-

شخصیت	دینار	حوالہ
مروان	۵۰۰۰۰۰	معارف ۸۴۔ ابوالفداء ۱ ص ۱۶۸ الناب ۵ ص ۳۸
ابن ابی سرح	۱۰۰۰۰۰	تاریخ ابن کثیر ۷ ص ۱۵۲
طلحہ	۲۰۰۰۰۰	

شخصیت	دینار	حوالہ
عبدالرحمٰن	۲۵۶۰۰۰۰	طبقات ۳ ص۹۶، مروج الذہب ۱ ص۴۳۴ یعقوبی ۲ ص۳۴۶
یعلیٰ بن امیہ	۵۰۰۰۰	مروج الذہب ۱ ص۴۳۴
زید بن ثابت	۱۰۰۰۰	"
ذاتی ملکیت	۱۵۰۰۰۰+۲۰۰۰۰۰	استیعاب ۲ ص۴۷۶، طبقات ۳ ص۳۰ انساب ۳ ص۴

کل میزان :- ۴۳۱۰۰۰۰ دینار

شخصیت	درہم	حوالجات
حکم	۲۰۰۰۰۰	انساب ۵ ص۲۸
آل حکم	۲۰۲۰۰۰۰	
حارث	۲۰۰۰۰۰	انساب ۵ ص۵۲
سعید	۱۰۰۰۰۰	" ۵ ص۲۸
ولید	۱۰۰۰۰۰	عقد فرید ۲ ص۲۷۲
عبداللہ	۳۰۰۰۰۰+۶۰۰۰۰۰	" ۲ ص۲۶۱، معارف ص۸۴ ابن ابی الحدید ۱ ص۶۶
ابوسفیان	۲۰۰۰۰۰	شرح ابن ابی الحدید ۱ ص۶۷
مروان	۱۰۰۰۰۰	
طلحہ	۲۲۰۰۰۰۰+۳۰۰۰۰۰۰	طبقات ۳ ص۱۵۸،

شخصیت	درہم	حوالہ جات
		انساب ۵ ص۷، مروج الذہب ۱ ص۴۳۴
زبیر	۵۹۸۰۰۰۰۰	شرح بخاری باب برکہ غازی ۵ ص۲۱
ابن ابی وقاص	۲۵۰۰۰۰	طبقات ۳ ص۱۰۵، مروج الذہب ۱ ص۴۳۴
ذاتی ملکیت	۳۰۵۰۰۰۰	

میزان کل ۱۲۶۷۷۰۰۰۰ درہم

اس کے علاوہ ایک آخری جرم جس کے بعد آپ کی زندگی محال ہوگئی اور آپ کو بالآخر موت سے ہم کنار ہونا پڑا۔ اصلاح حال کا تقاضا کرنے والوں کے ساتھ وہ غیر اخلاقی اور غیر انسانی برتاؤ تھا جو سیاست کی دنیا میں شائد قابل قبول ہو۔ لیکن سیاستِ مذہب میں کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

مسلمانوں کے وفود آتے رہے۔ حالات کی اطلاع کرتے رہے۔ اصلاح حال کا تقاضا ہوتا رہا ——— لیکن آپ کا صرف ایک جواب تھا "یہ مروان کی حرکت ہے"! "یہ امر وزارت سے تعلق رکھتا ہے"! "اس کا صدر مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہے"!

مسلمانوں نے عاجز آکر یہاں تک کہہ دیا کہ مروان کو نکال باہر کیجئے۔ گورنروں کو تبدیل کیجئے۔ دوسرے عمال مقرر کیجئے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے بھی ہر موقع پر اصلاح امر کی کوشش کی اور درمیان میں پڑکر مفاہمت کرانا چاہی۔ لیکن خلافت کے نشہ میں چور بادشاہ کے ذہن میں کوئی بات نہ آسکی

اور مروانیت کے غلبہ نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔

امت کا ایک مطالبہ قبول بھی کیا گیا تو اس انداز سے کہ ایک شخص کو گورنر بنایا گیا اور دوسرے کو اس کے قتل کا فرمان بھیج دیا گیا۔

(ابوالفداء ۱ ص۱۷۹ طبری ۳ ص۳۹۱)

خط پکڑا گیا۔ حالات بد سے بدتر ہوئے۔ اور اختلافی جماعت نے ہر عذر کو سننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار وہ موقع بھی آگیا جب مسلمانوں کا یہ بادشاہ اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ . . . . اور "بیوفا امت" نے اپنے حاکم کا کوئی ساتھ نہ دیا۔

امت تو امت وہ گورنر جو بادشاہ کے دم قدم سے زندہ تھا اور جس کی ساری شخصیت اسی حاکم کی دی ہوئی چھوٹ کا نتیجہ تھی اس نے بھی ہر ممکن امداد سے عملی انکار کر دیا اور شام کی فوجیں مدینہ کے باہر ہی ٹھہری رہیں۔ حاکم امت قلعہ میں محصور ایک ایک قطرہ پانی کا مطالبہ کر رہا تھا اور امت اپنی خلافت سازی کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔

یہ حضرت علیؑ ہی کا کرم تھا کہ انھوں نے ایسے نازک وقت میں بھی حاکم کی امداد کی اور اپنے بچوں کو خطرہ میں ڈال کر پانی بھیج دیا۔ اختلاف اپنے مقام پر ہے لیکن پیاسے کو پانی پلانا ایک اسلامی شعار ہے۔

ساقیٔ کوثر کا طرز عمل صاف اعلان کر رہا تھا کہ اسلام میں "واجب القتل" کو بھی پیاسا نہیں قتل کیا جا سکتا۔

حزب اختلاف خلیفہ کو واجب القتل سمجھتا ہے تو یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس طرح پانی بند کر دیا جائے اور کسی شخص کو تیغ و خنجر کے بجائے تشنگی اور گرسنگی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

۱۸ ذی الحجہ کو محاصرہ کرنے والی جماعت اپنے عزائم میں کامیاب ہوئی . . . . . . اور "حزب اختلاف" نے گھر کے اندر داخل ہو کر خلیفہ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

حالات کا صحیح جائزہ لینے والے جانتے ہیں کہ اس خون کی تمام تر ذمہ داری ان افراد پر ہے جنہوں نے انھیں تخت حکومت پر بٹھایا تھا اور پھر امداد کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ ذمہ داری ان: مروان پر ہے جس نے ان کے نام پر ہر بد سے بدتر کردار کا مظاہرہ کیا اور ان کے نتائج کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

ان شامی گورنر معاویہ بن ابی سفیان پر ہے جس نے امداد کا وعدہ کر کے حوصلے تو بڑھا دیئے لیکن عین وقت پر اپنے لشکر کو مدینہ سے باہر روک دیا اور خلیفہ کے قتل کے بعد واپس شام بلا لیا۔

اس زوجۂ رسول پر ہے جس نے "اُقْتُلُوا نَعْثَلاً" کا نعرہ لگا کر ان کے خلاف آمادہ کر کے ان کا خون کرایا تھا۔ (طبری ۳ ص۴۸۶)

اتنے بڑے مدینہ میں ایک ہمدرد جماعت کا نہ پیدا ہونا حیرت انگیز تھا . . . . . لیکن ام المومنین حضرت عائشہ کی قومی اہمیت اور ان کے زوجہ رسول ہونے کے احترام کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ بات آسان ہو جاتی ہے۔ امت کو اپنے رسولؐ کی زوجہ سے عقیدت تھی اور وہ ان کے ارشادات کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا کرتی تھی۔

اب اگر وہی خاتون اختلاف پر آمادہ ہو جائے اور کھلے عام قتل کا فتویٰ دینے لگے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ امت خلیفہ کے کسی احترام کی قائل رہ جائے اور ان کی حفاظت کو کوئی بھی شرعی امر سمجھے۔

یہ امت ایک "ناکردہ گنہگار" کے خلاف اجتماع کر سکتی ہے اور جمل کا پورا ہنگامہ کھڑا کر سکتی ہے تو اس کے لئے وہاں ہنگامہ کرنے میں کیا زحمت ہے جہاں سارے حالات اپنی آنکھوں کے سامنے ہوں اور حکومت کی بے راہ روی کا مسلسل مشاہدہ ہو رہا ہو۔

خلیفۂ سوم کا قتل واقع ہو گیا۔ لاش تین دن تک پڑی رہ گئی۔ مسلمانوں میں جرات دفن بھی نہ ہوئی۔

شام کے لشکر کو بھی یہ "توفیق" نہ حاصل ہو سکی اور آخر کار حزب اختلاف کے شدید احتجاج کی بنا پر مسلمانوں کے قبرستان سے الگ یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

(طبری ۳ ص ۴۸۶)

عثمان کا قتل ہوا تھا کہ حکومتوں کے زیر اثر رہنے والی امت نے اپنے کو بے والی و وارث سمجھنا شروع کر دیا۔ اور ایک نئے خلیفہ کی فکر لاحق ہو گئی۔

(الامامۃ والسیاسۃ ۱ ص ۴۵)

ارباب ہوس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پہلے یہ کوشش کہ خود ان کی جماعت کا کوئی آدمی منصب پر آجائے اور اگر بدلے ہوئے حالات میں رائے عامہ اس بات کا موقع نہ دے تو کسی ایسے آدمی کو خلیفہ بنایا جائے جس سے خلافت کے نام پر بے پناہ ذمہ داریوں کا مطالبہ کیا جائے اور ان کے پورا نہ ہونے کی شکل میں اس سے بھی اپنے عزائم کا انتقام لے لیا جائے۔

چنانچہ خلیفہ ساز جماعت کے رکن اعلیٰ طلحہ و زبیر میدان میں آگئے اور امت کے رجحان کا اندازہ کر کے اپنا نام پیش کرنے کے بجائے حضرت علیؑ کے پاس آئے۔ آپ سے تقاضہ کیا کہ آپ خلافت کو قبول فرمالیں۔

آپ نے شدت سے مخالفت کی اور فرمایا کہ:۔

"میں روز اول بھی اس امر کا اہل تھا لیکن اس وقت یہ خلافت نہیں دی گئی تو اب اس کا کیا محل ہے؟"

مجھے ایسی حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ اس کے لئے کوئی دوسرا اقتدار تلاش کر لیں۔

گرفتاریوں میں پھنسی ہوئی امت جائے تو کہاں جائے؟ مشکلکشائے وقت سے پھر فریاد شروع کی اور علیؑ کی دو شرطوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ ۱۰۔۱۲ سال کے

اندر اتنا عظیم انقلاب آگیا کہ کل علیؑ کے سر پر شرطیں بار کی جا رہی تھیں۔ اور آج ان کی تمام شرطوں کو اپنے سر پر جگہ دی جا رہی ہے۔

شرطیں قبول کی گئیں اور مولائے کائنات نے بدرجہ مجبوری مسلمانوں کی بیعت قبول فرمالی۔

بیعت تمام ہو گئی۔ لیکن طلحہ و زبیر کے دل میں یہ حسرتیں کروٹیں بدلتی رہیں کہ ہمیں حالات نے کس قدر مجبور کر دیا تھا کہ ہم جیسے مستحقین خلافت کو دوسروں کی بیعت کرنا پڑی۔

حالات ناساز گار تھے تو یہ بھی ہو گیا۔۔۔۔۔ لیکن اس کے لئے کوئی دوسری فکر کرنا ضروری ہے

باہمی مشورے ہوئے اور یہ طے پایا کہ اس کاروبار کے لئے ام المومنین کو ذریعہ بنایا جائے۔ ان کا قوم میں احترام ہے اور ان کی آواز میں اثر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم ان کے کہنے سے اقتدار حاکم کا خون برداشت کر سکتی ہے وہ خانہ نشین علیؑ سے اختلاف کیوں نہیں کر سکتی۔

یہ طے کر کے نہایت "سعادت مندی" سے مولائے کائنات کی خدمت میں عرض کی۔ "ہم دونوں عمرہ کے لئے مکہ معظمہ جانا چاہتے ہیں۔ ام المومنین اس وقت مکہ ہی میں تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس عمرہ سے غداری کی بو آتی ہے لیکن اگر جانا ہی چاہتے ہو تو جاؤ۔

مولائے کائنات بدلے ہوئے حالات وحوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار تھے۔

اس لئے آپ نے نہایت ہی اطمینان وسکون کے ساتھ دونوں کو اجازت دیدی۔ اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔ اب صرف اس وقت کا انتظار ہے جب

ان دونوں کی سازش کارگر ہو اور اسلام ایک نئے فتنہ کا شکار ہو جائے۔

طلحہ و زبیر مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور ادھر ام المومنین مکہ سے حج تمام کرکے مدینہ کی طرف آرہی تھیں۔ راستہ میں دونوں کی ملاقات ہو گئی انھوں نے سب سے پہلے عثمان کے بارے میں دریافت کیا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کی نگاہ میں جس منصوبہ کی اہمیت ہوتی ہے اسی کا ہر وقت خیال رہتا ہے اور ذہن میں اس کا خاکہ گردش کیا کرتا ہے۔

ام المومنین نے "قتل عثمان" کے لئے بے پناہ کوشش کی تھی۔ ان کے خلاف فتوے جاری کئے تھے۔ قمیص رسولؐ کو دکھلا کر امت کو ورغلایا تھا کہ "ابھی یہ قمیص میلی نہیں ہوئی ہے۔ اور تم نے سنت رسولؐ کو بدل ڈالا ہے۔

فطری طور پر انھیں نتائج کی فکر ہونا ہی چاہئے تھی۔ ان کا یہ سوال بالکل برمحل تھا کہ عثمان کا کیا حشر ہوا۔ اور حضرت عثمان کے قتل کی خبر پر ان کا مسرور ہونا بھی بے محل نہ تھا۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۷

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قتل عثمان کے بعد جب حضرت علیؑ کی خلافت کی خبر سنی تو بلا فاصلہ عثمان کی مظلومیت کا اعلان کر دیا اور انتقام "خونِ ناحق" کے نام پر صف آرائی کے لئے تیار ہو گئیں۔ طبری ۳ ص ۴۶۹

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو صرف عثمان کی حیات کے خاتمہ سے دلچسپی نہ تھی بلکہ عہدۂ خلافت سے بھی آپ کی دلچسپیاں وابستہ تھیں اور آپ نے سارا زور طلحہ و زبیر کی خلافت کے لئے صرف کیا تھا اور جب ان دونوں نے اپنے منصوبوں کی ناکامی کی خبر دی اور بتایا کہ امت کے حالات اپنے حق میں سازگار نہیں ہیں۔ قوم نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی ہے تو یکبارگی برہم ہو گئیں اور حکومت کی نالائقی کا شکوہ کرنے کے بجائے علیؑ سے خونِ عثمان کا انتقام لینے پر آمادہ ہو گئیں۔

واقعات پر تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ صرف تاریخی پس منظر کا سامنے لانا مقصود ہے۔

ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ کو شرعی اعتبار سے کسی شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں تھا۔

وہ سرزمین قتل سے دور تھیں۔ انھیں حالات کی صحیح اطلاع نہ تھی۔ ان کا پہلا فرض تھا کہ جن افراد کو قاتل سمجھ رہی تھیں انھیں اپنے منصوبہ کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتیں اور اگر یہ ممکن نہیں تھا اور خلیفہ کے بارے میں ان کی رائے بدل چکی تھی تو کم از کم تحقیق حال کرنے کے لئے یہ کہتیں کہ آپ کے بارے میں قتل عثمان کی شکایت ملی ہے۔

نہ یہ کہ بے سر و سامان خبروں پر ایک ایسے شخص سے انتقام لینے پر تیار ہو جائیں جو آخر وقت تک خلیفہ کے لئے پانی کا انتظام کرتا رہا اور قصر حکومت کے باشندوں کو پیاس سے ہلاک نہ ہونے دیا ہو۔

حضرت علیؑ کی کوئی خطا ہے تو یہی ہے کہ انھوں نے "حضرت عائشہ" کے منصوبہ کے خلاف خلیفہ کی مدد کی انھیں پانی سے محروم نہیں کیا۔ اسکے علاوہ کسی اور جرم و خطا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عائشہ تو عثمان کے ورثہ میں کبھی نہ تھیں؟ انھیں انتقام کا حق پیدا ہوتا۔؟

قانونی اعتبار سے حاکم وقت اور خلیفۃ المسلمین کا عہدہ حضرت علیؑ کے پاس تھا۔ انتقام کی کارروائی انھیں کرنا چاہئے تھی۔ حضرت عائشہ کو یہ حق کہاں سے پیدا ہو گیا۔؟

انھیں انتقامی کارروائی کرنا تھی تو تمہیدی طور پر خلیفۃ المسلمین ہی سے ملنا

چاہیئے تھا؟

اور یہ حیرت انگیز بات بھی نہ ہوتی جس خاتون میں میدانِ جنگ میں فوجی قیادت کی صلاحیت موجود ہو۔ اس کے پاس گھر بیٹھ کر خلافت کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

حالات نے رخ بدلا اور زمانہ ایک نئے موڑ پر آگیا۔ خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت علیؑ کو جمل کی لڑائی سے دوچار ہونا پڑا۔

جنگ جمل میں کیا ہوا۔ اس کے تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے صرف دو اہم باتوں کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

ام المومنین بذات خود لشکر کی قیادت فرما رہی تھیں اور امیر المومنینؑ طلحہ و زبیر کو مسلسل توجہ دلا رہے تھے۔

"ارے یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ اپنے ناموس کو گھروں میں چھوڑ کر آئے ہو اور ناموس رسولؐ کو سرِ میدان لے آئے ہو۔"

جنگ کے خاتمہ پر بھی آپ نے شکست خوردہ لشکر کی سربراہ خاتون کو نہایت ہی احترام و احتشام کے ساتھ مدینہ واپس پہنچایا اور کسی منزل پر یہ گوارہ نہ کیا کہ ناموس رسولؐ کی بے حرمتی ہو۔

حضرت علیؑ کا یہ وہ کردار تھا جسے ام المومنین تاحیات فراموش نہ کر سکیں اور برابر اپنے "اعمال" پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کرتی تھیں کہ علیؑ نے انتہائی شرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ورنہ کوئی شخص بھی اپنے مخالف گروہ کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا کرتا۔

حضرت علیؑ کے لئے یہ بات کوئی نئی نہیں تھی۔ آپ نے ایسا ہی برتاؤ خندق کی لڑائی میں عمرو بن عبدود کے ساتھ کیا تھا اور قتل کرنے کے بعد اس کے لباس کو اس کے بدن پر چھوڑ دیا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی بہن نے بھائی کا مرثیہ پڑھنے کے بجائے بھائی کے قاتل کا قصیدہ پڑھا تھا اور یہ کہا تھا کہ میرے بھائی کا قاتل اس قدر شریف تھا کہ اس نے جسم سے لباس جدا نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ ایک بلند کردار انسان ایک "دشمن اسلام" کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکتا ہے تو وہ زوجہ رسولؐ کے ساتھ ایسا سلوک کیوں نہیں کر سکتا؟

لڑائی کا دوسرا منظر یہ ہے کہ جنگ اپنے پورے شباب پر ہے۔ امیر المومنینؑ اپنے عزیز فرزند محمد حنفیہ کو میدان جنگ میں بھیج چکے ہیں اور تیروں کی بوچھار دیکھ کر محمد کی زبان پر یہ فقرہ آچکا ہے کہ اس عالم میں کیسے آگے بڑھوں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ یہ رگِ مادری کا اثر ہے۔ جو ایک نفسیاتی قانون کی حیثیت رکھتا ہے کہ میدان جہاد میں قدم آگے بڑھانے کے لئے ہمت دل اور سکون نفس کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ شجاعت طرفین سے میراث میں ملی ہو۔

اس قانون نے امیر المومنینؑ کے اس اقدام کی وضاحت کر دی کہ ایک ایسی خاتون سے عقد کیا جائے جس سے بہادر فرزند پیدا ہو۔ اور خاص موقع پر کام آئے۔

حضرت عباسؑ کی عمر اس وقت تقریباً دس سال کی تھی۔ . . . .
اس عمر میں عام بچے بھی بڑی حد تک ہوشمند اور باادراک ہو جاتے ہیں اور انھیں حالات کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔

چہ جائیکہ علیؑ کا لال عباسؑ . . . . جس کے فہم و فراست کا اندازہ کرنا دشوار ہے اور جس نے باپ کی وراثت میں وہ ذہانت و صلاحیت پائی ہے

کہ باپ کی گودی سے توحید کا پیغام دیا ہے اور واضح لفظوں میں اعلان کر دیا کہ جس زبان سے ایک کہہ دیا اُس زبان سے دو نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت عباسؑ نے اپنے گھرانے کے عظیم کردار کے علاوہ دنیائے اسلام کے بدلتے ہوئے حالات کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ امت علیؑ جیسے بلند کردار رہنما سے بھی وفا نہیں کر سکتی تو کسی دوسرے کا کیا ذکر ہے۔

بنی امیہ ہاشمی گھرانے کے ساتھ دین اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اور ہمارے گھر والے ہر ممکن قربانی دے کر اس دین کا تحفظ کر رہے ہیں۔ پدر بزرگوار نے عزت دین کی خاطر تخت حکومت کو چھوڑ دیا۔

حکام جور کی تائید نہ کرنے کی بنا پر شدید مصائب کا سامنا کیا۔ حق کی پاسبانی کے جرم میں ۲۵ سال خانہ نشین رہے۔

ناموس رسول عربی کے تحفظ میں جمل کی لڑائی کا مقابلہ کیا ہے۔ اور نہ جانے کس طرح ایسے نازک حالات میں زندگی گزاری ہے۔

ایسے حالات ایک عام انسان کے اندر بھی دین کی حفاظت کا جذبہ ۔ ۔ ۔ اور اموی سازشوں کے بے نقاب کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ عباسؑ کی منزل تو بہت بلند ہے۔ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ اگر دین کی خاطر تخت حکومت چھوڑا جا سکتا ہے تو فرات کا کنارہ چھوڑ دینے میں کیا زحمت ہے اور اگر مذہب کے نام پر خانہ نشینی اختیار کی جا سکتی ہے تو وطن چھوڑ کر غربت کی زندگی بسر کرنے میں کیا تکلیف ہے

تحفظ اسلام کے لئے ذوالفقار نیام میں رہ سکتی ہے تو امام وقت کے اشارے پر تلوار نیام میں کیوں نہیں رہ سکتی۔

عباسؑ کے علاوہ کوئی دوسرا انسان ہوتا اور علیؑ کے علاوہ کسی اور کی آغوش تربیت

میں پروان چڑھا ہوتا۔ تو اس کے ذہن میں حکومت کے خلاف انتقامی جذبات کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ اسے ہر آن یہی فکر ہوتی کہ کس طرح اپنے مخالفین سے بدلہ لے لیا جائے اور ان کے وجود کو صفحۂ تاریخ سے محو کر دیا جائے۔ اب تو اپنے گھر میں ظاہری اقتدار بھی آچکا ہے اور عرب و عجم کی عظیم حکومت کا تخت زیر قدم ہے۔

عراق بیعت کئے ہوئے ہے۔ ایران کردار کی بلندی پر قربان ہے۔ علمی دنیا گردنوں کو خم کئے ہوئے ہے اور حسن تدبیر پر سارا عالم اسلام نازاں ہے۔

ایسے حالات میں انقلابی مہم کا چلا دینا اور دشمن کو ایک ایک کر کے تباہ و برباد کر دینا ایک فطری امر تھا۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن عباسؑ علیؑ کی آغوش کے پروردہ تھے۔ انھوں نے مولائے کائنات کی حیات و سیرت کا مطالعہ کیا تھا۔

ان کے پیش نظر اموی مظالم کے ساتھ باپ کا عظیم کردار بھی تھا جو دور دراز سے اپنے حقوق کی پامالی پر صبر کر رہا تھا اور مسلسل اعلان کر رہا تھا کہ اگر حفاظت دین مقصود نہ ہوتی اور امت کے منقلب ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو مجھ سے بڑی طاقت کا حامل کون تھا اور مجھ سے بڑا انقلاب کون لا سکتا ہے؟

عباسؑ اسی دل و دماغ کے ایک انسان کا نام تھا۔ ان کی رگوں میں علیؑ کا لہو تھا تو ذہن و دماغ میں علیؑ کے افکار۔ ۔ ۔ بازوؤں میں علیؑ کی طاقت تھی تو زندگی میں علیؑ کی تربیت کے آثار۔

جمل کا پورا واقعہ عباسؑ کی نگاہوں کے سامنے گزر گیا۔ اور بنی ہاشم کے کمسن سپاہی نے اف تک نہ کی۔

انصاف والے بتائیں کہ کیا اس وقت عباسؑ کی رگوں میں خون شجاعت کا جوش نہ رہا ہوگا۔

کیا علیؑ کا شیر پیچ و تاب نہ کھا رہا ہوگا۔

کیا فطرت بشر میدان جنگ میں کود پڑنے پر آمادہ نہ کر رہی ہوگی۔

یقیناً یہ سب رہا ہوگا لیکن عباسؑ صرف طاقت کے دھنی کا نام نہیں ہے۔ عباسؑ علم و عرفان کا پیکر ہے۔ امام وقت کی مصلحت کا عارف ہے۔ عباسؑ کو بخوبی معلوم ہے کہ اذن امام کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا اور امام وقت سے بہتر کوئی مصلحت جہاد کا واقف و عارف نہیں ہے۔

جمل کا واقعہ تمام ہوا۔ اور علیؑ کے شیر دل فرزند نے امت کے حالات کے ساتھ باپ کے بلند کردار کا مکمل طور پر مشاہدہ کر لیا۔

حالات انسانی زندگی پر بہر حال اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور غیر معصوم اپنے گرد و پیش کے حالات سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ حادثات زمانہ انسانی ذہن کو پختہ اور انسانی عزم کو مستحکم بناتے رہتے ہیں۔

ناز و نعم کا پلا ہوا انسان مصائب کے مقابلہ میں صفر کے درجہ پر ہوتا ہے اور آندھیوں اور طوفانوں سے کھیلنے والا بچہ مصائب و آلام کے مقابلہ میں جوان ہوتا ہے

• علمدار کربلا کی تاریخی زندگی کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہے کہ عباسؑ عمر میں کتنے ہی کمسن ہوں علم و عرفان میں کامل، حالات کے تجزیہ میں ماہر۔ قوت فیصلہ کے اعتبار سے مکمل اور عزم و ہمت کے اعتبار سے کسی جوان سے کم نہ تھے۔

علامہ خوارزمی کی یہ روایت بالکل صحیح ہے کہ عباسؑ صفین کے میدان میں ایک "کامل مرد" تھے۔ ۱۱ سال کا بچہ مرد کامل کہے جانے کا حقدار نہیں ہوتا۔ اس عمر کے انسان پر عربی زبان کے اعتبار سے مرد کا کبھی اطلاق نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ مرد کامل

لیکن ابوالفضل العباسؑ کے حالات کا تجزیہ گواہ ہے کہ وہ ایک مرد کامل تھے اور ان کی زندگی یقیناً ایسی تھی کہ انھیں مرد کامل کہا جائے۔

وہ علم و عرفان کے اعتبار سے بھی کامل تھے اور عزم و ہمت کے اعتبار سے بھی۔ .... فن حرب کے اعتبار سے بھی کامل تھے۔ اور جذبۂ خدمت کے اعتبار سے بھی۔ ان کا کمال ان کی میراث تھا۔ ان کے عزائم کی بلندی انھیں اب و جد سے ملی تھی۔

ان کے ارادوں کی پختگی ان کی آغوش تربیت کا عطیہ تھی۔ ان کا حوصلۂ جہاد ان کے نسل ابو طالب میں ہونے کا نتیجہ تھا۔

جنگ صفین

حضرت عباسؑ کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا پہلا موقع صفین کے میدان میں ملا۔ جب پدر بزرگوار نے خود اپنے فرزند کو ایک نئے انداز سے میدان جنگ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اور عباسؑ نے اپنے مکمل جوش و خروش کے ساتھ میدان جنگ میں قدم رکھا۔

صفین کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ جمل کی واضح شکست کے بعد حاکم شام نے یہ محسوس کر لیا کہ علیؑ کا اقتدار بڑھ چکا ہے اور اب یہ امکان قوی ہے کہ وہ مجھ

سے سخت ترین محاسبہ کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

اسلامی میزان و معیار پر میرا حساب دینا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

بہتر ہے کہ کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے علیؑ پر دوبارہ جنگ مسلط کر دی جائے تاکہ وہ خانگی مسائل میں مبتلا ہو کر جنگ کی تیاری میں مصروف ہو جائیں اور مختلف علاقوں کے عمال سے کوئی محاسبہ نہ کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ اس تحریک میں ہر باغی اور خائن عامل کا شامل ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کس بنیاد پر علیؑ کے مقابلہ میں کھڑے ہوں گے اور اپنی جان بچانے کی فکر کریں گے۔

علیؑ کی حکومت یا ان کی اسلامی تنظیم میں کوئی عیب نکالنا آسان کام نہیں ہے عیب نکالنا تو بڑی بات ہے، عیب تراشنا بھی ایک ناممکن سا امر تھا۔

حاکم شام نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ابھی قوم کے دل میں انتقامی جذبات زندہ ہیں بلکہ شدید تر ہو چکے ہیں۔

اب تک صرف قتل عثمان ہی کے انتقام کی بات تھی۔ اب مختلف گھرانوں میں جمل کے مقتولین کے ورثہ کا بھی ایک گروہ تیار ہے۔ ان سے بروقت فائدہ اٹھانا اور ان کے جذبات کو برانگیختہ کر کے اپنا مطلب نکال لینا وقت کی بہترین سیاست ہے۔

حاکم شام کے لئے کامیابی کی ایک راہ یہ بھی تھی کہ امیر المومنینؑ کا کوئی رابطہ اموی خاندان سے نہ تھا۔ ان سے محاسبہ بہت آسان تھا کہ آپ کا کوئی تعلق اس خاندان سے نہیں ہے۔ لہٰذا آپ خون عثمان کی وارث نہیں ہیں۔ اس کا حق صرف ان کی اولاد اور ان کے ورثہ کو پہنچتا ہے ———— لیکن حاکم شام کے ساتھ یہ کمزوری نہ تھی؟

"بہر حال اسی خاندان کا ایک فرد اور "چشم و چراغ" تھا۔ اسے یہ کہنے کا حق تھا

کہ میرے خاندان کا خون ہوا ہے۔ مجھے قاتل سے انتقام لینے کا حق ہے۔۔۔۔

اور امت بھی اس بات کو باور کر سکتی ہے۔

بھلا وہ امت جو بلا سبب عائشہ کا ساتھ دے سکتی ہو اور بیعت کے بعد علیؑ سے مقابلہ کر سکتی ہو۔ اس کے لئے معاویہ کی بات کے باور کر لینے میں کیا زحمت تھی؟

چنانچہ معاویہ نے خون عثمان کے نام پر "خون جمل" کے انتقام کی تیاری شروع کی۔۔۔ اور اپنے ہر عیب پر پردہ ڈالنے کا انتظام کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شام کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج تیار ہو گئی اور سارا لشکر مقام صفین کی طرف روانہ ہو گیا۔

امیر المومنینؑ کو اپنے علاقہ میں لشکر کے آنے کی اطلاع ملی تو آپ بھی ایک لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

راستے میں آپ کا گزر سرزمین کربلا سے ہو جہاں آپ نے ٹھہر کر آنسو بہائے اور اپنے فرزند حسینؑ کی شہادت کو یاد کر کے فرمایا۔

"صَبراً اَبا عَبدِ اللہ"

حسینؑ! تمہیں اس منزل پر صبر کرنا ہوگا۔

اصحاب حیران تھے کہ مولا یہ کیا فرما رہے ہیں۔ اور کیسے تلقین صبر کر رہے ہیں؟ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ راز کھل گیا۔ اور سنہ ۶۱ھ میں وہ موقع بھی آ گیا جسے یاد کر کے مولائے کائنات اشک افشانی فرما رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ جب مولائے کائنات نے اپنے فرزند حسینؑ کی مصیبت کو یاد کیا ہوگا۔ اور حسینؑ کے بچوں کی پیاس یاد آئی ہو گی تو عباسؑ کا خیال ضرور آیا ہوگا اور مولا کی نگاہوں میں وہ نقشہ بھی پھر گیا ہو گا جب ان کا یہ شیر فرات

کے کنارے پانی لینے جائے گا۔ اور ایک مشکیزۂ آب کی خاطر دونوں شانے کٹا کر ترائی میں ہمیشہ کے لئے سو جائے گا۔

ترائی پر شیر کا قبضہ ہوگا اور فرات شرم سے پانی پانی ہو جائے گا۔

میدان صفین کا سب سے پہلا حادثہ یہ تھا کہ معاویہ کی فوجوں نے پیش قدمی کرکے فرات پر قبضہ کر لیا اور اپنی جانب میں عثمان کا انتقام لینے کے لئے مولائے کائنات اور انکے سپاہیوں پر پانی بند کر دیا۔

اصحاب پانی سے سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے عرض کیا۔ مولا۔۔۔ اگر آپ اجازت دیجئے تو ابھی دشمن سے نہر آزاد کرالیں اور پانی پر قبضہ کرکے دشمن کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دیں۔

آپ نے فرمایا کہ فرات پر قبضہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ خوشی سے حملہ کرو اور اپنے پانی کا انتظام کرو۔

لیکن خبردار دشمن پر پانی بند نہ کرنا۔ یہ بات شرع اسلام کے خلاف ہے۔ اور علیؑ ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا جو شریعت اسلام کے قوانین سے مختلف یا اس کے مخالف ہو۔

دشمن کو علیؑ کے کردار پر مکمل اعتماد ہے۔۔۔۔۔۔ چنانچہ جب اسکی فوجوں نے شکایت کی کہ نہر پر علیؑ کا قبضہ ہو گیا ہے اور اب وہ ہم سے انتقام لے کر پانی بند کر دیں گے۔

اب ہماری زندگی کا سہارا کیا ہو گا۔؟ تو حاکم شام نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ علیؑ کا کردار نہیں ہے۔ تم پانی کی طرف سے قطعی طور پر مطمئن رہو جس وقت بھی علیؑ کے سامنے پانی کا سوال ہو گا وہ خود بخود پہرہ کو ہٹا لیں گے اور پانی کو لشکر کے لئے مباح کر دیں گے۔

دشمن کا اندازہ قطعی صحیح تھا۔ اس نے علیؑ کے آبائی کردار اور ان کے ذاتی کرم کا تجربہ کیا تھا؟

چنانچہ مولائے کائنات نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ دشمن دست سوال دراز کرے تو اسے پانی دیا جائے بلکہ آپ نے پہلے ہی اعلان کر دیا کہ میں پانی بند نہیں کروں گا؟ جیسے جیسے نہر سے سیراب ہونا ہے وہ بخوشی آئے اور سیراب ہو جائے۔

صاحب کبریت احمر ص۲۴ کا بیان ہے کہ فرات پر قبضہ کرنے میں حضرت عباسؑ بھی امام حسینؑ کے دوش بدوش جہاد کر رہے تھے۔ اور اس حملہ میں آپ کا بھی زبردست حصہ تھا۔

بھوک اور پیاس سے مرنا کمزور اور بدنفس سپاہیوں کا طریقہ ہے اور میدان جہاد میں تلوار کھینچ کر دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دینا مجاہد راہ خدا کا کردار ہے۔

اسی جنگ صفین میں صاحب کبریت احمر علامہ خراسانی نے حضرت عباسؑ کے جہاد کا حال بھی تحریر کیا ہے کہ لشکر امیرالمومنینؑ سے ایک جوان چہرہ پر نقاب ڈالے ہوا برآمد ہوا۔

ہیبت و جلالت کے آثار نمایاں۔۔۔۔۔ شجاعت و ہمت کے علامات ظاہر۔۔۔۔۔ تقریباً ۱۷ سال کی عمر۔۔۔۔۔ میدان جنگ میں آکر مبارز طلبی کی۔۔۔۔۔۔۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ معاویہ نے ابن الشعثاء کو بلا کر اس سے مقابلہ کرنے کے لئے کہا۔

اس نے کہا کہ میرا شمار عرب کے عظیم بہادروں میں ہوتا ہے جو ہزاروں سے تنہا لڑا کرتے ہیں۔

میرا جانا باعث ذلت و رسوائی ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ میں اپنے کسی بیٹے کو بھیج دوں۔ اور وہ اس کا کام تمام کر دے یہ کہہ کر اس نے اپنے بیٹوں کو ایک ایک کر کے میدان میں بھیجنا شروع کیا اور جب سب تہہ تیغ ہو گئے تو ابن الشعثاء کو غصہ آگیا اور وہ خود میدان جنگ میں آگیا۔ علیؑ کے شیر نے اسے بھی ایک حملے میں اس کے ساتوں بیٹوں سے ملا دیا۔

اب میدان جنگ میں شیر کی ہیبت کا قبضہ تھا۔ اور کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔

لوگ اس بے نظیر شجاعت کو دیکھ کر یہی سمجھ رہے تھے کہ حیدرِ کرار جہاد کر رہے ہیں۔ لیکن جب نقاب رخ الٹا تو اندازہ ہوا کہ علیؑ نہیں ہیں علیؑ کا شیر ہے۔ حیدرِ کرار نہیں ہیں حیدرِ کرارؑ کا وارث دار ہے۔

علامہ موصوف نے واقعہ کو درج کرنے میں اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ کچھ لوگوں کی نگاہ میں واقعہ قرین قیاس نہیں ہے اور وہ کمسنی میں حضرت عباسؑ کے جہاد کو بعید از قیاس سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ ایک مردِ کامل اور ۱۷ سال کے جوان تھے اور حیدرِ کرار کی شجاعت کے ورثہ دار بھی تھے۔

آپ کے مردِ کامل ہونے کا ثبوت علامہ خوارزمی کی یہ عبارت ہے۔

"خرج من عسکر معاویہ رجل یقال لہ کریب کان شجاعا قویا یاخذ الدرھم فیغمزہ با بھامہ فتذھب کتابتہ فنادیٰ لیخرج الی علی فبرز الیہ مرتفع بن وضاح الزبیری فقتلہ ثم برز الیہ شرجیل بن بکر فقتلہ ثم برز الیہ الحرث بن الحلاج الشیبانی فقتلہ فساء امیرالمومنین ذلک فدعیٰ ولدہ العباس علیہ السلام

وکان قاما کاملا من الرجال وامرہ ان ینزل عن فرسہ و ینزع ثیابہ فلبس علیؑ ثیاب ولدہ العباس ورکب فرسہ والبس ابنہ العباس ثیابہ وارکبہ فرسہ لئلا یجبن کریب عن مبارزتہ اذا عرفہ فلما برز الیہ امیرالمومنین ذکرہ الاٰخرۃ و حذرہ باس اللہ وسخطہ فقال کریب لقد قتلت لسیفی ھذا کثیرا من امثالک ثم حمل علی امیرالمومنین فاتقاہ بالدرقۃ وضربہ علیؑ علی راسہ فشقہ نصفین درجع امیرالمومنین وقال لولدہ محمد بن الحنفیہ قف عند مصرع کریب فان طالب وترہ یاتیک فامتثل محمد امرابیہ فاتاہ احد بنی عمہ وسالہ عن قاتل کریب قال محمد انا مکانہ فتجاولا ثم قتلہ محمد وخرج الیہ آخر فقتلہ محمد حتی اتیٰ علی سبعۃ منہم (مناقب خوارزمی ص ۱۴۷)

معاویہ کے لشکر سے کریب نامی ایک بہادر برآمد ہوا جس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ انگلی سے درہم کو دبا کر دیا کرتا تھا۔ تو اس کے نقوش مٹ جاتے تھے۔ اس نے میدان میں آکر حضرت علیؑ سے مبارزہ طلبی کی۔ آپ کی طرف سے مرتفع بن وضاح زبیدی نکلے۔ اس نے انھیں قتل کر دیا۔

اس کے بعد شرجیل بن بکر نکلے۔ وہ بھی قتل ہو گئے۔ اس کے بعد حرث بن صلاح شیبانی برآمد ہوئے وہ بھی قتل ہو گئے۔

امیرالمومنینؑ کو یہ بات سخت گراں گزری اور آپ نے اپنے "فرزند" عباسؑ کو بلایا جو تمام ذمرد کامل تھے۔ اور انھیں حکم دیا کہ گھوڑے سے اتر کر اپنا لباس جنگ اتار دو انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔

آپ نے ان کا لباس زیب تن فرمایا اور انھیں اپنا لباس پہنا دیا تاکہ دشمن مقابلے سے گھبرائے نہیں۔

اس کے بعد میدان میں آکر خدا کی یاد دلائی اور عذاب آخرت سے ڈرایا کریب نے اکڑ کر کہا میں نے اپنی اس تلوار سے آپ جیسے کتنوں کو تہہ و تیغ کر دیا ہے اور یہ کہہ کر حضرت پر حملہ کر دیا۔ آپ نے وار خالی دے کر ایک وار کیا اور اسے دو ٹکڑے کر دیا۔

واپس آتے ہوئے آپ نے محمد حنفیہ سے فرمایا کہ تم اسی جگہ ٹھہرے رہو ابھی اس کا وارث آرہا ہے۔

محمد تعمیل حکم میں ٹھہرے۔ تھوڑی دیر میں اس کا ایک عزیز آگیا۔ اس نے پوچھا۔ کریب کا قاتل کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ فی الحال تو اس کی جگہ پر میں ہوں۔ اس نے یہ سن کر حملہ کر دیا۔ آپ نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر ایک دوسرا شخص آیا۔ آپ نے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہاں تک کہ سات آدمی نکل کر آئے اور سب کے سب فنا ہو گئے۔

اس عبارت سے حضرت عباسؑ کا مرد کامل ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس کے بعد محدث نوری کے اس ارشاد کا کوئی محل نہیں رہ جاتا کہ یہ واقعہ عباس بن حارث کا ہے۔ حضرت عباسؑ کا ذکر اشتباہاً ہو گیا ہے۔

عباس بن حارث کا واقعہ اپنے مقام پر ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دوسرا واقعہ غلط ہے۔ ایک میدان میں ایک طرح کے دو واقعات کا پیش

آنا نہ محال ہے اور نہ ہی خلاف قیاس۔

صاحب کتاب "قمر بنی ہاشم"، علامہ عبدالرزاق مقرم اور صاحب "ذکر العباس"، نجم الواعظین مولانا نجم الحسن کراروی نے اس واقعہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے اور برادر محترم طالب ثراہ نے کبریت احمر سے اس کے متعلقات کو بھی نقل کیا ہے۔ اور مسئلہ کی مکمل تنقیح کر کے ایک ایک جزو پر بحث کی ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ کا کسی واقعہ کو نظر انداز کر دینا اس کے بے بنیاد ہونے کی دلیل نہیں ہے مگر یہ بات تو بہرحال غور طلب ہے کہ ان حضرات نے جن روایات سے استدلال کیا ہے اسکی بنیادوں سے خود بھی متفق ہیں یا نہیں؟

صاحب کبریت احمر نے حضرت عباسؑ کی عمر کا اندازہ تقریباً ۱۱ سال لکھا ہے اور علامہ خوارزمی نے صرف مرد کامل کہا ہے۔ سن کا کوئی اندازہ نہیں بتایا۔

ظاہر ہے کہ حضرت عباسؑ کی عمر کسی قیمت پر ۱۱ سال[1] نہیں تھی۔ آپ کی ولادت سنہ ۲۶ھ میں ہے۔ اور جنگ صفین کا خاتمہ سنہ ۳۷ھ میں ہوا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کی عمر دس ساڑھے دس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہے۔

---

[1] اس مقام پر ایک دلچسپ بحث یہ ہے کہ میرے ایک "کثیر المطالعہ" مخلص نے ایک مرتبہ یہ اعتراض کیا تھا کہ کربلا کے میدان میں حضرت عباسؑ کی عمر شریف ۳۲ یا ۳۴ سال بالکل غلط بتائی جاتی ہے۔ مولائے کائنات نے جناب ام البنینؑ سے کوفہ میں عقد کیا ہے۔

میں نے اس وقت روا روی میں ان سے حوالہ دریافت نہیں کیا تھا اور نہ اس موضوع پر کوئی گفتگو ہو سکی تھی۔ اس وقت ۵۔۶ سال کے بعد جب اس موضوع پر تالیف کی نوبت آئی تو یہ بھی یاد آیا اور ضروری معلوم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۰ پر)

خود کربلا میں سنہ ۶۱ھ میں آپ کی عمر ۳۴ سال کی بتائی جاتی ہے جس میں سے سنہ ۳۷ھ کم کرنے کے بعد ۱۱ سال سے زیادہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔"

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۹ سے آگے)

ہوا کر اس کی مختصر تحقیق بھی کر دی جائے۔

جہاں تک "ارباب تحقیق" کا تعلق ہے۔ انھوں نے حضرت عباسؑ کی ولادت سنہ ۲۶ھ ہی میں نقل کی ہے۔ کوفہ میں عقد کا تذکرہ کسی معتبر روایت یا کتاب میں نہیں ہے۔

اس کے علاوہ چند قرائن ہیں جو حضرت عباسؑ کی عمر کی تعین اور حضرت ام البنین کے عقد کے بارے میں واضح فیصلہ کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ حضرت ام البنین کا عقد حضرت عقیل کی "جستجو" سے ہوا تھا اور مولائے کائنات نے پہلے انھیں سے مشورہ کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ حضرت عقیل سے یہ مشورہ مدینہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ کوفہ میں ایسے حالات کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تاریخ نے جناب ام البنینؑ کی آمد کا نقشہ اس انداز سے کھینچا ہے کہ بیت الشرف میں قدم رکھنے کے بعد شہزادوں سے عرض کی بچو میں تمہاری ماں بن کر نہیں آئی ہوں۔ تم مجھے اپنی مادر گرامی کی ایک کنیز تصور کرو

کھلی ہوئی بات ہے کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی عمریں ۳۲۔۳۳ سال تھیں اور اس عمر کے انسان کو کسی اعتبار سے بچہ نہیں کہا جا سکتا۔ سنہ ۲۶ھ میں بھی امام حسنؑ اور امام حسینؑ بچے نہیں تھے لیکن نوجوانی پر یہ بات کسی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے ۳۲۔۳۳ کی عمر میں نہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۱ پر)

کبریت احمر کا بیان کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو اس کی بنیاد بہر حال کمزور ہے۔ خود مناقب خوارزمی کی روایت میں بھی حضرت عباسؑ کو "مرد کامل" کہا گیا ہے جو معنوی اعتبار سے قطعاً صحیح ہے۔ لیکن ظاہری اعتبار سے قابل غور ہے۔ لاسیما

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰ سے آگے)

تیسری بات یہ ہے کہ بعض مورخین نے جناب ام البنین کے عقد کو جناب امامہ سے پہلے لکھا ہے۔ اور جنابہ امامہ کا عقد مدینہ میں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ ام البنین کا عقد کوفہ میں ہوا ہو۔

جناب امامہ کے مدینہ میں عقد کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ان کے بارے میں صدیقۂ طاہرہ کی وصیت تھی کہ وہ میرے بچوں کا زیادہ خیال رکھتی ہے اور ان کی بہتر نگہداشت کر سکتی ہے۔

ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ مولائے کائنات اس عقد میں اس قدر تاخیر فرمائیں کہ بچے جوانی کی منزل میں آجائیں اور نگہداشت کی کوئی ضرورت ہی نہ رہ جائے۔

چوتھا اور اہم ترین ثبوت یہ ہے کہ صاحب عمدہ نے صادق آل محمدؐ سے حضرت عباسؑ کے فضائل کے ذیل میں نقل فرمایا ہے۔

قُتِلَ وَلَهُ اَرْبَعٌ وَّثَلٰثُوْنَ سَنَةً۔

آپ نے ۳۴ سال کی عمر میں شہادت پائی ہے۔

اس صریحی بیان کے ہوتے ہوئے یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ مولائے کائنات کا یہ عقد کوفہ میں ہوا ہو۔ جب کہ کوفہ میں متولد ہونے والا فرزند کربلا میں ۳۴ سال کا نہیں ہو سکتا۔

بقیہ حاشیہ ص ۲۵۲ پر

کی عمر میں انسان مرد کامل ہوگا تو ۳۴ سال کی عمر میں کیا ہوگا ؟

ناسخ نے آپ کے بارے میں یہ جملہ ضرور نقل کیا ہے کہ :- اَلْفَرَسَ الْمُطَہَّم وَرِجْلَاہُ (آپ جب اسپ دورکابہ پر سوار ہوتے تھے تو آپ کے پیر زمین پر خط دیتے تھے۔")

لیکن یہ آخری دور کا تذکرہ ہے اس کا کوئی تعلق دس برس کی عمر سے نہیں ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ پھر تبدیلیٔ لباس کے بارے میں کیا کیا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور عباسؑ کا لباس امیرالمومنینؑ کے جسد اقدس پر کیوں کر درست ہوگیا؟ تو اس کے بارے میں برادر محترم طالب ثراہ نے کافی تفصیل دی ہے اور ایسے لوگوں کی طویل فہرست بیان کی ہے جن کا قد و قامت ۲۵ ہاتھ کے قریب تھا اور ان میں بعض

بہرحال مذکورہ بالا دلائل کے تاریخی اور روایتی حوالے کتاب کے مختلف مقامات پر آچکے ہیں۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ارباب ذوق نظر فرما سکتے ہیں۔

جناب عباسؑ کا میدان صفین میں موجود ہونا ایک تاریخی امر ہے جس کا تذکرہ علامہ خوارزمی نے "مناقب" میں کیا ہے اور کبریت احمر نے بھی اپنے طور پر نقل کیا ہے۔ اس کو مشکوک بنانے کے لئے کوتہ میں عقد کی داستان اور اس پر زور دینے کے لئے ۱۷ سال کی عمر ثابت کرنا بھی غیر ضروری ہے بنی ہاشم کے بچے کمسنی میں بھی وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں جو دوسرے گھرانوں کے جوان انجام نہیں دے سکتے۔

(جوادی)

حضرات عباسؑ کے ننہالی بزرگوں میں بھی تھے۔ جس سے یہ حساب لگایا گیا ہے کہ اگر ۴۰ سال کا آدمی ۲۵ ہاتھ کا ہوگا تو ۱۰ سال کا آدمی ۶½ ہاتھ کا ضرور ہوگا۔ یا کم از کم ایک اچھے خاصے قد و قامت کا ہوگا اور حضرت علیؑ میانہ قامت انسان تھے۔ ان کے لباس کا عباسؑ کے جسم پر منطبق ہو جانا تعجب خیز نہیں ہے۔

واقعہ اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن حساب کا یہ اندازہ نہایت درجہ دلچسپ ہے۔ ۴۰ سال کی عمر غالباً اس لئے فرض کی گئی ہے کہ یہ عام انسانی نشو و نما کا آخری دور ہوتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے ہر عمر کے قد و قامت کا حساب لگایا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نشو و نما کے مسائل کو اسی انداز سے "ہندسی" اعداد و شمار سے طے کیا گیا تو نتیجہ میں ہر سال ایک الگ قد و قامت فرض کرنا پڑے گا اور انسانی قد و قامت کا حساب بنات نات جیسا ہو جائے گا۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے اور انسانی جسامت کا حساب اس سے قطعی مختلف ہے۔

حقیقت صرف یہ ہے کہ بنی ہاشم کے کمسن مجاہد کا میدان جہاد میں آکر داد شجاعت دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جس گھرانے کا ۱۳ سال کا قاسم ازرق شامی کے سات بیٹوں کو تہ تیغ کر سکتا ہے۔ اس گھرانے کا عباسؑ ابن الشعثاء کے سات بیٹوں کو بھی واصل جہنم کر سکتا ہے۔!

عقلی امکان کے ہوتے ہوئے اس روایت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جو کسی مذہبی مسلمہ کے خلاف نہ ہو اور یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد نہ قد و قامت کے حساب کی ضرورت ہے اور نہ سترہ سال کا سن فرض کرنے کی ضرورت ہے تبدیلیٔ لباس کے امکان کے لئے حضرت علیؑ کا درمیان میں ہونا بہت کافی ہے۔

حضرت عباسؑ اور امیر المومنینؑ کے درمیان تو نشو و نما کا تفاوت فرض بھی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؑ اور رسول اکرمؐ میں تو کوئی ایسا بھی تفاوت نہیں تھا۔ . . .

حالانکہ ہجرت کی رات ۲۳ سال کے علیؑ ۵۳ سال کے رسولؐ کے بستر پر سو رہے تھے۔ اور قیافہ شناسان عرب کو رات بھر یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ نبی سو رہے ہیں یا علیؑ؟

امیر المومنینؑ کا صاحب اعجاز ہونا ہر مسئلہ کا حل ہے۔ آپ کو ساری کائنات کی طرح اپنے قد و قامت پر بھی مکمل اختیار تھا اور جب چاہتے مصلحت اسلام کیلئے اسی قد و قامت میں ظہور فرما سکتے تھے۔ اس کے لئے کسی اور حساب کی ضرورت نہیں ہے۔

عباس بن حارث کا نام غالباً اس لئے آگیا ہے کہ کریب سے پہلے انھیں سے مقابلہ ہوا تھا۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ عباسؑ کا لباس پہن کر میدان جنگ میں تشریف لائے تھے اور اس کا کام تمام کیا تھا۔

صفین کے میدان میں حضرت عباسؑ کے دو مشاہدات انسانی زندگی کے بہت قیمتی مشاہدات ہیں۔

پہلا موقع وہ جب جنگ کے دوران مولائے کائنات نے صفوں کے درمیان مصلیٰ بچھایا اور ابن عباس نے بڑھ کر دریافت کیا۔ مولا یہ تو وقت جنگ ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں!

"اِنَّمَا نُقَاتِلُهُمْ عَلَى الصَّلٰوةِ"

ہم ان سے اسی نماز کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔

جنگ و جدال کے ایسے نازک وقت میں صفوں کے درمیان مصلیٰ بچھا دینا۔

اور بغیر کسی انتظام کے بارگاہ احدیت میں سجدہ ریز ہو جانا اس بات کا اعلان ہے کہ مقام عبدیت کسی اہتمام کا محتاج نہیں ہے۔ جب جہاں اور جس وقت موقع مل جائے انسان کو بارگاہ بے نیاز میں سر نیاز خم کر دینا چاہیئے۔

یہ انداز تعلیم عام انسانوں کے ذہن پر اثر انداز ہو یا نہ ہو۔ . . . . .

اس ذہن پر یقیناً اثر انداز ہوگا جس کی ساخت پرداخت کا مکمل انتظام مولائے کائنات نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور جسے اپنے جذبات کا آئینہ دار بنانا چاہتے تھے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کربلا کے شدید ترین ماحول میں بھی نماز کا اہتمام کرنے کی خاطر عباسؑ جیسے بہادر نے دشمن کے ناروا کلمات کو برداشت کر لیا اور کوئی اقدام نہیں کیا۔

جب کہ حبیبؓ جیسا مخلص چاہنے والا اسے برداشت نہ کر سکا۔ . . .

علیؑ کے گھرانے کے شیدائی اور علیؑ کے آغوش کے پروردہ کا یہی ایک نمایاں فرق ہے امام حسینؑ کا دو اصحاب کو آگے کھڑا کر دینا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کربلا کے جذبات صفین کے جذبات سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں کا صحابی اصل نماز پر حیران و ششدر تھا تو کس کے لئے جماعت کا اہتمام کیا جاتا اور کسے سینہ سپر بنایا جاتا۔

اور یہاں کے اصحاب نماز کے لئے بے چین ہیں۔ اب کیسے ممکن ہے کہ انھیں نظر انداز کر کے فرادیٰ نماز ادا کر لی جائے۔

یا دشمن کے پے در پے حملوں کے باوجود نماز مکمل کی جا سکے۔ یہاں محافظ اصحاب کا بندوبست کرنا یقیناً ضروری تھا۔

امیر المومنینؑ کے لئے یہ انتہائی اذیت ناک لمحہ تھا۔ قرآن کریم کی مخالفت

کریں تو اپنے مقصد کی پامالی بھی ہو اور دشمن کا منصوبہ بھی کامیاب ہو جائے کہ علیؑ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور ان قرآنوں کے مقابلہ میں سپر انداختہ ہو جائیں تو دشمن کے مکر و دغا کی کھلی ہوئی کامیابی تصور کی جائے گی۔

آپ نے اپنے حسن تدبیر سے ایک درمیانی راستہ یہ نکالا کہ پہلے اپنی فوج کو شامی مکر کی حقیقت سے باخبر کیا۔ اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ اُن میں جہاد راہ خدا کا حوصلہ نہیں ہے اور یہ ادنیٰ بہانے سے جنگ ملتوی کر دینا چاہتے ہیں تو آپ نے حفاظتِ عزت قرآن کے خیال سے جنگ روک دی۔

جنگ روک دینا بھی مولا کے حق میں کچھ کم "مضر" نہیں تھا۔ وقت وہ ہے جب شام کی بہکائی ہوئی ایک جماعت یقیناً یہ کہنے پر آمادہ ہو جائے گی کہ علیؑ نے جیتی ہوئی جنگ کو از خود شکست خوردہ بنا دیا۔ لیکن آپ نے احترام قرآن کی خاطر یہ بھی برداشت کر لیا۔

جنگ کے روک دینے میں آپ کی "سیاست آلٰہیہ" کی ایک عظیم کامیابی یہ ہوئی کہ اس طرح حاکم شام کو قرآن حکیم کا پابند بنانے کا موقع مل گیا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے ہر طرز عمل پر قرآن حکیم کی روشنی میں تنقید کرنے کا جواز حاصل ہو گیا

چنانچہ قرآن حکیم کو معیار بنا کر خلافت کے فیصلے پر طرفین کا اتفاق ہو گیا ——— یہ اور بات ہے کہ آخر میں نام قرآن کے بجائے پھر حکمین کی رائے پر فیصلہ ہو گیا اور تخت و تاج حاکم شام کے قبضہ میں چلا گیا۔ علیؑ کے حصے میں صرف نہروان کے باغیوں سے مقابلہ آیا۔

حالات جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن امت اسلامیہ آج بھی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والے کو جائز حاکم نہیں تصور کیا جا سکتا

تخت و تاج کی تاریخ ہی یہ ہے کہ یہ ہمیشہ حق کے قبضہ میں نہیں رہا۔ ۔ ۔ ۔ یہ کبھی باطل کے ہاتھوں میں رہتا ہے تو کبھی حق کے قدموں میں۔ صرف حقانیت ہے جو کبھی باطل کے قبضہ میں نہیں آ سکا۔

مولائے کائنات کا کردار آج بھی آواز دے رہا ہے کہ کل وقتی طور پہ مجھے "شکست خوردہ"، ضرور کہہ دیا گیا تھا اور مجھ پر سیاست سے ناواقفیت کا الزام ضرور لگا دیا گیا تھا لیکن آج حق و انصاف کی تاریخ پڑھو۔ حاکم شام اپنے دام میں خود اسیر ہو گیا ہے۔ علیؑ نے قرآن حکیم کا احترام کر کے شام کے تخت و تاج کی عزت کو قیامت تک کے لئے خاک میں ملا دیا ہے۔

عباسؑ کے پیش نظر احترام مذہب اور سیاست آلٰہیہ کے یہ تمام مشاہدات تھے اور آپ کو مستقبل میں انھیں مناظر کو دہرانا تھا۔ کربلا کی تاریخ میں عباسؑ کے جذبات انھیں مشاہدات کے آئینہ دار تھے۔

جذبۂ فدا کاری

وراثتی صفات و کمالات کے علاوہ حضرت عباسؑ کو ایک ایسا مقدس ماحول اور ایسی طیب و طاہر آغوش بھی ملی تھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں ناممکن ہے۔

امیر المومنینؑ نے آپ کی تربیت میں ایک امتیازی انداز رکھا تھا اور ابتدا سے

حیات سے برابر اس امر کی طرف متوجہ کرتے رہے کہ تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے مہیا کیا گیا ہے اور تمہارا مقصد حیات شہادت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

چنانچہ بچپن کا عالم تھا۔ جناب ام البنینؑ تشریف فرما تھیں۔ ایک مرتبہ مولائے کائنات نے اپنے فرزند عباسؑ کو گودی میں بٹھایا اور آستینوں کو الٹ کر بازوؤں کو بوسہ دینے لگے۔ ام البنین نے آپ کا یہ انداز محبت کو دیکھ کر عرض کی! مولا یہ کیسا طریقۂ محبت ہے۔ یہ بازوؤں کو بوسے کیوں دیئے جا رہے ہیں؟ یہ آستینیں کیوں الٹی جا رہی ہیں۔

آپ نے فرمایا ام البنین۔ تمہارا یہ لال کربلا میں شہید ہوگا۔ اس کے شانے قلم ہوں گے۔ پروردگار اسے دو پر عنایت کریگا جس سے یہ جعفر طیار کی طرح جنت میں پرواز کریگا۔

علامہ مقرم بحوالہ "قمر بنی ہاشم فارسی، زندگانی قمر بنی ہاشم
عماد زادہ اصفہانی۔

یہ وہ نازک لمحہ ہے جہاں ماں کے سامنے ایک طرف بچے کی شہادت ہے اور دوسری طرف جنت الفردوس۔

دل دھڑکتا ہے۔ اور پھر ٹھہر جاتا ہے۔ چہرے پر حزن والم کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور مسرت کے علامات یکسر بدل جاتے ہیں۔

مولائے کائنات عباسؑ کو مستقبل سے باخبر کرنے کے ساتھ دنیا کو متوجہ کر رہے ہیں کہ ہمارے گھر کے بچے حالات میں گرفتار ہو کر قربانی نہیں دیا کرتے وہ آغاز حیات سے قربانی کے لئے تیار کر دیئے جاتے ہیں۔

حضرت علیؑ کا دیا ہوا جذبۂ فدا کاری ہر آن عباسؑ کے پیش نظر رہا اور انہوں نے ہر موقع پر بڑے سے بڑے خطرہ کے لئے اپنی جان کو پیش کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ

امام حسینؑ کا معاملہ آگیا تو عباسؑ کسی قیمت پر خاموش نہ رہ سکے صفین میں نہر پر جانا ہوا تو عباسؑ کھڑے ہو گئے۔ گھر میں پانی پلانے کا وقت آیا تو عباسؑ کمر بستہ ہو گئے۔ زندگی کا ہر لمحہ خدمت اسلام کے لئے اس طرح وقف کر دیا کہ:۔

"أَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِيدِ مُحَمَّدٍ"

کی حقیقی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگی۔

وقتِ آخر

مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے روز اول سے عباسؑ کو جو مقصد حیات تعلیم کیا تھا، آخر وقت تک اسی کا لحاظ رکھا اور وقتاً فوقتاً اپنے لال کو مقصد کی عظمت کی طرف متوجہ کرتے رہے اور خود عباسؑ بھی اپنی ذاتی بلند کرداری کے سبب امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر رہے۔

یہاں تک کہ ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ کا زمانہ آیا اور ابن ملجم کی تلوار سے مسجد کوفہ میں امیر المومنینؑ زخمی ہوئے۔

۱۹ رمضان المبارک۔ صبح کا ہنگام ہے۔۔۔ فضا میں ایک کہرام برپا ہے کائنات کا امیر مسجد میں زخمی ہو گیا ہے اور اب زہر کے اثر سے بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ شامی حکومت کا مدعا پورا ہو چکا ہے اور امت اپنے عظیم رہنما سے محروم

ہو رہی ہے۔ . . . وقت کے ساتھ ساتھ زہر کا اثر بڑھتا جا رہا ہے کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی ہے اور ہر علاج بے کار ثابت ہو رہا ہے۔

دیکھتے دیکھتے وہ لمحہ بھی آگیا جب زندگی کے آخری لمحات آگئے اور جراح نے زخم کی گہرائی کا اندازہ کر کے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ مولا! اب آپ وصیتیں فرمائیں۔

وصیتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسلامی احکام۔ تقویٰ الٰہی۔ تحفظ دین کی تلقین کرتے ہوئے خاندان کی ایک ایک فرد کو الوداع کہا اور سب کا ہاتھ امام حسنؑ کے ہاتھ میں دیدیا۔ ایک عباسؑ باقی رہ گئے۔ جن کی طرف مولا نے بظاہر کوئی توجہ نہیں فرمائی۔

بچے کا دل تڑپا۔ دوڑ کر مادر گرامی کی خدمت میں آیا۔ مادر گرامی غضب ہو گیا بابا نے سب کا ہاتھ امام حسنؑ کے ہاتھ میں دیا اور میری طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ کیا میں ان کا لال نہیں ہوں؟

ماں نے اپنے لال کا ہاتھ پکڑا اور لے کر مولا کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ . . .

" والی! آپ کے اس فرزند سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟ آپ نے اس کا ہاتھ امام حسنؑ کے ہاتھ میں کیوں نہیں دیا؟

حضرت کا دل تڑپ گیا۔ آنکھیں کھولیں۔ نگاہ حسرت سے عباسؑ کے چہرے کو دیکھا۔ فرمایا آؤ میرے لال! یہ کہہ کر عباسؑ کو قریب بلایا اور امام حسنؑ کے بجائے امام حسینؑ کو نزدیک بٹھا کر عباسؑ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ فرمایا عباسؑ! میں نے سب کو حسنؑ کے حوالے کیا ہے اور تجھے حسینؑ کے حوالے کیا ہے۔

ریاض القدس، مائتین۔

اب عباسؑ کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔ ۱۴ سال کی عمر کوئی معمولی عمر نہیں ہوتی ہے

جو بچہ ابتدائے عمر سے اس قدر حساس اور ہوشمند رہا ہو کہ آغوش پدر میں بیٹھ کر توحید کے حقائق کا اعلان کرتا ہو۔ جس کی پرداخت میں مولائے کائنات نے خاص اہتمام برتا ہو اور اپنی خصوصی نگرانی سے اسے پروان چڑھایا ہو اس کا ۱۴ سال کے سن میں کیا عالم ہوگا۔ اور اس کے جذبات کس منزل پر ہوں گے۔ اس کا اندازہ ہر صاحب ہوش کر سکتا ہے۔

عباس نے اس وصیت کو محفوظ کر لیا اور اس طرح نبھایا کہ جس طرح کائنات کا عظیم ترین انسان اپنے عظیم ترین باپ کی وصیت کو پورا کر سکتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب عاشور کی رات[عہ] زہیر قین نے یاد دلایا۔ اور کہا عباسؑ! آپ کو یاد ہے کہ آپکے پدر بزرگوار نے آپ کو کس دن کے لئے مہیا کیا ہے؟" تو عباسؑ نے اس طرح انگڑائی لی کہ رکابیں ٹوٹ گئیں اور فرمایا۔

" اَتُشَجِّعُنِیْ فِیْ مِثْلِ هٰذَا الْیَوْمِ یَا زُهَیْر "

زہیر آج کے دن شجاعت دلا رہے ہو۔

عاشورہ کی رات تمام ہونے دو۔ اور صبح کا وقت آنے دو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ بیٹے نے باپ کے مقصد کو کس انداز سے پورا کیا ہے۔ اور عباسؑ اپنے عہد وفا پر کس طرح قائم ہے۔

عہ بعض روایات میں یہ واقعہ صبح عاشور کے سلسلے میں درج کیا گیا ہے؟

نص و اجتہاد

بہت جلد شائع ہو رہی ہے

تصنیف

علامہ سید عبدالحسین الموسوی

ترجمہ

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

ملنے کا پتہ

محمد انعام نقوی - مذہبی دنیا ۲۲۱ رانی منڈی الہ آباد

منزل دوم

جمل و صفین کے معرکے تمام ہو چکے ہیں۔ تحکیم کے تلخ تجربات نگاہوں کے سامنے ہیں ــــــ مسلمان اپنے امیر کی اطاعت نہ کرنے کا انجام دیکھ رہے ہیں شام کی حکومت کو "استحکام" حاصل ہو چکا ہے اور نہروان کی بغاوت کا سلسلہ تمام ہو چکا ہے۔

مولائے کائنات کی شہادت کے اجتماعی اور سیاسی اثرات کے سامنے ہیں۔ اور تاریخ ایک ایسے موڑ پر آچکی ہے۔ جہاں قتل عثمان کا سہارا لے کر صفین کا میدان کارزار گرم کرنے اور ہزاروں افراد کو موت کی بھینٹ چڑھا دینے والا حاکم صلح کا پیغام دے رہا ہے۔

تقاضہ یہ ہے کہ اگر علیؑ کے وارث حقیقی امام حسنؑ تخت و تاج کو حاکم شام کے حوالے کر دیں تو جنگوں کا یہ طویل سلسلہ ختم ہو سکتا ہے اور خون ریزیوں پر ایک باندھ

باندھا جا سکتا ہے۔

امام حسنؑ کے سامنے اسلام کے اعلیٰ ترین مصالح ہیں ——— انھیں ایک "عام" بیٹے کی طرح اپنے باپ کے دشمن اور قاتل سے کسی قیمت پر صلح نہیں کرنی چاہیئے اور بہر طور اس سے انتقام لینا چاہیئے۔

اگر معاویہ عثمان کا وارث نہ ہونے کے باوجود ان کا "موہوم" قصاص لے سکتا ہے تو امام حسن تو بہر حال حضرت علیؑ کے وارث اور جانشین ہیں۔ انھیں حق قصاص سے کون روک سکتا ہے۔

شہادت امیر کے سماجی اثرات بھی کسی حد تک مدد دینے کو تیار ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ صفین و نہروان کی "زخم خوردہ" فوج بھی ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جائے اور اپنے مقتولین کے انتقام کے طور پر ہی حکومت شام کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائے

لیکن امام حسنؑ نے یہ کچھ نہ کیا ——— اور صلح کے پیغام کو فوراً قبول کر لیا

گویا آپ اپنے کردار سے دنیا کو متوجہ کر رہے تھے کہ مجھے "ایک بیٹے کی حیثیت" سے وہی کرنا چاہیئے تھا جو دنیا والوں کا خیال ہے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ میں علیؑ کا ایک فرزند ہونے کے ساتھ دین کا محافظ اور رسولِ اکرمؐ کا خلیفۂ برحق بھی ہوں۔ میرے سامنے انتقام "خونِ ناحق" سے بالاتر مقاصد بھی ہیں اور ان مقاصد کی راہ میں یہ ساری قربانیاں برداشت کی جا سکتی ہیں۔

امام حسنؑ کا صلح پر آمادگی ظاہر کرنا تھا کہ شام میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ——— یہ مسرت اس بات کی نہیں ہے کہ "تحریک صلح" کامیاب ہو گئی۔ مسرت اس بات کی ہے کہ تخت و تاج کے سلسلہ میں اپنا فریب کام آ گیا اور حکومت کسی زحمت کے بغیر

اپنے ہاتھ میں آ گئی۔

امام حسنؑ کے پیش نظر خون ریزیوں کے اثرات تھے۔ آپ علم امامت کی بناء پر حالات سے مکمل طور پر واقف تھے۔ اس لئے جنگ کے نتیجہ میں "فسادِ مذہب" کا نقشہ دیکھ کر آپ نے صلح کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔

اور نہ جانے حالات کا تقاضہ کیا تھا کہ حاکم شام نے صلح کے لئے کوئی شرط مقرر نہیں کی اور یہ طے کر دیا کہ سادے کاغذ پر جو شرط امام حسنؑ تحریر کر دیں گے میں اسے منظور کر لوں گا۔

امام حسنؑ کے سامنے اسلام کی عظیم ترین مصلحت یہ تھی کہ ایسے سنہرے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسلام کو صلح نامہ کی شکل میں تیا دت کا ایک دستور دیدیا جائے اور دنیائے اسلام کو متوجہ کر دیا جائے کہ اس دور کے حالات کیا ہیں اور حکام جور کس کردار کے مالک ہیں۔

صلح نامہ مرتب کیا گیا اور نہایت "سادہ" شرطیں رکھی گئیں۔

کتاب و سنت پر عمل کرنا ہو گا۔

مولائے کائنات پر سب و شتم کا سلسلہ بند کرنا ہو گا۔

کوئی خون ریزی نہ ہو گی۔

معاویہ اپنے بعد کے لئے کسی کو حاکم نہ بنائے گا۔

حاکم شام نے بظاہر صلح نامہ کو منظور کر لیا اور تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔

یہ بات نہ محتاج تشریح ہے اور نہ محتاج بیان۔ کہ حکومت شام نے صلح نامہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ اور حاکم شام نے اسے پیروں تلے کس طرح روند ڈالا۔ تحقیق طلب بات صرف یہ ہے کہ ایسے حالات میں "صلح و اتفاق" فتح ہے یا

شکست ؟

"ظاہر بین افراد یہی خیال کرتے ہیں کہ امام حسنؑ نے تخت و تاج سپرد کر کے اپنی شکست تسلیم کر لی اور حکومت شام کی کھلم کھلا فتح کا اقرار کر لیا۔

یہ تصور اس قدر عام ہوا کہ صلح کے بعد ہی ظاہری مخلصین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ :۔

"آپ نے مومنین کو ذلیل کر دیا۔ اور صلح سے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا ہے "

یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ امام حسنؑ کے ساتھ آجانے والے افراد وہ حکومت پرست ذہن رکھتے تھے کہ ان کے خیال میں تخت و تاج پر قبضہ کر لینا فتح تھا۔ اور ان سے دست بردار ہو جانا کھلی ہوئی شکست تھا۔

حالانکہ اسلام نے روز اول ہی یہ تعلیم دی تھی کہ ہمارا مقصد حکومت و اقتدار پر قبضہ کرنا نہیں ہے اور جب ہم تخت و تاج کے خواہاں نہیں ہیں تو تخت و تاج ہماری فتح و شکست کے معیار بھی نہیں بن سکتے۔

اسلام اصول و آئین کا مذہب ہے ——— اس کی فتح و شکست اصول و آئین کی کامیابی سے وابستہ ہے۔

اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ امام حسنؑ اصولی طور پر کامیاب ہوئے یا ناکام ہوئے؟

تمہیدی طور پر یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ فتح و شکست کا فیصلہ دوران جنگ نہیں ہوا کرتا۔

جنگ کے خاتمہ پر اقتدار کا سنبھال لینا بھی اس کا معیار نہیں ہے۔ فتح و شکست کا حقیقی فیصلہ ارباب عقل و انصاف کے مدح و ذم سے کیا جاتا ہے۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے ظالم مظلوم کو طمانچہ مار کر اپنے کو " فاتح اعظم " تصور کرتا ہے۔

لیکن اہل انصاف یہی کہتے ہیں کہ ظالم نے برا کیا۔ اسے ایسا غیر عادلانہ برتاؤ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اور یہی درحقیقت مظلوم کی فتح کی علامت ہے۔

فتح کا تعلق مار لینے یا مار کھانے سے نہیں ہے۔ فتح کا تعلق عمومی ہمدردی اور اہل انصاف کی مدح و ثنا سے ہے۔ اہل انصاف مدح کریں تو عمل صحیح ہے اور اہل انصاف مذمت کریں تو اقدام غلط۔

امام حسنؑ نے اپنے معترضین کو اسی عظیم نکتہ کی طرف متوجہ کرایا تھا۔ معترضین کا دعویٰ تھا کہ آپ معاویہ کے ساتھ صلح کرنے میں دھوکہ کھا گئے۔

اس نے آپ کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر آپ سے تخت و تاج چھین لیا۔

آپ نے ذرا "دوراندیشی" سے کام لیا ہوتا تو اسکے ناپاک عزائم کے پیش نظر کبھی صلح پر آمادہ نہ ہوتے۔

لیکن آپ کا یہ ارشاد تھا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں نے دھوکہ کھایا ہے۔ دھوکہ دیا نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ میری صلح "الصلح خیرٌ" کے ضابطہ کے تحت ہوئی ہے۔

اگر یہ صلح تمہاری نظر میں دھوکا کھانے کے مرادف ہے تو اسلام میں دھوکا دینا جرم ہے۔ دھوکا کھانا جرم نہیں ہے۔ دھوکا کھانا نیک نیتی اور اخلاص عمل کی علامت ہے اور دھوکا دینا عیاری و مکاری کی نشانی ہے۔ اسلام عیاری کو ناپسند کرتا ہے، نیک نیتی کو نہیں۔

حقائق پر گہری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہو گا کہ امام حسنؑ نے کسی قسم کا فریب نہیں کھایا اور آپ اپنے مقصد میں مکمل طور پر کامیاب ہوئے۔ کامیابی کا اندازہ [illegible]

فکر یہ ہوتی ہے کہ اپنے عیوب پر پردہ ڈالا جائے اور کوئی بھی فریق آخری وقت تک اپنے ظلم کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

مظلوم بننا حسن ہے اور ظالم بننا عیب ہے۔ اب اگر کوئی فریق اپنے مخالف فریق سے ظلم کا اقرار لے لے تو اس سے بڑی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

امام حسنؑ اور حاکم شام کے درمیان دو اختلافی مسائل تھے۔ ایک دینی قیادت اور ایک ظلم و تعدی۔

حاکم شام کا دعویٰ تھا کہ دینی قیادت کے جملہ شرائط میرے کردار میں مجتمع ہیں اور امام حسنؑ اسے قیادت کے جملہ شرائط سے عاری تصور فرماتے ہیں۔

حاکم شام اپنے ہر اقدام کو عادلانہ اور مبنی بر انصاف تصور کرتا تھا۔ اور امام حسنؑ اس کی زیادتیوں کو واضح کرکے یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نے برسہا برس سے ہمارا نام و نشان تک مٹا دینے کے لئے منصوبہ بنا رکھا ہے اس کا ارادہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں کوئی شخص بھی ہمارے ذکر خیر اور ہمارے اوصاف و کمالات سے باخبر نہ رکھا جائے۔

ضرورت تھی کہ امام حسنؑ دونوں محاذوں پر دشمن کو شکست دیں اور خود اس قلم سے ان جرائم کا واضح اقرار لے لیں۔

آپ نے تخت و تاج ضرور دے دیا لیکن ان دونوں باتوں کا اقرار بھی لے لیا اور پھر صلح نامہ کی دستاویز کی شکل میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی کرا دیا

دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

صلح کے دو اہم شرائط یہ تھے۔

(۱) حاکم شام کو کتاب و سنت پر عمل کرنا ہوگا۔

(۲) امیر المومنینؑ پر سب و شتم کے سلسلے کو بند کرنا ہوگا۔

پہلی شرط نے پہلے محاذ پر فتح کا اعلان کیا ——— اور دوسری شرط نے دوسرے محاذ پر۔

کتاب و سنت پر عمل کرنے کا مطالبہ اس سے نہیں کیا جا سکتا جو کتاب و سنت پر برابر عمل کر رہا ہو۔

یہ مطالبہ اسی شخص سے کیا جاتا ہے جس نے اپنی خواہشات کے پیچھے کتاب و سنت کو نظر انداز کر دیا ہو اور فرمان الٰہی کو پس پشت ڈال دیا ہو۔

امام حسنؑ نے صلح کی پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ حاکم شام کتاب و سنت پر عمل کرے گا اور حاکم شام نے اس بات کو منظور بھی کر لیا۔ جو اس بات کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ حکومت شام احکام الٰہیہ پر عمل پیرا نہیں ہے اور فرزند رسولؐ کو صرف احکام الٰہیہ کی برتری کی فکر ہے تخت و تاج کی نہیں۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قیادت امت میں "سیرت شیخین" پر عمل کا مطالبہ ایک غیر اسلامی شرط ہے۔ ورنہ شام کا حاکم ضرور کہتا کہ میں کتاب و سنت کے ساتھ سابق اموی بادشاہ کی طرح سیرت شیخین پر بھی عمل کروں گا۔ اور اس طرح بہت سے احکام الٰہی کو نظر انداز کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا

اس کا مطلب یہ ہے کہ مولائے کائنات نے تخت حکومت کو ٹھکرا کر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسلامی آئین میں اس "مہمل" شرط کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اسے وہ حاکم بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے جس کے خاندان میں اقتدار اسی شرط کے طفیل میں آیا ہے۔

دوسری شرط میں امام حسنؑ نے سب و شتم پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ

کیا۔ جس کی منظوری اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شام میں حضرت علیؑ پر سب و شتم کا سلسلہ جاری تھا اور حکومت اس شعبہ کو بڑے تشدد کے ساتھ چلا رہی تھی۔

ظاہر ہے کہ امام حسنؑ جنگ کر لیتے یا حکومت کے مقابلہ پر کھڑے ہو جاتے تو دنیاوی نگاہوں میں کامیاب کہلائے جاتے۔ لیکن وہ مدعا کبھی حاصل نہ ہوتا جو اس خاموش دستاویز سے حاصل کر لیا گیا ہے۔ اور ظالم اس طرح اپنے ظلم کا کبھی اقرار نہ کرتا جس طرح صلح کے موقع پر کیا گیا ہے۔

سب و شتم کی پابندی کے مطالبہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومتِ شام "اسلامی آئین" کے ساتھ اہل بیتؑ سے مقابلہ نہیں کر رہی تھی۔

بلکہ اس کا عظیم ترین حربہ پروپیگنڈہ اور جھوٹی شہرت تھی جسے اسلام کسی قیمت پر پسند نہیں کر سکتا۔

اس کے ماسوا امام حسنؑ نے آخری شرط میں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہ تخت و تاج کسی استحقاق کی بنا پر نہیں دیا گیا۔ ورنہ اپنے بعد کسی کو حاکم نہ بنانے کی شرط نہ رکھی جاتی۔ یہ صرف ایک "دفع الوقتی" ہے جس میں دین الٰہی کے تحفظ کے ساتھ مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت مقصود ہے۔ اور اس طرح حاکم شام کے ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا گیا جن کے زیر اثر یہ صلح کی تحریک کی گئی تھی۔ اور جس کا تمام تر منصوبہ یہ تھا کہ حکومت کو اہل بیتؑ سے ہٹا کر قانونی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بنی امیہ کے حوالے کر دیا جائے۔

امام حسنؑ نے واضح کر دیا کہ حکومت پر قبضہ کر لینا آسان ہے لیکن اسکا قانونی جواز تلاش کر لینا مشکل ہے۔

تاثرات

۴۱ھ میں امام حسنؑ اور حاکم شام میں صلح ہوئی۔ اس وقت حضرت عباسؑ کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

پندرہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے خاندان کے تین عظیم کرداروں کا مطالعہ کیا اور ہر موقع پر اپنی فطری اور خداداد صلاحیت سے اس امر کا جائزہ لیا کہ باطل کے مقابلہ میں ہمارے خاندان کا شعار کیا جا رہا ہے۔ اور ہمارے بزرگوں نے باطل سے مقابلہ کرنے کے لئے کیا حربے کئے ہیں۔

جنگ صفین۔ واقعۂ تحکیم۔ صلح امام حسنؑ۔ یہ تین اہم مواقع تھے۔ جب حق و باطل کا خاموش مقابلہ ہوا اور ہر موقع پر اہل بیتؑ کا ایک ہی کردار اور ایک ہی مقصد رہا ——— مالک کائنات نے بھی انھیں اپنے نیک مقصد میں کامیابی عطا کی۔

صفین کا معرکہ ایک فیصلہ کن موڑ پر آچکا تھا ——— علیؑ کا سپاہی حاکم شام کے خیمہ کے قریب تھا اور نزدیک تھا کہ خیمہ کی طنابیں کاٹ کر جنگ کا خاتمہ کر دے کہ اچانک دشمنوں نے نیزوں پر قرآن بلند کر دیئے اور قرآن سے فیصلہ کی دعوت دیدی۔

حضرت علیؑ کے لئے یہ شدید آزمائشی لمحہ تھا۔ جنگ کو روک دیں تو بظاہر فتح شکست میں بدل جائے گی اور جاری رہنے دیں تو مخالفت قرآن کا الزام آجائے گا۔؟

حضرت علیؑ کے لئے یہ شدید آزمائشی لمحہ تھا۔ آپ نے بظاہر جیتی ہوئی جنگ کو روک دیا لیکن دشمن کے اس ناپاک ارادہ کو ناکام بنادیا کہ علیؑ قرآن پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔

آپ کا کھلا ہوا اعلان تھا کہ عزت قرآن کا معاملہ آجائے تو میں جیتی ہوئی لڑائی کو ظاہری شکست سے تبدیل کر سکتا ہوں۔ عزت قرآن کی بربادی برداشت نہیں کر سکتا۔

تاریخ کا دوسرا نازک موڑ تحکیم کا واقعہ تھا جہاں مولائے کائنات کسی قیمت پر عوام کے نمائندوں کو حکم بنانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن جب حالات بگڑنے لگے اور شام کے منصوبے کامیاب ہوتے نظر آئے تو آپ نے فوراً قرآن کی برتری کا اعلان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ فیصلہ کوئی بھی کرے۔ میری نظر میں وہ فیصلہ اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگا جب تک کتاب الہٰی سے اس کی سند نہ مل جائے۔

واقعہ تمام ہوا ——— ابوموسیٰ اشعری نے دھوکہ کھایا ——— عمرو عاص کی عیاری کام آگئی اور تخت و تاج، حکومت و اقتدار شام کے حوالے ہوگیا۔

لیکن تاریخ والوں کو یہ بات بھی درج کرنا پڑی کہ تحکیم کے پورے واقعہ میں قرآن حکیم کا نام نہیں آیا۔ اور یہ حضرت علیؑ کی کھلی ہوئی فتح تھی۔ دنیا نے اندازہ کر لیا کہ میدان جنگ میں قرآن حکیم کا نام صرف ایک عیاری کے تحت لیا گیا تھا — حکومت شام کو قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تخت و تاج پانے کے بعد حالات بدل جایا کرتے ہیں ——— عوام حکومت کے اشاروں کے پابند ہوتے ہیں۔ اور حکومت کے پروپیگنڈوں پر

بہت جلدی ایمان لے آتے ہیں۔

حالات کے تحت یہ شدید خطرہ تھا کہ حاکم شام رائے عامہ کو تبدیل کردے اور مختلف حیلوں سے قوم کو یہ باور کرادے کہ میری حکومت کی بنیادیں قرآن و سنت پر استوار ہیں۔

اہل بیت کا اختلاف ”معاذ اللہ“ ایک حسد کی بنا پر ہے کہ انھیں حکومت نہیں مل سکی اور انکا خواب اقتدار شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

مولائے کائنات دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ شامی زہر اپنا کام کر چکا تھا حکومت کے لئے پروپیگنڈے کی زمین مکمل طور پر ہموار تھی۔ اب نہ کوئی تلوار اٹھانے والا تھا اور نہ معرکہ کارزار گرم کرنے والا۔

حالات میں تیزی سے تبدیلی آچکی تھی۔ اور حکومت کی مطلق العنانی سے شدید خطرات پیدا ہو چکے تھے۔

امام حسنؑ نے نگاہ امامت سے حالات کا جائزہ لیا اور نتیجہ میں یہ فیصلہ کر لیا کہ ایسے اوقات میں جنگ مختلف تعبیروں کا شکار ہو جائے گی۔ اور حکومت کو نت نئے بہانے تراشنے کا موقع مل جائے گا۔

مناسب یہ ہے کہ تلوار کے بجائے قلم کا استعمال کیا جائے اور ظلم کا مقابلہ کرنے کے بجائے ظالم سے ظلم کا اقرار لیا جائے۔

چنانچہ آپ نے بار دیگر حکومت و اقتدار سے سبکدوشی کا ارادہ ظاہر کر کے حکومت کی کتاب و سنت سے بے تعلقی کا اعلان کردیا۔

صلح حسنؑ تخت و تاج کی صلح نہیں ہے۔ ظالم سے ظلم کا اقرار لینے کی صلح ہے۔ اس راہ میں امام حسنؑ کو صد فی صد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

حضرت عباسؑ کے پیش نظر یہ تینوں اہم مشاہدات تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر

ایک عام انسان بھی یہ اندازہ کرسکتا تھا کہ ہاشمی گھرانے کا کردار جاہ طلبی اور حبِ ریاست نہیں ہے۔

یہاں صرف قانون کی برتری اور آئین کی عظمت کا تحفظ کیا جاتا ہے اور
______ اس راہ میں ہر قربانی روا۔ اور اس مقصد کے لئے ہر مصیبت والم قابل قبول ہے۔

پھر آپ کی بصیرت ؟ ______ وہ بصیرت جسے علماء اسلام نے "علم لدنی" سے تعبیر کیا ہے ؟ کیا وہ بصیرت حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد ایک عظیم کردار کی تعمیر نہ کرے گی۔ اور کیا اس کے بعد عباسؑ کا طرزِ فکر قربانی و فداکاری کے علاوہ کچھ اور ہوگا۔

دنیا صلح امام حسنؑ کے آئینہ میں امام حسینؑ کی اولوالعزمی کا مشاہدہ کرتی ہے کہ آپ نے بھائی کی صلح سے ذرہ برابر اختلاف نہیں کیا۔ لیکن مجھے اس موقع پر حضرت عباسؑ کے کردار کی بلندی کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔

امام حسینؑ امام تھے۔ اور "دنیاوی اعتبار" سے ۲۶ برس کے تجربہ کار معتدل مزاج اور پرسکون انسان تھے۔ عباسؑ ۱۵ برس کے جوان رعنا تھے۔ انکے خون میں مکمل حرارت تھی۔ ان کی رگوں میں ہاشمی شجاعت خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔ ان کے سن و سال سے کسی اعتدال پسندی اور ظاہری طور پر "شکست آمیز" صلح کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ عباسؑ نے بھائی کی صلح کے خلاف ایک کلمہ نہیں کہا اور پوری نیک نیتی کے ساتھ امامت کے اقدام کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہے۔

اس سن و سال میں یہ معتدل اقدام علیؑ کے لال۔ علم و عرفان کے کمالات

بصیرت و بصارت کے جمال کے علاوہ کسی اور سے متوقع نہیں ہوسکتا ہے۔

شہادتِ امام حسنؑ

مذہب کی راہ میں اس فداکاری اور مزاج کی اس اعتدال پسندی کا اثر تھا کہ حضرت عباسؑ نے ان مواقع پر بھی صبر سے کام لیا ہے۔ جہاں بڑے سے بڑا صابر بھی عنانِ صبر کو ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے اور ان نازک لمحات میں بھی امامت کی رائے کا احترام کیا ہے جہاں کوئی دوسرا انسان اس احترام کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

شامی زہر اپنا اثر کر چکا ہے۔ فرزند فاطمہؑ کے جگر کے بہتر ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ امام حسینؑ غسل و کفن کے بعد حسبِ وصیت جنازہ کو تجدید عہد کے لئے نانا کے مزار کی طرف لے جا رہے ہیں۔

بنی امیہ میں یہ خبر عام ہو چکی ہے کہ امام حسینؑ اپنے بھائی کو نانا کے پہلو میں دفن کرنا چاہتے ہیں۔

خبر کا نشر ہونا تھا کہ اختلاف کی پوری مشینری حرکت میں آگئی اور مردوں کے دوش بدوش "عورتیں" بھی جنازہ کو روکنے کے لئے باہر نکل آئیں۔ ایک خاتون کے بارے میں تو یہاں تک نقل کیا گیا ہے کہ وہ خچر پر سوار ہو کر جنازہ کو روکنے کے لئے آئی تھیں جس کو دیکھ کر ابن عباس کو یہ کہنا پڑا کہ اونٹ اور خچر

کی نوبت تو آچکی ہے۔ اب اگر کچھ دنوں اور زندہ رہ گئیں تو ہاتھی ہی کی باری ہے۔

مناقب ابن شہر آشوب ۴ ص ۶۵، روضۃ الصفاء ۳ ص ۷، بحار الانوار۔

امام حسینؑ نے سمجھایا کہ ہم نانا کے روضہ پر تجدید عہد کے لئے آئے ہیں۔ اگر تم لوگ مزاحم ہوگے تو جنازہ کو یہاں دفن نہ کریں گے۔

دشمن نے پوری طاقت سے مزاحمت کی اور بنی ہاشم نے وصیت کا احترام کرتے ہوئے جنازہ کو جنت البقیع میں دفن کر دیا۔ (جہاں قبر کے آثار آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اصل قبر مطہر ابن سعود کے مظالم کا نشانہ بن چکی ہے۔)

روضۃ الصفاء کی روایت ہے کہ اس دوران تیر بارانی بھی ہوئی جس کے نتیجہ میں امام حسنؑ کے جنازے میں ستر تیر پیوست ہوگئے۔ قیامت کی منزل ہے کہ امام حسینؑ۔ محمد بن الحنفیہ اور عباسؑ جیسے مجاہدین موجود ہیں۔ اور جنازہ پر تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔

دشمن کے دستہ کی قیادت ایک خاتون کے ہاتھوں میں ہے۔ جو کل شکست کھا چکی ہیں۔ اور آج اس کا انتقام لے رہی ہیں۔ اور ایک مروان کے ہاتھ میں ہے جس کی بزدلی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

بنی ہاشم کی طرف سے امام حسینؑ کے علاوہ جمل کے مجاہد محمد حنفیہ اور صفین کے شیر عباسؑ علمدار بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تلوار نہیں اٹھتی اور جنازہ کو خاموشی سے سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔

کیا کردار کی بلندی کی اس سے بڑی کوئی مثال ہو سکتی ہے کہ جوانوں کے اتنے بڑے مجمع میں جنازہ کے ساتھ بے ادبی کی جائے اور کوئی انگلی نہ کرے۔

اب عباسؑ باپ کے سایۂ تربیت سے نکل کر کمال کی اعلیٰ منزلوں میں آچکے ہیں۔ اب آپ کے اظہار کمال کا وقت ہے۔

چنانچہ آپ نے پہلے پہل اپنے کمال صبر کا مظاہرہ کیا اور یہ واضح کر دیا کہ وصیت کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو آج مدینہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں ہوتیں اور اس وقت دشمن کو اندازہ ہوتا کہ ہاشمی شیروں کی شجاعت و بہادری کا کیا عالم ہے۔

مگر افسوس کہ وصیت درمیان میں حائل ہے اور ہمارے گھرانے کے کردار میں بزرگوں کا احترام ہے۔ شمشیر زنی نہیں ہے۔

اس واقعہ کا سب سے بڑا شرمناک پہلو یہ ہے کہ اس شہادت کبریٰ کی خبر پانے کے بعد حاکم شام نے شکر کا سجدہ کیا اور تکبیر کی آواز بلند کی۔

طبری العقد الفرید، تاریخ خمیس۔ حیوۃ الحیوان ص ۵۱ وغیرہ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن زہراؑ کا خون کوئی مباح خون تھا جو بہہ گیا۔ یا آغوش رسولؐ کا پروردہ کوئی واجب القتل تھا جو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

غیرت اسلامی اس منزل پر پہنچ جائے تو کسی خیر کی توقع لغو اور کسی اصلاح کی امید مہمل ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ مورخین اس کے بعد بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ معاویہ نے اپنے وصیت نامہ میں امام حسینؑ کے ساتھ صلۂ رحم کا حکم دیا تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ انھیں اذیت نہ پہنچائی جائے۔ یہ یزید کا ذاتی کردار تھا کہ اس نے باپ کی مخالفت کرتے ہوئے شدت سے بیعت کا مطالبہ کر دیا۔

میرے خیال میں یہ تصور انتہائی مہمل ہے۔ معاویہ اپنے بیٹے کو اس نکتہ

کی طرف متوجہ کر رہا تھا کہ تیری حکومت کو انھیں افراد سے خطرہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے انھیں کا تصفیہ کر لیا جائے۔

ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ یزید کی حالت کو جانتے ہوئے ـــــ امام حسینؑ کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنا جانشین بناتا اور اس کے لئے عرب و عجم سے غلامی کی بیعت لیتا۔

معاویہ کے بارے میں کسی صفائی کا امکان نہیں ہے۔ اس نے خود اپنے دور میں رسولؐ کے بڑے فرزند کو زہر دلایا ہے۔

ابو الفدا ۱/۱۸۳، روضۃ الصفا ۳/۲، حبیب السیر ۲/۱۸۔

اور اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے کو وصیت کر دی ہے کہ رسولؐ کے دوسرے فرزند کا خاتمہ کر کے نسل نبوت کو مٹا دیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

ایک المیہ

حضرت عباسؑ کی حیات کا ایک عظیم المیہ یہ بھی ہے کہ آپ کو پوری زندگی میں جنگ صفین کے چند لمحات کے علاوہ کہیں بھی دادِ شجاعت دینے کا موقع نہیں ملا۔ ایسا عظیم مجاہد اور ایسا جنگ آزما بہادر کسی موقع پر شجاعت کے جوہر نہ دکھا سکے۔ اس سے بڑا المیہ قابل تصور نہیں ہے۔

کسی بہادر کی زندگی میں زور آزمائی کا موقع نہ آئے تو کوئی افسوسناک بات نہیں ہے لیکن موقع آنے کے بعد بھی جنگ کا موقع نہ ملے تو اس سے بڑا کوئی حادثہ نہیں ہے۔

حضرت عباسؑ کی زندگی میں متعدد مواقع آئے ہیں جہاں تلوار کا کھینچ جانا ناگزیر تھا۔ اور بظاہر موقع تھا کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں۔

امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ بے ادبی ـــــ پدر بزرگوار کی شان میں مسلسل گستاخی ـــــ مخلصین کا بے دردی کے ساتھ قتل، فرات سے خیموں کی علیحدگی ـــــ کوئی معمولی حادثے نہیں تھے ـــــ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کربلا میں "سقائی" کے بعض مواقع کے علاوہ کبھی عباسؑ کے ہاتھ میں تلوار نہیں دیکھی گئی۔

حد ہو گئی کہ خود عاشورہ کے قیامت خیز مرحلہ پر بھی عباسؑ کو اذن جنگ نہیں ملا۔ اور مجاہد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ حسرتوں کی اتنی بڑی پامالی اور تمناؤں کا اتنا عظیم خون ایک بہادر کی زندگی پر کیا اثر ڈالتا ہے۔ اس کا اندازہ ایک بہادر ہی کر سکتا ہے لیکن عباسؑ کے چہرے پر شکن تک نہیں آئی۔

یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عباسؑ صرف ایک بہادر نہیں ہیں۔ ان کی رگوں میں صرف خونِ شجاعت نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے آبا و اجداد سے صرف تیغ آزمائی نہیں سیکھی ہے ـــــ بلکہ ان کے دل و دماغ میں تعلیماتِ عصمت کے نقوش بھی ہیں۔

ان کی زندگی علم و عرفان کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ ان کے کردار کے عناصر میں باپ کے جلال کے ساتھ ماں کا حلم بھی شامل ہے۔ انھیں علیؑ کی گودی نے پروان چڑھایا ہے تو زہراؑ کی دعاؤں نے کمالِ صبر کی آخری منزلوں تک پہنچایا ہے۔

شجاعت کے ساتھ صبر ——— ہمت کے ساتھ ضبط ———
زور بازو کے ساتھ قوت قلب اور تلوار کے ساتھ صحت سند انکار ہی انسانی کردار کے اہم عناصر ہیں جن کے بغیر کوئی انسان حقیقی معنوں میں انسان کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

غسلِ امام حسنؑ

اسی بلند کردار اور عظمتِ نفس کا اثر تھا کہ حضرت عباسؑ کو ان مواقع پر بھی شریک کار بنایا گیا ہے۔ جہاں غیر معصوم کا گزر نہیں ہو سکتا اور جس ماحول کے لئے صرف اہل عصمت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ دور آدمؑ سے امام حسن عسکریؑ تک کوئی ایسا دور نہیں آیا جب کسی معصوم کے غسل و کفن کی ذمہ داری کسی غیر معصوم کے لئے حوالے کر دی گئی ہو تفصیلات تاریخ کے دامن میں نہیں ہیں۔ لیکن جہاں کبھی غسل و کفن کا ذکر ہے وہاں اس امر کی تصریح ہے اور جہاں یہ تذکرہ نہیں ہے وہاں ایک قانون کلی کا ذکر ہے۔ معصوم کی تجہیز و تکفین معصوم ہی تک محدود ہے۔

"اَلْاِمَامُ لَا یَلِیْ اَمْرَہٗ اِلَّا اِمَامٌ"

بعض معاصرین نے اس قانون میں بھی اشکال کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ معصوم کے تمام امور تجہیز و تکفین معصوم سے متعلق نہیں ہیں۔ اس کا تعلق صرف نماز

جنازہ یا غسل سے ہے۔ دفن اس کے حدود سے خارج ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عام مضمون کی روایت ضعیف ہے۔ اور ضعیف روایات سے عقائد کا اثبات نہیں کیا جا سکتا۔

ان بزرگوار کو یہ توہم ہو گیا ہے کہ عقیدہ کی بنیاد اس روایت پر ہے اور یہ روایت ضعیف ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ روایت نہیں ہے بلکہ اسے علماء اعلام نے بطور مسلمات نقل کیا ہے۔

عقیدہ کی بنیاد وہ متواتر تعلیمات ہیں جو مختلف شکلوں میں معصومینؑ کی طرف سے بیان ہوتے رہے ہیں۔ اور جن میں کسی منزل پر بھی تجہیز و تکفین کی تشریح کی گئی ہے تو اسی منزل پر اسے خصوصیاتِ عصمت و امامت میں شمار کیا گیا ہے۔

بہر حال اس حقیقت کو عقائد میں شمار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ تاریخ میں کسی معصوم کے غسل و کفن میں غیر معصوم نے برابر کا حصہ نہیں لیا۔ حد ہو گئی کہ جب مرسلِ اعظمؐ کے غسل میں فضل بن عباس نے پانی دینا شروع کیا تو امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ فضل اپنی آنکھیں بند کئے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری آنکھیں ضائع ہو جائیں۔

(امالی شیخ طوسی ص ۵۹)

یہ وہ منظر جمال ہے جس کا تحمل ایک معصوم کے علاوہ کسی میں نہیں ہے۔
طور کا قصہ سننے والے جانتے ہیں کہ جب نور اپنی اصلی حالت میں سامنے آجاتا ہے تو کسی کے ہوش سلامت نہیں رہ جاتے۔

وفات کے بعد امام کا رشتہ مادی دنیا سے یکسر قطع ہو جاتا ہے اور تبلیغی ذمہ داریوں کا رابطہ بھی باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

نور اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے اور روحانیت و معنویت اپنے صحیح خدوخال

میں سامنے آجاتی ہے۔

یہ وہ منظر ہے جس کا تحمل نگاہ میں نہیں ہے اور یہ وہ جلال و جمال کا محل ہے جس کے لئے چشم معصوم درکار ہے۔

لیکن اس کے باوجود تاریخ گواہ ہے کہ جب امام حسینؑ امام حسنؑ کو غسل دے رہے تھے تو آپ نے حضرت عباسؑ کو اپنا باقاعدہ کا شریک بنایا تھا اور آنکھ بند کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

(ذخائر العقبیٰ محب الدین طبری ص ۱۴۱)

یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ عباسؑ کا مرتبہ عام انسانوں سے قطعی مختلف ہے اور آپ عصمت سے قریب تر مرتبہ کے مالک ہیں۔ بلکہ ایک جہت سے معصومین میں شمار کئے جانے کے لئے لائق ہیں۔ جیسا کہ آیۃ اللہ شیخ طہٰ نجف طاب ثراہ نے اتقان المقال میں تحریر فرمایا ہے کہ عباسؑ کا تذکرہ عام انسانوں کے ساتھ نہیں بلکہ اہلبیت معصومینؑ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

اس کا ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ معصوم کو معصوم ہی کے غسل و کفن دینے کے قانون میں ایک قسم کی تعمیم پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ غسل و کفن دینے والے معصوم کے بشر ہونے کی شرط نہیں ہے بلکہ ملک بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی شخص نے معصوم کا ساتھ دینا چاہا تو آپ نے یہ کہہ کر الگ کر دیا کہ میرے ساتھ میری مدد کرنے والے موجود ہیں۔ یا ملائکہ میری مدد کر رہے ہیں۔

(البصائر الدرجات)

مقصد یہ ہے کہ اصل ذمہ داری بشر معصوم کی ہے لیکن اعانت و امداد کے طور پر ملک معصوم بھی شریک کار ہو سکتا ہے۔ عصمت اختیاری کے ساتھ

عصمت اضطراری کی شرکت اصل مقصد کے لئے مضر نہیں ہے۔ جس کے بعد یہ کہنا آسان ہے کہ اگر غسل معصوم ملک کی عصمت کا متحمل ہو سکتا ہے تو جس کا کردار عصمت ملک جیسا ہو اور جس کی زندگی مکمل اختیارات کے باوجود انتہائی پاک و پاکیزہ اور صاحب تطہیر کی آغوش کی پروردہ ہو اس کی شرکت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

عباسؑ عصمت کردار کی اس منزل پر تھے جس کی بلندی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اتنا کہ امام معصوم نے امام معصوم کے غسل میں شریک کار قرار دیا ہے ـــــــ اور اس سے بالاتر کسی منزل کا تصور ممکن نہیں ہے۔

افسوس ـــــــ کہ تاریخ نے آل محمدؐ کی زندگیوں کو ہمیشہ پردۂ خفاء میں رکھا ہے۔ اور ہاشمی گھرانے کے کردار کو منظر عام پر آنے نہیں دیا جب کہ مرسل اعظمؐ اور مولائے کائنات کی زندگی کے اہم واقعات کو دامن تاریخ میں جگہ نہ مل سکی۔ کربلا جیسے عظیم الشان واقعہ کو تاریخ اپنے سینے سے نہ لگا سکی۔ تو حضرت عباسؑ کی زندگی کے بارے میں کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

تفصیل سے واقعہ بیان کرتے تو یہ اندازہ کیا جاتا کہ سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۵۰ھ تک۔ ۱۰ سال کے عرصہ میں حضرت عباسؑ کا طرز عمل کیا رہا اور انھوں نے امام حسنؑ کی اطاعت میں کس طرح زندگی گزاری ہے۔

اجمالی روایات میں دو تین مقامات پر تذکرے ضرور ملتے ہیں۔ لیکن ان سے پورے کردار کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ عباسؑ نے زندگی کے کسی موڑ پر اور حالات کی کسی نازک ترین منزل میں بھی امامت کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا اور اپنے کردار کو بندگی کے سانچے میں ڈھالے رہے جس سے بڑی عصمت کردار کی دلیل نہ کوئی تاریخ پیش کر سکتی ہے اور نہ کوئی کتاب سیرت۔

منزلِ سوم

سیرت حیات کی دوسری منزل میں قمر بنی ہاشم کا کردار زیادہ اجاگر نہیں ہو سکا جس کا ایک اہم سبب تو یہ ہے کہ خود امام حسنؑ کی زندگی کو بھی بہت کچھ پردۂ خفاء میں رکھا گیا۔ اور خود تاریخ کا بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ خاموش خدمات کا تذکرہ کرنا نہیں جانتی۔

اس کی نگاہ میں صرف ہنگاموں کی قیمت ہوتی ہے۔ وہ صرف میدانوں کو نگاہ اعتبار سے دیکھتی ہے. گوشۂ عافیت میں وہ رہ کر دین و مذہب کی خدمت تاریخ کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تاریخ کا صحیح مزاج اس ایک مصرعے سے واضح ہوتا ہے سو

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اس کے علاوہ تاریخ میں کسی واقعہ کی کوئی عظمت و اہمیت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ مولائے کائنات نے وقتِ آخر جناب عباسؑ کو امام حسینؑ کے حوالے کر دیا تھا۔ اور روزِ اول سے عباسؑ کی ضرورت امام حسینؑ ہی کے لئے محسوس کی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد سے جستہ جستہ جن واقعات کا سراغ ملتا ہے ان میں جناب عباسؑ امام حسینؑ ہی کی خدمت میں رہے۔ آپ ہی نے اپنی زبان چوسا آپ ہی نے گودی میں پالا۔ آپ ہی مسجد میں لے گئے ——— اور آپ ہی مکمل طور پر نگہداشت کرتے رہے۔

یقیناً جناب زینبؑ بھی امام حسینؑ کے اس طرزِ عمل میں برابر کی شریک رہی ہوں گی۔ اور جناب ام کلثومؑ نے بھی اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہوں گی۔ لیکن تاریخ میں ان حقائق کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

حضرت عباسؑ کے نمایاں کردار کا سلسلہ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں سب سے پہلے آپ کا جلال امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ بے ادبی کے موقع پر دیکھا گیا۔ اور اس کے بعد تاریخ کے ہر موڑ پر حضرت عباسؑ ہی نظر آئے۔

۵۰ھ میں امام حسنؑ کی شہادت واقع ہوئی اور امام حسینؑ کی منصبی ذمہ داریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

امام حسینؑ نے ابتدائی طور پر اپنے بھائی کی وصیتوں کا احترام کرتے ہوئے اس صلحنامہ پر باقاعدہ عملدرآمد کیا جسے ان کے مرحوم بھائی نے دین کے مصالح اور مذہب کے منافع کے تحت مرتب فرمایا تھا اور اس کے بعد حالات میں اہم تبدیلی آتے ہی امام حسینؑ کو اپنا طریقۂ کار تبدیل کرنا پڑا۔

تاریخ گواہ ہے کہ اگر حالات بدستور باقی رہ جاتے تو امام حسینؑ کے طرزِ عمل

کے تحت کسی جنگ و جہاد کا کوئی امکان نہ تھا۔ آپ اپنے پدرِ بزرگوار کی طرح خانہ نشین بھی ہو سکتے تھے۔ اور اپنے برادرِ بزرگ کی طرح تخت و تاج کو ٹھوکر بھی مار سکتے تھے لیکن ۶۰ھ میں معاویہ کے مرتے ہی حالات نے کروٹ بدلی اور زمانہ نے پلٹا کھایا۔ اب صلح و مصالحت کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ مطالبۂ بیعت نے لے لی تھی۔

معاویہ کے مرنے کے بعد یزید نے پہلا اقدام یہ کیا کہ حاکم مدینہ ولید کو خبر مرگِ معاویہ دیتے ہوئے ایک مختصر رقعہ یہ بھی لکھا کہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرے اور اگر بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیج دے۔

(طبری)

ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کسی مرحلہ پر معاویہ نے بیعت کا نام نہیں لیا تھا۔ اور شوریٰ کی منزل میں بھی ہاشمی گھرانے کے سربراہ امت کے امام حضرت علیؑ نے سیرت شیخین کا صریحی انکار کر دیا تھا۔ جس کے بعد امام حسینؑ کے بیعت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

لیکن یزید نے نشۂ حکومت کے زیرِ اثر حالات کا مکمل جائزہ نہیں لیا ——— اور اپنے غیر اسلامی افعال کو اسلام کا رنگ دینے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ بانیٔ اسلام کے حقیقی وارث سے بیعت لے کر اپنے اعمال پر اسلام کی مہر ثبت کرا لی جائے۔

۲۸ رجب کی رات تھی۔ جب یزید کا پیغام ولید تک پہنچا اور ولید نے راتوں رات امام حسینؑ کو طلب کر لیا۔ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اور آپ کے پاس عبد اللہ بن زبیر بھی بیٹھے تھے۔

نا وقت طلب کے خطرات کو محسوس کر کے ابن زبیر نے فرار کا ارادہ کیا اور امام حسینؑ نے فیصلہ کیا کہ مجھے ولید کے دربار میں جانا ہے۔ اپنے موقف کو روزِ اول ہی واضح کر دینا ہزار لیت و لعل سے کہیں بہتر ہے۔

مسجد سے اٹھ کر بیت الشرف میں آئے۔ بہن کو پیغام سنایا۔ بہن نے کبھی ناوقت طلبی کے خطرات کا احساس کیا اور فرمایا۔ بھیا اگر جانا ہی ہے تو اپنے ہمراہ ہاشمی جوانوں کو لے کر جایئے۔

۳۰ ہاشمی جوان ہمراہ ہوئے اور امام حسینؑ ولید کے دربار کی طرف روانہ ہو گئے۔ دربار کے دروازے پر پہنچ کر آپ نے ہاشمی جوانوں کو روک دیا اور فرمایا کہ میں اکیلا دربار میں جا رہا ہوں۔ تم لوگ یہیں توقف کرو۔ اس کے بعد اگر میری آواز بلند ہو جائے تو بلا کسی اذن کے دربار میں چلے آنا۔

امام حسینؑ دربار میں تشریف لے گئے۔ ولید نے کمال احترام سے بٹھایا۔ خبر مرگ معاویہ سنائی۔ حضرتؑ نے اسلامی قانون کے تحت کلمۂ

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

زبان پر جاری کیا۔

ولید نے یزید کا پیغام بیعت سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ جیسے آدمی سے خفیہ بیعت کے کیا معنیٰ؟

بیعت کا مسئلہ نہایت درجہ اہم ہے۔ بہتر ہے کہ کل دن کے وقت دربار میں طلب کرنا۔ اس وقت یہ فیصلہ ہو گا کہ بیعت کے لئے کیا اہتمام ہونا چاہیئے۔

ولید نے اپنی معقولیت کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت کو جانے کی اجازت دیدی ——— لیکن مروان بول اٹھا ———

کہ اگر آج حسینؑ تیری گرفت سے نکل گئے تو خون ریزی کے بغیر ہاتھ نہ آئیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ ان سے بیعت لے لے یا ان کا سر قلم کر دے۔

بیعت کے ساتھ قتل کا نام سنا تھا کہ حضرتؑ کو جلال آ گیا۔ آپ نے فرمایا او زن نیلگوں چشم کے بچے! تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے۔

حضرتؑ کی آواز کا بلند ہونا تھا کہ ہاشمی جوان دربار میں داخل ہو گئے ——— ولید کے ہوش و حواس اڑ گئے۔

اس نے فی الفور حالات کا احساس کرتے ہوئے جلسہ کو برخواست کر دیا۔ اور حضرت کو احترام کے ساتھ بیت الشرف تک پہنچا دیا۔

روایت کا بیان ہے کہ دربار ولید میں داخل ہوتے وقت ہاشمی جوانوں کے سربراہ حضرت عباسؑ ہی تھے۔ اور آپ ہی کی جلالت و ہیبت نے قلب ولید پر یہ اثر کیا کہ اس نے اپنے طرز عمل میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔

امام حسینؑ دربار سے واپس آ گئے ——— بیعت کا مطالبہ وقتی طور پر ٹل گیا۔

لیکن تاریخ کے طالب علم کے دل میں یہ خلش رہ گئی کہ یزید نے چار ہی آدمیوں سے مطالبۂ بیعت کیوں کیا اور اس کا مطالبہ اس شدت سے انکار امام حسینؑ ہی نے کیوں کیا۔

حالات کا بغور مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ عام اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کو مذہبی رنگ دینے کے لئے چند ہی افراد کی توثیق کافی ہو سکتی تھی۔ اور اس کے لئے کوئی عظیم منصب دار یا اس کا وارث ہی ہو سکتا تھا۔

چنانچہ یزید نے چار بڑی شخصیتوں کو منتخب کیا۔ جن میں تین خلافت کے حامل تھے۔ اور ایک امیدوار خلافت بلکہ خلیفہ گر۔ اور یہ طے کیا کہ انھیں کی اولاد سے بیعت کا مطالبہ کیا جائے۔

مطالبۂ بیعت میں مطلوب چاروں شخصیتیں عمومی نقطۂ نظر سے عظیم اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک خلیفۂ اول کا بیٹا۔ ایک خلیفۂ دوم کا بیٹا۔ ایک صحابیٔ رسول زبیر کا بیٹا۔ اور ایک خلیفۂ [illegible]

مسلمانوں میں کون ایسا تھا جو ان چاروں کی اسلامی حیثیت سے باخبر نہ ہو اور ان کی حکومتی عظمت کو نہ پہچانتا ہو۔ یزید نے سوچا کہ ان کی بیعت میری حکومت کو مکمل طور پر اسلامی بنا دے گی۔ اور مجدد دین خدا کے نام پر ہر حرام و حلال کا موقع مل جائے گا۔

یزید کا انتخاب دلیل ہے کہ ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے والے یزید کی نگاہ میں اسلامی شخصیتیں صرف چار تھیں۔ جنہیں یزید نے محل اعتبار قرار دیا تھا اور باقی افراد کو نگاہ اعتبار سے ساقط کر دیا تھا۔

ان چاروں کا انجام بھی مختلف رہا۔ ابن زبیر راتوں رات بھاگ نکلے۔ ابن عمر اور ابن ابی بکر نے بہر طور یزید کی بیعت کر لی۔ اب صرف امام حسینؑ ہیں جو اپنے موقف پر قائم ہیں اور کسی طرح یزید کی بیعت نہیں کرنا چاہتے۔

سوال یہ ہے کہ اب امام حسینؑ سے مطالبۂ بیعت کیوں ہے؟

حکومت کی توثیق کیلئے دو خلیفہ زادے اور ایک صحابی زادہ موجود ہے۔ ایک امام حسینؑ بیعت نہیں کرتے تو نہ کریں۔ ان کے انکار بیعت سے حکومت کے اسلامی ہونے پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ایک آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور باقی سے استفادہ کر لیا جائے۔

لیکن یزید کا انداز فکر یہ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کی الگ الگ حیثیت سے باخبر ہے اور جانتا ہے کہ امام حسینؑ کے بغیر سب کی بیعت بے کار ہے۔ گویا یزید کی نگاہ میں ۱۲ لاکھ مربع میل میں صرف چار آدمی قابل اعتبار تھے۔ اور ان میں سے صرف امام حسینؑ کا دل تھا جس نے نہ اپنے کو تباہ ہونے دیا اور نہ قوم کو موت کے گھاٹ اترنے دیا۔

تاریخ اسلام کا یہ بھی عجیب المیہ ہے کہ اتنی بڑی اسلامی مملکت میں چار سے زیادہ غیرت دار نہ نکلے اور چار میں بھی ایک کے علاوہ دوسرا جری اور ہمت دار

نہ پیدا ہوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیائے اسلام میں دوسرے غیرت دار مسلمان نہ تھے یا ان کی مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی۔

بلکہ یہ ان افراد کا تذکرہ ہے جو یزید کی نگاہ میں مذہب کی توثیق کے سلسلے میں مستند تھے اور ان کی مہر تصدیق حکومت کو خلافت کا نام دے سکتی تھی۔ ورنہ امام حسینؑ کے اصحاب و انصار ہی غیرت مذہب کے سلسلے میں کیا کم اہمیت رکھتے تھے۔

یزید کے خاموش اعتراف اور تاریخ کے تلخ تجربات نے واضح کر دیا کہ اسلام کی سخت آزمائشی گھڑیوں میں نہ کوئی صحابی زادہ کام آیا نہ خلیفہ زادہ۔ تنہا ایک فرزند رسول الثقلین تھا جس نے سر تن کی بازی لگا کر اسلام کی عزت کو بچا لیا اور عزت مذہب کو موت کے گھاٹ نہیں اترنے دیا۔

اب اگر مرسلؐ اعظم کا اسلام باقی ہے اور شراب و کباب، رقص و رنگ، زنا و عیاشی جزو مذہب نہیں ہیں تو یہ صرف ایک حسینؑ بن علیؑ کا احسان ہے اس میں نہ کسی صحابی زادہ کا حق ہے نہ خلیفہ زادہ کا۔

یزید کا انتخاب بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے خطرہ صحابیت یا خلافت ہی سے تھا ———!

یہ اور بات ہے کہ بعد کے تجربات نے واضح کر دیا کہ سکون و اطمینان کے حالات میں دین کی حمایت کا دم بھرنا آسان ہے اور آزمائش کے لمحات میں سینہ سپر ہو جانا مشکل ہے۔

یہ ایک علیؑ کے لال کا کلیجہ تھا جس نے ایک دوپہر میں بھرے گھر کو قربان کر دیا اور چہرہ کی بشاشت میں فرق نہیں آیا۔ امام حسینؑ کے لئے کربلا کا کوئی لمحہ مشکل اور دشوار نہیں تھا۔ آپ الٰہی نمائندگی کے حامل اور حیدرؑ کرار کے وارث تھے۔ آپ کے

دل میں پیغمبر اکرمؐ کا حلم، علی مرتضیٰ کا عزم اور حسنؑ مجتبیٰ کا صبر تھا ——— آپ کی رگوں میں فاطمۃ الزہراؑ کا شیر لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ جس نے تن تنہا پوری حکومت سے مقابلہ کیا اور بھرے دربار میں باطل کا بھرم کھول دیا تھا۔

آپ کی عظمت سے قطع نظر کربلا کا ایک ایک آزمائشی لمحہ دوسرے انسانوں کے لئے محالات کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ امامت کا حسن انتخاب تھا یا آفتابِ عظمت کی شعاعوں کا اثر۔ کہ ایک سانچے میں بہتر انسان ڈھل گئے۔ اور ایک حسینؑ بہتر "حسین" میں تبدیل ہو گئے۔

ایک انسان کے لئے اپنے آبائی وطن کو چھوڑنا کوئی معمولی کام نہیں ہے — وطن جہاں اس کے بزرگوں کی قبریں ہوں۔ بچپنے کی یادیں وابستہ ہوں' اعزاء و احباب کا اجتماع ہو اور پھر ایک بچی کو بھی چھوڑے جا رہا ہو ——— لیکن امام حسینؑ نے مذہب کی راہ میں یہ سب برداشت کر لیا۔ ایک بچی کو مدینہ میں چھوڑا اور نانا کے شہر سے رخصت ہو گئے۔

رخصتِ امام حسینؑ

امام حسینؑ کا مدینۂ رسولؐ چھوڑنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ نفسیاتی اعتبار سے امام کے دل پر اس کا جو اثر تھا وہ تو تھا ہی ——— خود اہل مدینہ بھی کچھ کم مضطرب نہیں تھے۔

حسینؑ ——— مدینہ کے ایک باشندے نہیں تھے ——— وہ وارث مدینہ، صاحب مدینہ، جان مدینہ، اور روح روانِ اہل مدینہ تھے۔ مدینہ ان کے نانا کا دار الہجرت تھا۔ مدینہ ان کی مادر گرامی اور ان کے برادر گرامی کا مرقد تھا ——— مدینہ ان کی پرورش گاہ اور ان کے خاندان کا مسکن تھا۔

مدینہ سے امام حسینؑ کو اور امام حسینؑ سے مدینہ کو جس قدر انس و الفت ہونا چاہئیے اس کا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۲۸ رجب کو امام حسینؑ نے مدینہ سے سفر کا عزم کیا تو سارے مدینہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ جسے دیکھو اس کا چہرہ اترا ہوا، حال تباہ، بال پریشان، ایک یاس کا عالم، در و دیوار پر برستی ہوئی حسرت ——— کوچہ و بازار میں اڑتی ہوئی خاک وحشت اور امام مظلوم کا عزم رخصت۔

عبد اللہ بن سنان کوفی راوی ہے کہ میں اسی دن وارد مدینہ ہوا جس دن جانِ مدینہ ——— مدینہ چھوڑ رہا تھا۔ میں نے اہل مدینہ کے چہروں پر عجیب یاس و حسرت کے آثار پائے۔ اور گھبرا کر پوچھا۔ بھائیو! کیا آج کوئی تازہ مصیبت آگئی ہے۔

لوگوں نے کہا ——— آج جان مدینہ وطن سے رخصت ہو رہا ہے محمدؐ کا نواسا، علیؑ کا نور نظر اور فاطمہؑ کا لخت جگر مدینہ چھوڑ رہا ہے ——— حالاتِ زمانہ حسینؑ کو ان کے نانا کے وطن میں رہنے نہیں دیتے۔ اور مجبوراً نبی کے لال کو وطن عزیز چھوڑنا پڑ رہا ہے۔

عبد اللہ کہتا ہے کہ مجھے اس منظر کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ جب وارثِ رسولؐ اپنے وطن عزیز کو ——— اور اہل مدینہ آنسوؤں کی چھاؤں میں

اپنے حسینؑ کو رخصت کر رہے ہوں۔

یہ سوچ کر میں محلۂ بنی ہاشم میں آیا اور دور کھڑا سواری کا منظر دیکھتا رہا ــــــ سیدانیاں بیت الشرف سے برآمد ہوتی رہیں اور ایک ایک کر کے ناقوں پر سوار ہوتی رہیں۔

ایک جوان ہمہ تن اہتمام سفر میں مصروف اور ہر آن انتظامات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

میں نے کسی سے پوچھا۔ یہ کون جوان ہے جو اس قدر مصروف اور منہمک ہے۔ لوگوں نے کہا۔ یہ علیؑ کا لال عباسؑ علمدار ہے جس نے اپنی پوری زندگی امام حسینؑ کی خدمت میں گزار دی ہے۔ اور اپنے کو مولا کا غلام ہی سمجھتا رہا ہے!

قافلہ روانہ ہوا ــــــ پیچھے پیچھے سیدانیوں کے ناقے اور آگے آگے ہاتھ میں پرچم اسلام لئے ہوئے حمزہ و جعفر کا وارث۔ علیؑ کا شیر "عباسؑ" اس پورے قافلہ میں عباسؑ کی انفرادیت دلیل ہے کہ مولائے کائنات نے اپنے اس فرزند کو جس قربانی کے لئے مہیا کیا تھا۔ اس کی راہ میں یہ فرزند کس قدر مستعد ہے۔ اور قربانگاہ کی طرف جانے کا مکمل اہتمام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔

منازلِ راہ

قافلہ مدینہ سے روانہ ہو کر تیسری شعبان کو مکہ معظمہ پہنچا ــــــ اور چند ماہ تک وہیں قیام رہا ــــــ اس کے بعد اہل کوفہ کے اصرار پر امام حسینؑ نے مسلمؑ بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیجا۔ اور لباس احرام میں چھپے ہوئے خنجر کو دیکھ کر حرمت کعبہ کے پیش نظر ۸ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ چھوڑ دیا۔

حج کا موقع۔ ایک دن کا وقفہ ــــــ سارا عالم اسلام کھنچ کر مکہ کی طرف آ رہا ہے اور وارث حرم حج کو عمرہ سے تبدیل کر کے اپنی منزل آخر کی طرف جا رہا ہے۔ ہر ذہن میں ایک سوال ہے۔ ہر دماغ میں ایک جستجو ــــــ حسینؑ کیوں جا رہے ہیں؟

حسینؑ کا قافلہ بیک وقت سوال بھی بنا ہوا ہے اور جواب بھی ــــــ روانگی ایک سوال کا پیش خیمہ ہے اور حج کو عمرہ سے تبدیل کر دینا جواب کی تمہید۔ یقیناً ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ فرزند رسولؐ حج نہیں کر سکتا۔ کچھ ایسے دشمن سامنے آ گئے ہیں کہ حسینؑ ایک دن بھی ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

قافلہ دوبارہ مکہ سے گرم سفر ہوا اور صحراؤں اور بیابانوں سے گزرتا ہوا منزل شراف پر پہنچا۔ اصحاب نے آبادی کا اندازہ کر کے تکبیر کی آواز بلند کی۔ امام حسینؑ نے تکبیر کا سبب دریافت کیا۔

اصحاب نے عرض کیا ہم ایک نخلستان کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جہاں درختوں کا سایہ اور آبادی کا سلسلہ مل جائے گا۔

حضرت نے فرمایا۔ درخت نہیں ہیں یہ ایک لشکر ہے جس کے پرچم بلند ہیں اور گھوڑوں کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ اصحاب نے بغور دیکھا اور بڑھ کر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حُر کا رسالہ ہے جو ابن زیاد کے حکم سے امام حسینؑ کا راستہ روکنے آیا ہے ــــ قافلہ قریب پہنچا اور حُر نے راستہ روکنا چاہا حُر کا ہاتھ حضرت کے لجامِ فرس تک پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا۔

"ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا حُرُّ"

اے حُر تیری ماں تیرے صفِ ماتم میں بیٹھے! یہ کیا بے ادبی ہے ــــ

حُر نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔

فرزند رسولؐ! افسوس کہ میں آپ کو ایسا جواب نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کی مادر گرامی فاطمہؑ زہرا نہ ہوتیں تو میں بھی ایسا ہی جملہ کہتا۔ لیکن بنت رسولؐ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کر سکتا۔

ضمیر اور مصلحت کی جنگ کا اس سے بہتر نقشہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ حُر ضمیر کے اعتبار سے بڑی حد تک پاک و پاکیزہ تھا۔ لیکن مصلحت و ریاست نے ضمیر کی آواز کو روک دیا تھا ــــ امام حسینؑ سے بہتر اس حقیقت کا نباض کون ہو سکتا تھا؟

آپ نے حُر کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے ایک ایسا فقرہ فرمایا جس نے حُر کے ذہن کو امام مظلومؑ کی مادر گرامی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور اب حُر مسلسل اسی خیال میں پیچ و تاب کھا رہا ہے کہ جس سے مقابلہ کر رہا ہے، جس کا راستہ روک رہا ہے، جس کو غریب الوطنی پر مجبور کر رہا ہے وہ فاطمہؑ زہرؑا کا فرزند اور رسول اکرمؐ کا نواسہ ہے۔

اسی خیال نے شب عاشور حر کے موقف میں تبدیلی پیدا کی اور حر یزیدیت کو ٹھکرا کر امام حسینؑ کی خدمت میں آ گیا۔

ظاہر بین نگاہ والے امام حسینؑ کے جملہ کو خلاف اخلاق تصور کرتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ صاحب خلق عظیم کے فرزند کو ایسا فقرہ نہیں کہنا چاہیئے تھا جو عربی تہذیب میں انتہائی سخت فقرہ شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن بعد کے حالات نے واضح کر دیا کہ حر کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں تھا اور امام حسینؑ نے اس جملہ کو تبلیغی ذمہ داریوں کے تحت استعمال فرمایا تھا۔

اگر کل امام حسینؑ نے یہ فقرہ استعمال نہ کیا ہوتا تو آج حر فاطمہؑ زہرا کی دعا اور معصومینؑ کے سلام کا حقدار نہ ہوتا۔

یہ اسی ایک جملہ کا اثر تھا جس نے حر کے دل و دماغ میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور حر کو اس وقت تک قرار نہیں ملا۔ جب تک وہ فرزند رسولؐ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو گیا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس وقت حر کے ہاتھ حضرت کے لجام فرس کی طرف بڑھ رہے تھے اس وقت آپ کے پہلو میں حضرت عباسؑ بھی تھے۔ خدا گواہ ہے کہ امامت کا ادب مانع نہ ہوتا تو ایک وار میں حر کے دونوں ہاتھ قلم ہو جاتے ــــ لیکن عرفان امامت کے پیکر عباسؑ نے اس منظر کو بھی برداشت کر لیا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔

عباسؑ اپنی آنکھوں سے وہ منظر بھی دیکھ چکے تھے جب باپ کا قاتل رسن بستہ سامنے کھڑا تھا۔ اور پدر بزرگوار اس کے لئے شربت کا حکم نافذ فرما رہے تھے ــــ ظاہر ہے کہ جس کا باپ اپنے قاتل کو شربت پلا سکتا ہے۔ وہ بیٹا جذبات سے متاثر

ہو کر ایک گستاخی پر ہاتھ کیونکر قلم کر سکتا ہے۔

عباسؑ کو فطری طور پر وہی کرنا چاہیئے تھا جو ان کے پدر بزرگوار نے کیا —— چنانچہ جیسے ہی لشکر کی حالت دیکھ کر امام مظلوم نے اسے سیراب کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عباسؑ فوراً آمادہ ہو گئے اور دشمن کے لشکر کے ایک ایک سپاہی بلکہ جانور تک کو سیراب کر دیا۔

علی بن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں حر کے رسالہ کا آخری سپاہی تھا اور میری یہ حالت تھی کہ پیاس سے زبان منہ کے باہر آگئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لشکر میں میری باری آتے آتے میں اس دنیا کو چھوڑ چکا ہونگا۔

لیکن اللہ رے ساقیٔ کوثر کے لال کا کرم —— کہ فرزند رسولؐ الثقلین خود اپنی جگہ سے اٹھے اور مشکیزہ لے کر قریب آئے۔ آپ نے اپنے دست کرم سے مجھے سیراب کیا اور میری زندگی کا تحفظ کیا۔

راہ عراق میں یہ عظیم موقع تھا جہاں عباسؑ کے کردار کا ایک پرتو نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ساقیٔ کوثر کے لال نے امام حسینؑ کی اطاعت و فرمانبرداری میں کس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔

اسی راستہ میں ایک مرتبہ حضرت عباسؑ کا کردار دہاں دیکھنے میں آیا جہاں حضرت مسلم کے انتقال کی خبر ملی اور راہ گیروں نے اطلاع دی کہ ہمارے سامنے مسلم کی لاش کو کوفہ کی گلیوں میں کھینچا جا رہا تھا۔

امام حسینؑ یہ خبر سن کر خیمہ کے اندر آئے۔ بہن کو خبر سنائی اور تیمیۂ مسلم کو بلا کر اس کے سر پر دست شفقت پھیرنا شروع کیا —— بنی ہاشم کی بچی تھی سمجھ گئی اور کہنے لگی چچا —— ! یہ انداز کرم تو یتیموں جیسا ہے کیا میرا بابا اس دنیا میں نہیں رہا —— ؟

امام حسینؑ نے تسکین دی اور فرمایا نہیں تیرا باپ حسینؑ زندہ ہے —— شدہ، شدہ یہ خبر بیوۂ مسلم تک پہنچی۔ اور انھوں نے زار و قطار رونا شروع کیا —— زوجۂ مسلمؑ حضرت عباسؑ کی بہن تھیں —— شیر ذوالجلال کے لال نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر بہن کے پاس آیا —— فرمایا بہن صبر کرو —— شیروں کی بہنیں اس طرح نہیں رویا کرتیں —— تمہارا شیر زندہ ہے صبر و ضبط سے کام لو اور راہ خدا میں قربانی کا حوصلہ پیدا کرو۔

جناب مسلمؑ کی شہادت پر زوجۂ مسلم کا کیا عالم ہوا —— اسے تاریخ کی زبان سے مت سنیئے۔

تاریخ جذبات و احساسات کی دنیا میں بالکل گونگی ہے۔ اس کے دہن پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ ان کی ترجمانی انسانی ضمیر اور بشری قلب و دماغ ہی کر سکتا ہے —— تاہم یہ کہنا ممکن ہے کہ جب وارث کی شہادت کی خبر سن کر زوجۂ مسلم بیتاب ہو گئیں تو جب اپنے دونوں فرزندوں کی قربانی کا حال سنا ہوگا تو دل پر کیا گزری ہوگی اور کس طرح صبر کیا ہوگا؟

راہ خدا میں قربانی پیش کرنا اور قربانی پر صبر کر لینا ان کے گھر کا قدیم ترین تاریخی شعار ہے۔ اس میں خانوادۂ رسالت کی ہر فرد ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہے۔ وہ مسلم ہوں یا زوجۂ مسلم —— مولائے کائنات ہوں یا ام البنین۔ سب کے کردار میں ایک انداز نظر آتا ہے اور سب کا ایک مطمح نظر ہے کہ مقصد کی راہ میں ہر عظیم قربانی کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ایک موازنہ

مکہ معظمہ سے روانگی کے موقع پر تاریخ نے جو واقعات محفوظ کئے ہیں۔ انکے مطالعہ سے حضرت عباسؑ کی عظمت و شجاعت کا ایک نیا نشان بھی ملتا ہے۔

پہلا منظر یہ ہے کہ قافلہ حسینی تیار ہو چکا ہے۔ سیدانیاں ناقوں پر سوار ہو چکی ہیں۔ قافلہ آگے بڑھنا ہی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ علیؑ کا عزیز شاگرد ابن عباس سامنے آگیا اور آکر پوچھا۔ فرزند رسولؐ۔ کہاں کا ارادہ ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا ابن عباس عراق جا رہا ہوں۔

ابن عباس نے عرض کی مولا! آپ تو عراق کے حالات سے باخبر ہیں اس علاقہ نے آپ کے پدر بزرگوار اور آپ کے برادر نامدار سے وفا نہیں کی تو آپ اس سے کیا امید رکھتے ہیں؟

فرمایا! ابن عباس! میں راہ خدا میں قربانی پیش کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے مدینہ میں میرے نانا نے تاکید کی ہے کہ حسینؑ! میرا دین بچانا ہے تو عراق جاؤ اور راہ خدا میں قربانی دو۔

ابن عباس نے یہ سنا تو گھبرا کر عرض کی!

فما معنی حملک هذه النسوة

مولا! جب آپ سر کٹانے جا رہے ہیں تو ان عورتوں کو لے جانے کا کیا مقصد ہے! آپ نے فرمایا! ابن عباس "شاء اللہ ان یراهن سبایا"۔

مشیت الٰہی یہی ہے کہ یہ قیدی بنیں ——— میری شہادت کے بغیر دین سرخرو نہیں ہو سکتا ہے ——— اور ان کی قربانی کے بغیر دین الٰہی کو ظالموں سے آزادی نہیں مل سکتی۔

ابن عباس مولائے کائنات سے تربیت یافتہ اور آپ کے عزیز شاگرد ہیں۔ امت اسلامیہ انھیں حبر امت اور مفسر اعظم کے نام سے تعبیر کرتی ہے ——— لیکن ابن عباس کا طرز عمل یہ ہے کہ پہلا اضطراب قربانی کے نام سے پیدا ہوا ——— اور دوسرا اضطراب سیدانیوں کی روانگی سے پیدا ہوا۔

اس کے بالمقابل حضرت عباسؑ کا کردار ہے جو مدینہ سے شہادت کا مکمل عزم کر کے چلے ہیں۔ اور سیدانیوں کو اپنے ہمراہ لے کر چلے ہیں۔ آپ نے مدینہ سے روانگی کے وقت یہ نہیں کہا کہ مولا انھیں نہ لے جایئے ——— بلکہ اپنے زیر اہتمام سیدانیوں کو ناقوں پر سوار کیا اور اپنی نگرانی میں پورے قافلے کو لے کر چلے۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ قافلہ منزل سے آگے بڑھ چکا ہے ——— حضرت عبداللہ بن جعفر مکہ میں رہ گئے ہیں۔ امامت کی مصلحت نے انھیں اپنے ہمراہ نہیں لیا ہے۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک مرتبہ قافلہ رکا ——— معلوم ہوا کہ عبداللہ بن جعفر کے دو فرزند عون و محمد تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ابن جعفر نے ان کے ذریعہ حاکم وقت کا امان نامہ بھیجا ہے ——— اور یہ کہلایا ہے کہ حضور کے لئے امان ہے ——— اب آپ یہیں قیام فرما رہیں۔

امام وقت نے شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے امان نامہ کو قبول نہیں کیا اور قافلے کو آگے بڑھا دیا۔ حضرت عبداللہ نے اپنے دونوں فرزندوں کو ساتھ کر دیا کہ اگر امام مظلوم پر کوئی وقت پڑ جائے تو یہ بچے بھی امام پر قربان ہو جائیں۔

حضرت عبداللہ کی عظمت و جلالت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا ——— وہ جعفر طیار کے فرزند ——— حیدر کرار کے بھتیجے اور ثانی زہراؑ کے شریک زندگانی ہیں۔

ان کی بلندی و برتری کے لئے یہ بہت کافی ہے کہ مولائے کائنات ان سے بیحد محبت فرماتے تھے۔ اور اس حد تک محبت فرماتے تھے کہ ان کے ساتھ اپنی عزیز ترین صاحبزادی کا عقد فرما دیا ہے۔

لیکن اس کے بعد بھی یہ ماننا پڑے گا کہ ابن جعفر عباسؑ علمدار نہیں تھے۔ ابن جعفر نے امان نامہ کو سفر عراق پر مقدم کیا اور چاہا کہ فرزند رسولؐ مصائب والآم سے بچ جائے اور زہراؑ کا گھر اجڑنے نہ پائے۔ ان کی نظر میں قربانی ایک مصیبت تھی اور شہادت ایک الم انگیز مرحلہ۔

لیکن عباسؑ علمدار کے عزم و استقلال کا یہ عالم تھا کہ جب شمر ملعون امان نامہ لیکر آیا تو آپ نے نہایت ہی سختی کے ساتھ امان نامہ کو رد کر دیا اور فرمایا کہ مجھے اس قسم کا کوئی امان نامہ درکار نہیں ہے۔ ایسے امان نامہ پر لعنت اور اس کے لکھنے والے پر بھی لعنت

امان نامہ کو وجہ سکون قرار دینا عبداللہ بن جعفر کا کردار ہے۔ اور امان نامہ کو ملعون قرار دے کر ٹھکرا دینا عباسؑ علمدار کا طرز عمل ہے دونوں انداز نظر میں جو فرق تصور کیا جا سکتا ہے وہی عباسؑ اور ابن جعفر کے کردار کا فرق ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ عباسؑ کو اپنے ہمراہ لے چلے اور ابن جعفر کو منزل پر چھوڑ دیا۔ کربلا کو عباسؑ کی ضرورت ہے ابن جعفر کی نہیں۔ ابن جعفر کا کردار وطن کے شایان ہے اور عباسؑ علمدار کا کردار کربلا کے لئے سزاوار ہے۔

ساحلِ مقصود

اس سے آگے جو بڑھا قافلۂ بطحائی
دفعتاً زیر قدم سرحد مقصود آئی
[illegible]
کشتیٔ نوح غریباں سر ساحل پہنچی

(جمیل مظہری)

محرم کی دوسری تاریخ تھی جب حسینی کارواں اپنی آخری منزل پر پہنچ گیا

" اور چلتے چلتے رک گیا گھوڑا حسینؑ کا "

امام عالی مقام نے گھوڑے کو مہمیز کیا لیکن اس نے قدم آگے نہیں بڑھائے آپ گھوڑے سے اتر پڑے اور آپ نے قریب کے لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ اس زمین کا کیا نام ہے؟

لوگوں نے کہا! ماریہ ——— فرمایا کیا اس کا کوئی اور بھی نام ہے؟ لوگوں نے کہا نینوا! پھر آپ نے یہی سوال کیا۔ لوگوں نے کہا۔ غاضریہ ——— آخر میں کسی کی زبان سے نکل گیا " کربلا " آپ نے فرمایا

" ھٰذِہٖ اَرْضُ کَرْبٍ وَّ بَلَا "

یہ کرب و بلا کی سرزمین ہے ——— یہیں ہمارا قیام ہوگا ——— یہیں ہمارے خون بہیں گے۔ یہیں ہمارے اہل حرم قیدی بنائے جائیں گے ——— یہ کہہ کر قافلہ کو روک دیا اور سامان سفر اترنے لگا۔

گھوڑے کا یکبارگی رک جانا ـــــــ سات گھوڑوں کے تبدیل کرنے کے بعد کسی بھی گھوڑے کا قدم آگے نہ بڑھانا ـــــــ خود ایک مستقل علامت تھی چہ جائیکہ خود امام مظلوم نے مستقبل کے واقعات پر مکمل طور پر روشنی بھی ڈال دی اس کے بعد تو ہر ساتھی اور ہر بچے کی یہ تمنا ہونا چاہیئے تھی کہ مولا قافلے کو آگے بڑھا دیجئے یہ جگہ قیام کرنے کی نہیں ہے۔ اس سرزمین کے بارے میں متعدد خبریں ہمارے کانوں میں پڑی ہوئی ہیں۔

لیکن روایات گواہ ہیں کہ اس علاقہ کے باشندوں نے اس سرزمین پر قیام کرنے سے روکا اور اس کے سابقوں سے آگاہ کیا۔ لیکن کسی بچے نے قربانی دینے میں تکلف نہیں کیا۔

اس مقام پر بھی حضرت عباسؑ کا جذبۂ قربانی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے بنی ہاشم کا غیرت دار جوان عورتوں اور بچوں کے قیدی بنائے جانے کی خبر سنتا ہے اور اف تک نہیں کہتا۔ حکم حاکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ مرضی مولا از ہمہ اولیٰ کا اس سے بہتر نمونہ کیا ہو سکتا ہے۔

قافلہ رکا ـــــــ پانی کا کنارہ دیکھ کر خیمے نصب کئے گئے ـــــــ صحرا بیابان کا معاملہ بچوں کا ساتھ ـــــــ لو، دھوپ کا عالم ـــــــ ضرورت تھی کہ قافلہ کسی مناسب جگہ پر ٹھہرے اور خیمے کسی محفوظ جگہ پر نصب کئے جائیں۔ "قمر بنی ہاشم" نے اپنی آخری منزل تلاش کی اور دریا سے قریب خیمے نصب کر دیئے

بظاہر بچوں کو یک گونہ سکون ملا کہ غربت و مسافرت سہی ـــــــ صحرا و بیابان سہی ـــــــ وطن سے دور سہی ـــــــ کم از کم پانی سے تو قریب ہیں۔ لیکن ایک دن گزرا تھا کہ حر کی اطلاع پر ابن زیاد نے ابن سعد کو بھیج دیا

اور اس نے کربلا کی زمین پر وارد ہوتے ہی پہلا پیغام یہ سنایا کہ آپ فرات کے کنارے سے اپنے خیمے ہٹا لیجئے۔ یہاں لشکر یزید کے خیمے نصب ہوں گے۔

اصولی اعتبار سے جس نے پہلے قبضہ کر لیا تھا اس کے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں تھا ـــــــ پھر فرات لشکر یزید کی ملکیت بھی نہیں تھا۔ اس کا معنوی تعلق امام حسینؑ کی مادر گرامی کے مہر سے تھا۔

یہاں سے خیمے ہٹائے جانے کا مطالبہ ایک جنگ کو دعوت دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور جنگ بھی کس سے؟ ـــــــ حیدر کرارؑ کے لال سے۔ شیر بیشۂ ذوالجلال سے۔؟

مسئلہ بڑے نازک موڑ پر آ گیا ـــــــ غیرت ہاشمی کو جوش آنے ہی والا تھا کہ حکم امامؑ درمیان میں آ گیا اور جن ہاتھوں نے خیمے نصب کئے تھے وہی خیمے اکھاڑنے میں مصروف ہو گئے۔

ضبط نفس اور صبر و تحمل کا اس سے اعلیٰ مظاہرہ تاریخ عالم میں نہ ملے گا کہ ہمت آزما بہادروں کا قافلہ اس طرح دریا کا کنارہ چھوڑ دے اور چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت دریا سے دور خیمہ زن ہو جائے۔

کیا علیؑ کے لال کو اتنا بھی کہنے کا حق نہیں تھا کہ میں نے صفین کا معرکہ دیکھا ہے۔ جہاں نہر پر قبضہ کرنے کے بعد پانی بند کیا گیا اور دشمن کی فوج کو پانی سے الگ نہیں کیا گیا۔

میں نے ابھی اسی حر کے لشکر کو سیراب کیا ہے اور دشمنی کے باوجود ان کا پیاسا رہنا برداشت نہیں کیا۔

میرا باپ ساقیٔ کوثر ہے جس سے تم سب کی عاقبت وابستہ ہے اور وہی گرمی محشر میں کام آنے والا ہے۔

میری مادر گرامی فاطمہ زہرا ہیں جن کے مہر میں فرات کا پورا دریا دیا گیا ہے۔ کہا اور ضرور کہا۔ لیکن امام حسینؑ نے ان باتوں کو اپنی بلندی نفس کے منافی سمجھا اور دشمن پر کوئی احسان رکھے بغیر فرات سے خیمے ہٹا لئے۔

غیر حساس مورخ جنگ کے نقشہ پر نظر رکھتا ہو تو خیر ——— ورنہ ضبط نفس سے بالاتر کوئی جہاد نہیں ہے اور اس موقع پر عباسؑ علمدار نے جس جہاد نفس کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس نیزہ کی جنگ سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو عاشورہ کے دن واقع ہوئی۔

ایک سوال

سرزمین کربلا پر وارد ہونے اور فرات کے کنارے سے خیمے ہٹائے جانے کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام مظلومؑ نے بار بار لوگوں سے زمین کے نام کے بارے میں کیوں سوال کیا۔

کیا آپ کو اس سرزمین کا نام معلوم نہیں تھا۔ کیا اس علاقہ کی حقیقت سے واقف نہیں تھے۔

اور پھر جب آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کربلا ہے اور یہاں ہمیں پیاسا ہی شہید ہونا ہے تو فرات کے قریب خیمے کیوں نصب کرائے کہ بعد میں خیمے اٹھائے

جانے کی نازک منزل کا سامنا کرنا پڑے؟

جہاں تک سوال کے پہلے جزو کا تعلق ہے۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ خود واقعہ کی نوعیت امام حسینؑ کے علم کی بین دلیل ہے۔

آپ کو زمین کی واقعیت کا علم نہ ہوتا تو پہلے ہی سوال کے بعد آگے بڑھ جاتے اور دوسرا سوال نہ اٹھاتے۔

بار بار سوال خود اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت کے پیش نظر واقعات و مقامات کی مکمل تفصیل ہے۔ صرف ظاہری طور پر معاملات کو عام قانون کے تحت لانے کے لئے اس قسم کے اقدامات فرما رہے ہیں۔

اس کا واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ خود گھوڑا چلتے چلتے رک گیا ہے اور سات گھوڑے تبدیل کرنے کے بعد بھی کوئی گھوڑا آگے نہیں بڑھا۔

کیا کوئی صاحب عقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ گھوڑے کو سرزمین کی اطلاع ہو اور امام حسینؑ کو اطلاع نہ ہو۔ جب کہ گھوڑے کا یہ احساس اور اس کی یہ فراست بھی سوار کے روحانی تصرف ہی کا نتیجہ ہے۔

ایسے عظیم احساسات کو فرس کی فراست کا نتیجہ قرار دینا عدم فراست کی دلیل ہے۔ ایسے مقامات پر انسان کی فراست کام نہیں کرتی تو جانور کا کیا ذکر ہے۔ یہ امامت کے معنوی تصرفات کا اثر ہے جو قوت احساس کو اس قدر تیز تر کر دیتا ہے کہ جانور کے احساسات انسانوں سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔

اس تصرف کی ایک واضح نشانی جنگ جمل کا واقعہ ہے جہاں مقام حواب کے کتوں نے "ام المومنین" کی سواری کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا اور کسی قیمت پر ان کا آگے بڑھنا برداشت نہیں کیا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اجنبی جگہ کے کتے کسی شخص کو نہیں پہچانا کرتے . . .

خاص طریقہ سے اس کے پہچاننے کا سوال ہی نہیں ہے جو پردہ نشین اور محل کے اندر ہو ——— لیکن یہ امامت کے تصرفات کا اثر ہے کہ امام سے جنگ کرنے والے قافلہ کو ہر مخلوق نے حسب حیثیت روکنے کی کوشش کی۔ اب یہ انسان کی کم نصیبی ہے کہ وہ ان مناظر عبرت سے فائدہ نہ اٹھائے اور آخر میں اس شدید ندامت کا شکار ہو جس میں ام المومنین تا حیات مبتلا رہیں۔

مجھے اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ اسے امامت کا تصرف شمار کیا جائے ——— ممکن ہے یہ نبوت کا تصرف ہو کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں سے کسی ایک کے مقابلہ میں حواب کے کتے بھونکیں گے اور کتوں نے نبوت کی خبر کی لاج رکھنے کے لئے شور مچانا شروع کر دیا ہو۔

مجھے صرف کتوں کی ذاتی استعداد اور ان کی فطری صلاحیت سے اختلاف ہے اس کے علاوہ ہر تصرف کا احتمال دیا جا سکتا ہے۔ اس کا تعلق نبوت سے ہو یا امامت سے ——— نبوت و امامت کے تصرفات میں بھی کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

سوال کے دوسرے جزو کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ امام حسینؑ علم امامت سے شہادت اور اس کے تفصیلات و خصوصیات کو جاننے کے باوجود ظاہری قانون کے اعتبار سے حفاظت کے مکمل انتظامات بھی کر رہے تھے ——— حفاظت خود اختیاری کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد قتل ہو جانا شہادت ہے۔ اور حفاظت کے بغیر جان کو معرض ہلاکت میں ڈال دینا خودکشی۔

اسلام نے شہادت کی تعریف کی ہے ——— اسے زندگانیِ جاوید سے تعبیر کیا ہے۔ ہلاکت کو ممدوح یا محبوب نہیں قرار دیا۔

شرعی قانون کے تحت آپ کا فرض تھا کہ بچوں کی پیاس کا باقاعدہ خیال

رکھتے اور ان کے لئے پانی کا ہر ممکن انتظام کرتے ——— اس کے بعد اگر اس سے کوئی اہم مصلحت معارض ہو جائے تو اس کا لحاظ ضروری ہے۔ روح شریعت اسی اہم اور غیر اہم کی شناخت ہے۔ تکلیف شرعی کا اندازہ کئے بغیر قدم اٹھانا تدین نہیں ہے۔ بے دینی ہے۔

امام حسینؑ سے بہتر ان حقائق سے باخبر کون ہے ———
آپ نے یہ برداشت کر لیا کہ فرات کے کنارے سے خیمے ہٹا دیئے جائیں اور دشمن کو یہ طنز کرنے کا موقع مل جائے کہ ہم نے پہلے ہی مرحلے پر حیدرؑ کرار کے لال کو شکست دے دی۔

لیکن یہ برداشت نہیں کیا کہ میری شہادت کو خودکشی قرار دیا جائے اور کسی ایک شخص کو بھی یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ انھوں نے تو فرات کا کنارہ چھوڑا ہی اس لئے تھا کہ پیاس سے ہلاکت ہو جائیں اور بچے مظلومیت کے ساتھ مر جائیں اور پھر یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہمارا بھرا گھر پیاس کی شدت سے تباہ ہو گیا ہے۔

کربلا کی بندشِ آب اور مدینہ کی بندشِ آب کا ایک نمایاں فرق یہی ہے کہ "محصورِ مدینہ" عثمان کے سامنے بندشِ آب کے مقابلہ میں ایک قابل قبول سوال تھا اور امام حسینؑ کے سامنے ناقابل قبول مسئلہ تھا۔

مدینہ میں محاصرین کا مطالبہ تھا کہ آپ اپنے گورنر کو معزول کر دیں۔ اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کریں۔

اپنے عطایا کا سلسلہ روک دیں۔ اپنی زمام حکومت مروان کے ہاتھ سے لے لیں ——— محاصرین کی جماعت میں سے کسی ایک شخص نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ آپ ہمارے سپرد کر دیں اور ہماری طلبیوں میں سے اتفاق کر لیں یا ہمارے ہم خیال بن جائیں۔

یہ حضرت عثمان کی "سادگی" یا ضدی طبیعت تھی کہ انھوں نے ان "صحیح یا غلط" مطالبات کو مسترد کر دیا اور آخر ش "بندش آب" کا شکار ہو گئے ـــــــ ان کے مخالفین کا مطالبہ غلط اور ناجائز بھی تھا تو اس کا تعلق ان کی ذات یا ملکی سیاست سے تھا۔ اور ایسے مسائل میں اپنی رائے سے پیچھے ہٹ جانا اور حزب اختلاف کے مطالبہ کا قبول کرنا کوئی غیر شرعی امر نہیں ہے۔

کربلا کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں امام حسین کے پیش نظر کوئی ذاتی یا سیاسی مطالبہ نہ تھا۔

ذاتی اور سیاسی مرحلہ پر تو حضرت برابر اعلان کر رہے تھے کہ مجھے چھوڑ دو میں یمن، روم، ہند کسی دور دراز مقام پر چلا جاؤں ـــــــ میں تمہارے امور مملکت میں مداخلت نہیں کرتا ـــــــ خاموشی سے زندگی گزار رہا ہوں ـــــــ تم نے مہمان بلا کر مجھ سے دغا کی اور آج میرے قتل کے درپے ہو۔

امام حسینؑ سے یزید کا مطالبہ تمام تر مذہبی نوعیت کا تھا ـــــــ یعنی بیعت

بیعت کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؑ معاذ اللہ یزید کے ہاتھ بک جائیں اس کی حکومت کو اسلامی تسلیم کر لیں اور اس کے ہر نیک و بد کی تائید کر دیں (اگر یزید کی زندگی میں نیک کام کا تصور ہو۔

امام حسینؑ کی نوعیت ایک عام مسلمان کی نہیں تھی کہ اس کی بیعت صرف اس کے مذہب و دین پر اثر انداز ہو۔ آپ اپنے دور کے وارث شریعت اور پورے اسلامی آئین کے ذمہ دار تھے۔ آپ کی بیعت ایک متدین کی بیعت نہ تھی بلکہ اصل دین کی بیعت تھی۔ آپ کا ایک بک جانا ایک انسان کی ضمیر فروشی کے مرادف

نہ تھا بلکہ رسالت و توحید کے بیچ دینے کے مرادف تھا۔

اس لئے آپ نے تمام مصائب کو برداشت کر لیا اور بیعت قبول نہ کی۔

خدا جانتا ہے کہ امام حسینؑ کے پیش نظر بیعت جیسے غیر شرعی مطالبہ کے علاوہ کوئی بھی سخت سے سخت تر مطالبہ ہوتا تو آپ اسے قبول فرما لیتے اور اتنی بڑی قربانی نہ دیتے۔

لیکن مقدر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ یزید کی شقاوت و بدبختی بیعت ہی کا مطالبہ کرے اور امام حسینؑ اس مطالبہ کو قبول کرنے سے مجبور ہو جائیں جس کے نتیجہ میں انھیں شہادت کی منزل سے ہمکنار ہونا پڑے۔

کربلا کے مصائب میں "بندش آب" کو قبول کر لینا حفاظت خود اختیاری کے بعد کی منزل تھی ـــــــ جہاں اس سے بچنے کی کوئی شرعی سبیل نہ تھی اور یہی امام حسینؑ کے کردار کی اہم ترین دلیل ہے کہ آپ نے ہر ممکن مصیبت کو برداشت کر لیا اور یزید کے کسی غیر شرعی مطالبہ کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

لَا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَۃً وَ الْحَیَاۃَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَمًا

"میں موت کو نیک بختی سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو بدبختی و کم نصیبی۔"

نصبِ خیام اور جناب زینبؑ

ادھر جناب عباسؑ خیام حسینی کے نصب کرنے میں مصروف تھے اور ادھر امام حسینؑ خیمہ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بے ثباتی دنیا کا اعلان کر رہے تھے۔

یَا دَهْرُ اُفٍّ لَكَ مِنْ خَلِيلِ
كَمْ لَكَ بِالْاِشْرَاقِ وَالْاَصِيلِ

جناب زینبؑ نے بھائی کے یہ اشعار سنے اور سنتے ہی غش کھا گئیں۔ اللہ ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرا بھیا مجھ سے چھٹ جائے گا۔ یہ میرے بھائی کی قتل گاہ ہے جہاں آج زینبؑ وارد ہوئی ہے۔"

امام حسینؑ نے یہ منظر دیکھا تو دوڑ کر بہن کے پاس آئے اور پانی چھڑک کر ہوش میں لائے۔

(اثارۃ الاحزان قلمی کتب خانہ خدا بخش پٹنہ)

مقاتل سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دوسری محرم کا ہے جب حرم حسینی وارد کربلا ہوئے اور خیام حسینی نصب کئے گئے۔ اس لئے لکلوز العین ص۲۷ میں اس کے بعد کی عبارت یہ ہے۔

"ثُمَّ دَخَلْنَ الْخِيَامَ يَتَصَايَحْنَ وَعَلَتْ اَصْوَاتُهُنَّ بِالْبُكَاءِ وَالنَّحِيبِ فَدَخَلَ اِلَيْهِنَّ الْخِيَامَ وَقَالَ لَهُنَّ صَبْرًا يَا اَهْلَ الْبَيْتِ فَقَالَتْ زَيْنَبُ لَا صَبْرَ لَنَا عَلٰى فَقْدِكَ وَلَا

تَطِيبُ لَنَا الْحَيٰوةُ مِنْ بَعْدِكَ كَيْفَ لَا نَبْكِي وَاَنْتَ تَقُولُ هٰذَا الْكَلَامَ وَنَرَاكَ قَتِيلًا وَمَالَكَ نَهْبًا بَيْنَ الْعِدٰى وَحَرِيمُكَ سَبَايَا۔"

اس کے بعد سیدانیاں داخل خیام ہوئیں اور نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہو گئیں ـــــ امام عالی مقام خیمہ میں داخل ہوئے اور فرمایا۔ میرے اہل بیت صبر کرو! جناب زینب نے فرمایا۔ بھیا تمہارے فراق پر کیسے صبر کروں۔ تمہارے بعد زندگی کیسے اچھی لگے گی۔

بھیا کیسے نہ روؤں۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ جیسے آپ شہید ہوں گے آپ کا مال تباہ ہو گا اور آپ کے اہل حرم قیدی بنیں گے۔

بعض ارباب قلم نے اس مقام پر شدید اشتباہ فرمایا ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ واقعہ ۹ محرم کا ہے ـــــ جس کے بعد وجود آب کی ایک پوری بحث عالم وجود میں آگئی ہے۔ اور مخلصین ولا اہل بیت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ۹ محرم کو امام حسینؑ کو پانی کہاں سے میسر ہو گیا کہ بہن کے چہرہ پر پانی چھڑک کر انھیں ہوش میں لے آئے۔

علامہ شہرستانی نے اس اشتباہ کی بہترین تاویل کی ہے کہ پانی چھڑکنے سے مراد اشک افشانی ہے۔

امام حسینؑ کے پاس پانی تو نہیں تھا البتہ اشکوں کی فراوانی تھی۔ چنانچہ آپ نے آنسوں چھڑک کر بہن کو بیدار کیا اور جناب زینبؑ کو ہوش میں لے آئے۔

علامہ موصوف کو یہ ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انھوں نے بھی واقعہ اسی وقت کا خیال کیا ہے جب خیموں میں پانی کا قحط ہو چکا تھا اور امام عالی مقام کے لئے پانی چھڑکنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

حالانکہ یہ واقعہ ۲ محرم[1] کا ہے جس وقت خیام میں قطعی طور پر پانی کا امکان موجود تھا اور حضرت بہن کو ہوش میں لا سکتے تھے ـــــــ تاہم علامہ شہرستانی کا یہ اشتباہ قابل تحسین ہے کہ انھوں نے روایت کے مفاسد پر نظر کی اور اس کی ایک تاویل پیش کر دی۔

ان کی تاویل ان تمام ارباب قلم کے لئے شمع راہ ہے جنہوں نے دوسری محرم کو نویں محرم بنا دیا ـــــــ لیکن وجود آب کے مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے دور از کار تاویل میں لگ گئے۔

خیام حسینی

فرات کا کنارہ چھوڑنے کے بعد امام حسینؑ کے خیام کس مقام پر نصب ہوئے۔ یہ ایک تاریخ کا اہم مسئلہ ہے جسے اکثر مورخین نے نظر انداز کر دیا ہے۔ علامہ اسفراینی نے اس کی مقدار ایک فرسخ کے قریب بتائی ہے۔ یہ فاصلہ اگرچہ بادی النظر میں قرین قیاس نہیں ہے لیکن ظلم یزید کے پیش نظر اور دشمن کے اپنی فوجوں کی رہائش گاہ کے انتظامات کے لحاظ سے زیادہ بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ دشمن کا تمام تر مدعا یہی تھا کہ ہماری ساری فوج دریا سے قریب رہے اور امام حسینؑ کا کوئی سپاہی دریا کے قریب نہ آنے پائے۔

---

[1] ترجمہ فارسی تاریخ اعثم کوفی ص ۳۶۶

دشمن کی فوج بھی کوئی معمولی فوج نہ تھی ـــــــ کم سے کم تعداد تیس ہزار کی بتائی جاتی ہے۔

پانچ یا چھ ہزار فوج تو روز اول ہی ابن سعد لے کر نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد ۴ ہزار شمر لایا۔ ۲ ہزار یزید ابن رکاب۔ ۴ ہزار حصین بن نمیر۔ ۳ ہزار مضار بن رہینہ۔ ۲ ہزار نصر ابن خرشہ۔ ۴ ہزار عروہ بن قیس۔ دس ہزار سنان بن انس۔ ۱ ہزار محمد بن اشعث۔ ۱ ہزار عبداللہ الحصین۔ ۴ ہزار شیث ابن ربعی لے کر آیا تھا۔

اور صاحب دمعۂ ساکبہ کی روایت یہ ہے کہ یزیدی لشکر میں ۸۰ ہزار سوار صرف کوفے سے آئے تھے۔ جن میں کوئی شامی یا حجازی نہ تھا (دمعہ ساکبہ ص ۳۲۲)

اس کے علاوہ کوفہ میں ابن زیاد کا اعلان عام تھا کہ کوفہ بالکل خالی کر دیا جائے اور تمام لوگ کربلا قتل حسینؑ کے ارادہ سے روانہ ہو جائیں۔ حد ہو گئی کہ ایک شخص شام سے اپنا قرض وصول کرنے آیا تھا تو اسے بھی اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ کربلا کیوں نہیں گیا۔

(ابصار العین علامہ سماوی ص ۱۸)

ایسے حالات میں فوجیوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ابن زیاد کے امکان میں جتنے سپاہی بھی تھے سب کربلا بھیج دیئے گئے تھے۔

اتنی بڑی فوج کی ضرورت کیا تھی؟ اس کی بہت سی توجیہات ہیں۔ بعض ارباب قلم کا اندازہ ہے کہ ابن زیاد لشکروں کی کثرت سے امام حسینؑ کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ ابن زیاد خود اس قدر مرعوب تھا

کہ لشکر پر لشکر بھیجے جا رہے تھے۔ اور یہ بات بڑی حد تک قرین قیاس بھی ہے۔

ابن زیاد کا ایک تلخ تجربہ یہ بھی تھا کہ اس نے حضرت مسلمؑ جیسے غریب الدیار تنہا انسان کے لئے جس قدر فوج بھیجی تھی وہ ناکافی ہو گئی۔ اور اب تو بہت سے بہادر یکجا ہو گئے ہیں۔ جن میں صفین کا کمسن مجاہد عباسؑ بھی ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ ابن زیاد جیسے جری کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہو —— وہ تو خود ہی اس قدر مرعوب تھا کہ اتنی فوج کے باوجود میدان کربلا تک آنے کی ہمت تک نہ کر سکا تھا۔

اس کے سامنے مولائے کائنات کا یہ فقرہ بھی رہا ہو گا کہ جب شام کے حاکم معاویہ نے مولائے کائنات کے سفیر حضرت . . . طرماح بن عدی سے کہا تھا کہ میں نے علیؑ کے لئے رائی کے دانوں جیسا لشکر مہیا کیا ہے —— تو طرماح نے جواب دیا تھا کہ علیؑ نے ایک مرغ پال رکھا ہے جو سارے دانوں کو ایک دفعہ میں ہضم کر جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جس علیؑ کا تربیت کردہ مالک اشتر اتنا بڑا سورما اور سادنت ہو کہ ایک لاکھ کا تنہا مقابلہ کرے —— اس کا عباسؑ کس قدر شجاع اور بہادر ہو گا۔

آفریں آفریں اے منتظم لشکر شاہ
واہ لاکھوں سے بہتّر کو لڑانے والے

فلسفۂ جہاد اور زمینِ کربلا

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے فرات کا کنارہ چھوڑنے کے بعد کربلا کے باشندوں کو طلب کیا اور ان سے اس علاقہ کی زمینوں کی خریداری کے بارے میں دریافت فرمایا۔

جب وہ لوگ تیار ہو گئے تو آپ نے ۴ مربع میل زمین ۶۰ ہزار درہم میں خرید فرمائی۔
(کشکول بہائی)

زمین کی خریداری کے بعد آپ ان زمینداروں کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ میں یہ زمین تم لوگوں کے نام ہبہ کئے دیتا ہوں —— لیکن اس کی چند شرائط بھی ہیں۔

ہماری قبروں پر کاشت نہ کرنا۔ ہمارے زائروں کو نشان قبر بتاتے رہنا۔ ہر زائر کو اپنا مہمان بنانا اور تین روز تک مہمان نوازی کرنا وغیرہ۔

اس مقام پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں

(۱) اس عالم غربت و مسافرت میں امام حسینؑ نے زمین کو کیوں خرید فرمائی۔
(۲) خریداری کے بعد اسے ہبہ کیوں کر دیا۔
(۳) ہبہ کو مشروط کیوں قرار دیا۔

پہلے سوال کا حل اسلام کے فلسفۂ جہاد میں تلاش کیا جا سکتا ہے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دین اسلام نے ابتدائی تبلیغی جہاد کو بھی روا رکھا ہے اور صاحب امر کو اجازت دی ہے کہ وہ تبلیغی اتمام حجت کے بعد جنگ کا آغاز کر دے لیکن تاریخی اعتبار سے کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ اسلام نے اس قسم کا کوئی اقدام کیا ہو ـــــــ جہاد کے لئے ہمیشہ اس امر کا التزام رکھا گیا ہے کہ دشمن کی طرف سے پہل ہو جائے تو اس کے بعد کوئی جوابی کاروائی کی جائے۔

یعنی اسلام نے جہاد کو ہمیشہ دفاعی رنگ دیا ہے ابتدائی کاروائی نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام کی تمام جنگوں کا محل وقوع بلاد اسلام سے قریب تر اور دیار کفر سے دور تر تھا ـــــ کفر حملہ آور ہوا کرتا تھا تو اسلام اس کے دفاع کے لئے میدان میں اترتا تھا۔

میدان جنگ نہ اسلامی علاقہ ہوا کرتا تھا اور نہ کفر کا علاقہ ـــــــ لیکن اسلامی علاقہ سے قریب تر ضرور ہوتا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ جارح اور حملہ آور کفر ہے اسلام نہیں ہے۔

تاریخ میں ایک ہی موقع آیا تھا جہاں اسلام پر جارحیت کا الزام آ سکتا تھا لیکن حضور سرور کائنات کے کمال تدبر نے اس موقع کو نہایت خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور حدیبیہ کی منزل پر جنگ کے بجائے صلح فرمالی۔

فتح مکہ میں بھی مرسلؐ اعظم نے تلوار سے کام نہیں لیا۔ کہ کفر والوں کو اسلام پر جارحیت کا الزام لگانے کا موقع نہ ملے۔

مرسلؐ اعظم کے بعد جمل وصفین و نہروان کے معرکے بھی اسی نوعیت کے ہیں مولائے کائنات پوری مملکت اسلامی کے سربراہ تھے۔ آپ کو حکومت کرنے کا خدائی اور جمہوری دونوں قسم کا حق حاصل تھا۔

اب جو بھی جنگ ہو گی وہ آپ ہی کے علاقہ میں ہو گی ـــــــ لیکن

اس کے باوجود آپ نے کمال اہتمام یہ فرمایا کہ دشمن کے ناپاک عزائم کو اس وقت تک برداشت کیا جب تک دشمن آپ کے علاقہ میں نہ آ گیا۔

" بغاوت " کے اصولوں سے معاویہ کو شام کا حاکم تسلیم بھی کر لیا گیا تو عراق کسی قیمت پر معاویہ کے زیر اقتدار نہیں تھا۔

مولائے کائنات کے کمال سیاست کا شاہکار تھا کہ آپ نے صفین کی لڑائی شام کے علاقہ میں نہیں ہونے دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ دشمن کی پیش قدمی بھی برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ دشمن آپ کے حدود مملکت میں آ گیا تو آپ نے جوابی کاروائی کے لئے قدم اٹھا لیا۔

جمل کا واقعہ اس سے کہیں زیادہ واضح ہے۔ ام المومنین عائشہ نہ حاکم تھیں نہ سربراہ مملکت۔ انھیں کسی کے علاقہ میں نہ صف آرائی کرنے کا حق تھا اور نہ جہاد کا۔ عورت ہونے کے اعتبار سے بھی ان سے جہاد ساقط تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے اقدام کیا تو امیر المومنینؑ نے اس وقت تک سکوت اختیار فرمایا جب تک ان کی فوجوں کی مکمل زیادتی سامنے نہ آ گئی۔

نہروان کی جنگ باغیوں کی سرکوبی کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہمیشہ حکومت کی سرزمین پر واقع ہوتی ہے۔ اس میں علاقائی سالمیت جیسی کسی چیز کا نام نہیں لیا جاتا اور حملہ آور طے کیا جاتا ہے۔ باغی بہر حال حملہ آور ہوتا ہے چاہے اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ بیٹھا رہے۔ حقیقی طور پر مسلم الثبوت حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا حملہ آوری اور فوج کشی سے کم نہیں ہے۔

رسول اسلامؐ اور امیر المومنینؑ نے ایک طرف دشمن کے حملہ کا انتظار کر کے اپنے مجاہدات کو دفاع کا رنگ دیا اور دوسری طرف یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام کسی کے علاقہ پر حملہ آور نہیں ہوتا۔

آج کی جنگ اور کل کے جہاد کا ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ آج کے ممالک دشمن کو یہ چیلنج دیتے ہیں کہ لڑائی تمہاری زمین پر ہوگی اور اسی کو اپنی فتح و کامرانی کا شاہکار سمجھتے ہیں۔

اسلام نے ہمیشہ اس بات کا انتظار کیا کہ لڑائی ہمارے علاقہ میں ہو تا کہ ہمارے اوپر جارحیت کا الزام نہ آنے پائے۔

مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مسلسل مصائب جھیلنے کے بعد بھی مرسلؐ اعظم کا تلوار نہ اٹھانا۔ اور مدینہ پہنچتے ہی جہاد کا اعلان کر دینا۔ حالات کی نشاندہی کے ساتھ اسلامی فلسفۂ جہاد کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

مکہ معظمہ حرم الٰہی ہونے کے علاوہ کفر و اسلام کی مشترک بستی تھا۔ یہاں ہونے والی جنگ کو خانہ جنگی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ مرسلؐ اعظم نے اس امر کا انتظار کیا کہ میں مشترک بستی سے نکل کر کسی ایسی جگہ پر چلا جاؤں جو میرا مخصوص علاقہ ہو اور وہاں کفر کا کوئی ادعائے ملکیت نہ ہو۔

مدینہ کی سرزمین اس مقصد کے لئے بہترین سرزمین تھی۔ وہاں کے لوگوں نے حضورؐ کو مہمان کیا تھا۔ آپ کو پناہ دی تھی۔ اور آپ کا دار الہجرہ بنا دیا تھا۔ یہاں کفار قریش کا کوئی دخل نہیں تھا۔

سرکار دوؐ عالم کو اطمینان تھا کہ اس سرزمین پر ہونے والی ہر جنگ دفاعی جنگ بنے گی اور مجھ پر جارحیت کا الزام نہ آسکے گا۔ اس لئے آپ نے جہاد کا حکم دے دیا اور برابر غزاوت کا سلسلہ قائم رہا۔

سنہ ۶ھ میں اس کی نوعیت بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ اور حضورؐ بارادۂ حج بیت اللہ مکہ معظمہ کی طرف گئے تھے۔

مکہ معظمہ آپ کا وطن تھا لیکن ہجرت کے بعد کفر کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور

اور اب اسے کفر کا علاقہ شمار کیا جاتا تھا۔

ایسی حالت میں کوئی ایک قطرہ خون بھی بہہ جاتا تو اسلام کا پاک و پاکیزہ دامن جارحیت کے داغ سے داغدار ہو جاتا اور اس کی پیشانی پر ایک بدنما دھبہ لگ جاتا۔

مرسلؐ اعظم نے حالات کی نزاکت کا مکمل اندازہ کر لیا اور حکم الٰہی کے تحت صلح فرمالی۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اس موقع پر بھی بعض مسلمانوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق سکوت نہیں کیا بلکہ اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا یہاں تک کہ بعض نے تو حضورؐ کی رسالت ہی کو مشکوک بنا دیا۔

لیکن حضورؐ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے ارادہ پر قائم رہے امیر المومنینؑ نے صلح نامہ لکھا اور آپ حج کو ترک کر کے واپس تشریف لے گئے۔

مرسلؐ اعظم کا عزم و استقلال اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا موقف اس بات کا گواہ ہے کہ رسولؐ اکرم جس روح اسلام سے آشنا ہیں۔ آپ جہاد کی جو اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں میں نہیں ہے ——— یہ صرف تلوار چلانا جانتے ہیں۔ انھیں لڑنے مرنے سے کام ہے۔ ان کے حصے میں جاہلیت کی غارت گری ہے اسلام کا جہاد نہیں ہے۔

انھیں یہ خبر بھی نہیں ہے کہ حضور اکرمؐ کے اس عظیم کردار کی مصلحت کیا ہے اور آپ موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ کیوں نہیں کرتے؟

رسول اکرمؐ کے بعد آپ کی ذریت نے اسلامی جہاد کی شان کو مکمل طور پر برقرار رکھا اور کسی محل پر بھی جہاد کے فلسفہ کو بدنام نہیں ہونے دیا۔

امام حسینؑ پنجتنؑ پاک میں آخری فرد تھے جن کے حصہ میں جہاد کا میدان آیا تھا۔

——— آپ ظالموں کے ظلم سے غریب الوطن ہو چکے تھے ———

مدینہ آپ سے چھٹ چکا تھا۔ ارض حرم میں آپ کو پناہ نہ مل سکی تھی۔ لشکر حر نے آپ کا راستہ روک لیا تھا ــــــــ اور بالآخر آپ کربلا کی سرزمین پر پہنچ گئے تھے۔ جو بعد میں محاذ جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

ظالم تاریخ کے نمک خوار مورخین اپنے سلاطین کی خوشامد کے لئے حقائق کو مسخ کرتے تو مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے حالات پر پردہ ڈال کر دنیائے اسلام کو یہی باور کراتے کہ یزید پوری اسلامی مملکت کا مالک تھا اور امام حسینؑ اپنے وطن سے اس کے خلاف "البغاوت" کے لئے نکلے تھے۔

آپ کا اقدام معاذ اللہ ایک خروج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے لئے آپ کے ساتھ وہی برتاؤ ہونا چاہیئے تھا جو حکومت یزید نے کیا اور جو دنیا کی ہر حکومت اپنے "باغی" کے ساتھ کیا کرتی ہے۔

لیکن امام حسینؑ نے ایک مختصر اقدام سے ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا اور ظلم کی حسرت دل کی دل میں رہ گئی۔

مکہ یا مدینہ میں معرکہ کارزار گرم ہو جاتا تو ہر الزام ممکن تھا ــــــــ آپ نے کمال تدبر اور علم امامت سے کام لے کر پہلے اپنے کو اس منزل تک پہنچایا جہاں آپ کی شہادت مقدر تھی۔ اس کے بعد وہاں بھی یزیدیت کا قبضہ دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ پورا میدان جنگ اپنے قبضے میں لے لیا جائے تاکہ اس سرزمین پر جو بھی معرکہ آرائی ہو وہ میری ذاتی ملکیت پر ہو یزید کے علاقہ میں نہ ہو۔

فلسفۂ جہاد کا یہ تحفظ مقصود نہ ہوتا تو دس بیس گز زمین بہت کافی تھی چھوٹا سا لشکر شہادت کے بعد دفن ہو جاتا۔ یا خود وہاں کے زمیندار لاشوں کے دفن کی اجازت دے دیتے۔ چار میل زمین خریدنا دفن کی مصلحت سے بالاتر ایک مصلحت کی نشاندہی کر رہا ہے اور وہ یہی ہے کہ یہ آخری جہاد بھی اپنے دفاعی انداز کو محفوظ رکھے اور اس پر

جارحیت کا الزام نہ آنے پائے۔

اس مقام پر ایک بنیادی سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسری قوموں سے الگ نظام جہاد کیوں مقرر کیا ہے اور اس کے یہاں دشمن کے علاقہ پر جنگ لڑنا کیوں ممدوح نہیں ہے؟

دنیا کی دوسری قوموں میں یہ اقدام فاتحانہ کہا جاتا ہے تو کیا اسلام جنگ میں فتح کے علاوہ کچھ اور چاہتا ہے اور کیا اس کی لڑائیوں کا مقصد شکست ہی ہوتا ہے؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام دنیا کے دوسرے نظاموں کی طرح فتح و کامرانی ہی چاہتا ہے اور دفاعی جنگ میں بھی اس وقت تک میدان میں نہیں آتا جب تک فتح و کامرانی کے امکانات قوی نہیں ہوتے۔

لیکن اس کا معیار فتح دیگر اقوام عالم سے کچھ مختلف ہے اور وہ اسے بھی فتح سمجھتا ہے۔ جسے دوسری قومیں شکست تصور کرتی ہیں اور اسے بھی شکست کا نام دیتا ہے جس پر دوسری قومیں ناز کرتی ہیں۔

اس کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ فتح و کامرانی مقصد کے اعتبار سے ہے جو فریق اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ فاتح کہا جاتا ہے اور جسے مقصد کے حصول میں ناکامی ہوتی ہے وہ مفتوح اور شکست خوردہ کہا جاتا ہے۔

مقصد کی فتح اقوام کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور یہیں دیکھنا پڑتا ہے کہ کون سی قوم کس مقصد کے لئے لڑ رہی ہے۔ اقتدار کے لئے لڑنے والے اقتدار پا کر فاتح کہے جاتے ہیں۔ علاقہ کے لئے جنگ لڑنے والے علاقہ خالی کرا لینے کے بعد فاتح تصور کئے جاتے ہیں۔ اور معنوی مقاصد کے لئے میدان جنگ میں اترنے والے اس وقت تک فاتح نہیں کہے جاتے جب تک مقاصد کی تکمیل کا مکمل سامان نہ ہو جائے چاہے سارا علاقہ اپنے قبضہ میں آجائے اور سارا تخت اقتدار زیر قدم ہو جائے۔

اسلام کی جنگ اور اقوام عالم کی لڑائی کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ دنیا کی قومیں عام طور پر زن۔ زر۔ زمین کے لئے جنگ کیا کرتی ہیں۔ اور اسی لئے ان پر قبضہ کر لینے کے بعد جنگ بھی ختم کر دیتی ہیں۔ اور اپنے فاتح ہونے کا اعلان بھی کر دیتی ہیں۔ لیکن اسلام کا مقصد جہاد اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ قیام دین اور مفاد مذہب کے لئے جہاد کرتا ہے اور اس وقت تک سلسلۂ جہاد موقوف نہیں کرتا جب تک قیام دین کے جملہ وسائل فراہم نہ ہو جائیں۔

اسلام کے پیش نظر دور حاضر کی تباہی و بربادی اور عصر حاضر میں آئین شریعت کی پامالی بھی ہے۔ اس نے ابھی ایک جہاد بپا کر رکھا ہے جس کے بعد دین کا مکمل قیام ہوگا اور لادینیت تباہ و برباد ہو جائے گی۔

قیام دین کے مقصد کا اعلان امام حسینؑ نے حضرت محمد حنفیہ کے خط میں کیا تھا جس میں اس امر کی صراحت تھی کہ امام قیام حق کا ذمہ دار ہوتا ہے اور میں امام برحق ہوں اس لئے میرا فرض ہے کہ دین کو قائم کر دوں چاہے اس راہ میں کسی قدر قربانیاں کیوں نہ دینا پڑیں۔

امام حسینؑ کے اسی مقصد کا اعلان ان لفظوں میں کیا گیا ہے

إِنْ كَانَ دِيْنُ مُحَمَّدٍ لَمْ يَسْتَقِمْ
إِلَّا بِقَتْلِيْ يَا سُيُوْفُ خُذِيْنِيْ

" اگر محمدؐ کا دین میرے قتل کے بغیر مستحکم نہیں ہوتا تو آؤ تلوارو۔
آؤ یہ حسینؑ کی گردن حاضر ہے اسے لے لو۔"

امام حسینؑ کے زمینوں کی خریداری کے بعد ہبہ کر دینے کی ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی علاقائی جنگ نہیں لڑنا ہے۔ مجھے زمینوں پر قبضہ کرنے کا شوق نہیں ہے میں نے خود اپنی مملوکہ زمین بھی اس کے مالکوں کے ہاتھ ہبہ کر دی ہے

مجھ پر توسیع پسندی کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

میرا جہاد ایک عظیم مقصد کے لئے ہے جس کی ایک دفعیہ طرز عمل بھی ہے جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو۔ اسلام کے مقدس آئین میں یہ اخلاقی برتاؤ اور یہ داد دہش کا انداز بھی ہے جس کا آج میں نے مظاہرہ کیا ہے۔

توسیع پسندی کے لئے جنگ کرنے والے اور ہوتے ہیں۔ اور قیام حق کے لئے جہاد کرنے والے اور۔

توسیع پسند افراد اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔ فوجیں بڑھاتے ہیں، بڑی طاقتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

فوجوں سے غلط بیانیاں کرتے ہیں۔ فتح کو فتح اور شکست کو شکست نہیں کہتے اور قیام حق کے لئے جہاد کرنے والوں کے واسطے یہی سب باتیں قطرۂ امتیاز ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ اور ہتھیار سے جنگ نہیں کرتے۔

ان کے یہاں فوج کبھی تاریکی میں نہیں رہتی۔ ایمان کی طاقت سے جہاد کرتے ہیں اور ہر شخص کو اسکی شہادت سے باخبر کر دیتے ہیں۔

فلسفۂ جہاد کے تحفظ کے بعد امام مظلوم نے قبروں کا اہتمام شروع کیا اور زمین کو اہل کوفہ کے نام ہبہ کر دیا ——— تاکہ یہ لوگ مظلومین کی قبریں تیار کر دیں اور شہیدوں کی لاشوں کے دفن میں سہولت ہو جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قبروں کے لئے ہبہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے صرف وصیت کافی تھی۔ اہل قریہ کو مہمانوں کی جلالت قدر اور ان کی مظلومیت کا اندازہ ہوگا تو خود ہی دفن کا اہتمام کریں گے۔

لیکن اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ امام پیغمبر اپنے آخری امکانات تک کسی فرد یا جماعت کا احسان نہیں لیتا۔

زمین کربلا کو اپنی ملکیت پر باقی رکھنے کے بعد دفن کی وصیت فرماتے اور وہ لوگ دفن کا اہتمام وانتظام کر دیتے تو معصومؑ کی گردنوں پر ایک قسم کا احسان ہو جاتا اور امام کسی بھی قیمت پر یہ احسان برداشت نہیں کر سکتا۔

روایات میں مرسلِ اعظمؐ کی یہ دعا موجود ہے کہ "پروردگار مجھ پر کسی اجنبی اور غیر کا احسان نہ رکھنا۔

عملی طور پر بھی مرسلِ اعظمؐ نے برابر اس حقیقت کا اعلان کیا ہے۔ ہجرت کی رات جب ہم سفر ابو بکر نے آپکی خدمت میں اپنا ناقہ سواری کے لئے پیش کیا تو آپ نے پہلا سوال یہ فرمایا کہ اس کی قیمت کیا ہے۔

انھوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ "نبی کسی کا شرمندۂ احسان نہیں ہوتا"

اس کے بعد قیمت دے کر ناقہ حاصل کیا اور اس پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف تشریف لے گئے۔

روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مزاج نبوت وامامت کسی کے احسان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ تاریخ میں صرف حضرت ابو طالب اور جناب خدیجہ کا امتیاز تھا کہ مرسلؐ اعظم نے زندگی کے ہر موڑ پر ان دو شخصیتوں کا احسان قبول فرمایا اور کسی منزل پر ان کے احسانات کو رد نہیں کیا۔

یہاں تک کہ جناب ابو طالب کے انتقال کے بعد جب آپ جنازہ کے پیچھے چل رہے تھے تو برابر یہ کہتے جا رہے تھے۔ "چچا! خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے بڑے احسانات کئے ہیں۔"

جناب خدیجہ کے بارے میں بھی تاریخ میں ایسے ہی فقرے ملتے ہیں کہ آپ خدیجہ کے بعد بھی بیت الشرف میں برابر ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اور ایک مرتبہ جب حضرت

عائشہ نے عاجز آکر فرمایا۔ کہ آپ کب تک اس ضعیفہ کو یاد کرتے رہیں گے۔ شکر خدا کیجئے کہ اس نے آپ کو ایسی اچھی اچھی خواتین عطا کی ہیں بھلا اب خدیجہ کے ذکر کا کیا محل ہے۔

تو جبین نبوت پر شکن آگئی اور آپ نے فرمایا۔ "خبردار! تمہیں کیا معلوم خدیجہ کیا ہیں۔ خدیجہ اس وقت ایمان لائیں جب لوگ میری نبوت کا انکار کر رہے تھے۔ انھوں نے اس وقت مالی ہمدردی کی جب کوئی ہمدرد نہ تھا۔ اور انھوں نے اس وقت مجھے صاحب اولاد بنایا جب لوگ ابتر کے طعنے دے رہے تھے۔

واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت نے ان دونوں حضرات کے احسانات قبول فرمائے ہیں۔ اور انھیں تا عمر یاد رکھا ہے۔ اس کے علاوہ نبوت کسی کی شرمندۂ احسان نہیں ہوئی۔

امامت بھی نبوت ہی کے مزاج کے امتداد کا نام ہے اور امام کبھی امت میں کسی فرد کا شرمندۂ احسان نہیں ہوتا۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ زمین کو ہبہ کر کے ان سے مطالبات کئے جائیں تاکہ ان کا احسان ہماری گردن پر نہ ہونے پائے اور انھیں کی گردن پر ہمارا احسان رہے۔

اس کے بعد آپ نے چاہنے والوں کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا کہ تم سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہمارے زائروں کو ہماری قبروں کا نشان بتا دینا اور ان کی ضیافت کا انتظام کرنا۔ بندہ پروری اور ..... غلام نوازی کی ایسی مثال تاریخ میں آلِ محمدؐ کے علاوہ کہیں اور نظر نہ آئے گی۔

ضرورت تھی کہ اسی منزل پر اس نکتہ کی بھی وضاحت ہو جاتی کہ اس وصیت کا مفہوم کیا تھا۔ اور حضرت کس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن محل وموقع کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف اجمالی اشارہ پر اکتفا کی جاتی ہے۔

امام حسینؑ نے کھلی ہوئی لفظوں میں وصیت فرمائی جس کا صاف سا مطلب یہ ہے کہ

امامؑ کے پیش نظر وہ تمام افراد تھے جو آج تک زیارت کے شرف سے مشرف ہو رہے ہیں۔ اور جن کی ضیافت کے لئے حضرت نے اتنا بڑا علاقہ ہبہ کر دیا تھا۔

تین دن کی قید بھی اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ زائرین کا زیادہ قیام بھی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح احترام میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور عبرت گاہ عالم جلوہ گاہ بن جاتی ہے۔

روایات میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ

زیارت کرو اور واپس جاؤ۔ ہمارے مشاہد کو جائے قیام نہ بناؤ۔ ہمارے زائروں کو برابر آنے دو اور ان کی زیارت میں خلل نہ پیدا کرو۔

اس مقام پر ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب دشمن نے امام علیہ السلام کے خیام کو فرات سے ہٹانے کی دعوت دی اور انھیں دور دراز مقامات پر خیمے نصب کرنے پر مجبور کیا تو حضرت عباسؑ کو جلال آگیا۔ اور آپ ایک خط کھینچ کر ٹھہر گئے۔ فرمایا۔ خبردار اس خط کے آگے قدم نہ بڑھانا ورنہ کوئی سر دوش پر نظر نہ آئے گا۔

ممکن ہے کہ یہ خط اسی علاقہ کی تحدید ہو جسے امام حسینؑ نے حاصل فرمایا تھا اور جس کو محاذ جنگ بنانے کے بعد اسلام کے مقصد جہاد کا مکمل طور پر تحفظ ہو سکتا تھا۔ روایت کسی مستند اور معتبر ماخذ میں میری نظر میں نہیں گزری لیکن اگر صحیح ہے تو اسے علاقائی حد بندی کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

سقائی

کربلا کی تاریخ میں حضرت عباسؑ کے کارہائے نمایاں میں سب سے اہم کارنامہ سقائی کا ہے بلکہ بعض حضرات علماء کی نظر میں یہی آپ کا واحد کارنامہ ہے جس میں آپ کو مکمل انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اور کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے۔

سقایت کی تحقیق کے لئے ان تمام روایات کا جائزہ لینا پڑے گا جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ اور ان میں کسی نہ کسی نہج سے سقائی کا ذکر کیا گیا ہے۔

خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ قبلہ نے اپنی کتاب "پیاس" میں نہایت درجہ تفصیلی بحث کی ہے جس کے بعد کسی تفصیل کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔ موصوف کے بعض استنتاجات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس دیدہ ریزی سے آپ نے روایات کو ملاحظہ کیا ہے اور جس اخلاص کے ساتھ تاریخی مندرجات پر بحث کی ہے، کم از کم موضوع "آب و عطش" پر کسی اور نے یہ زحمت نہیں کی ہے اور آپ کا کارنامہ صرف اردو زبان والوں کے لئے نہیں بلکہ دیگر زبانوں کے مصنفین و مؤلفین کے لئے بھی شمع راہ ہے۔

ان روایات میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں۔

(۱) سقائی کی ضرورت۔
(۲) سقائی کی حقیقت۔
(۳) سقائی کے اسباب۔
(۴) سقائی کی اہمیت۔
(۵) سقائی کی تاریخ۔

سقائی کی ضرورت

یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ کسی بات کی شہرت اس کے غیر معمولی حالات و اسباب کی بنا پر دیا کرتی ہے۔ مطابق معمول حالات بات کی اہمیت کو کم کر دیا کرتے ہیں اور غیر معمولی حالات مسئلہ کی اہمیت کو دوچند کر دیا کرتے ہیں۔

تاریخ کربلا میں حضرت عباسؑ کی سقائی کی اہمیت اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد عمومی حالات میں پانی لا کر بچوں کو پلا دینا نہیں ہے جیسا کہ امام حسینؑ کے بے پناہ قومی اور سماجی احسانات میں تاریخ نے لشکر حر کو سیراب کرنے کا تذکرہ نہایت ہی شدومد سے کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جن حالات اور جن مصالح کے تحت آپ نے یہ احسان فرمایا ہے وہ ایک غیر معمولی امر ہے اور ایسے حالات میں دنیا کا کوئی دوسرا انسان اپنے مخالف کے ساتھ ایسا احسان نہیں کر سکتا۔

اسی طرح حضرت عباسؑ کی سقائی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ نے صرف دریا سے پانی لا کر یا مشکیزہ کا دہانہ کھول کر بچوں کو سیراب نہیں کر دیا ہے بلکہ اس راہ میں غیر معمولی طور پر بے پناہ زحمات و مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ اب یہ مشکلات نتیجہ خیز ثابت ہوئیں یا نہیں۔ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔

اور یہی وہ رخ ہے جہاں سقائی کا سلسلہ بندش آب سے مل جاتا ہے۔ اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کربلا میں بندش آب کا کیا ماحول تھا اور حضرت عباسؑ نے کن حالات میں یہ اقدام کیا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ امام حسینؑ جس قدر پانی اپنے ہمراہ سفر میں لئے ہوئے تھے اس کا بیشتر حصہ حر کے سیراب کرنے میں صرف کر چکے تھے۔ اور فرات پر قبضہ کرنے کے بعد کوئی وجہ نہیں تھی کہ "ظاہری حالات" کے تحت اصحاب امام حسینؑ جمع آب پر کوئی زور دیتے۔

فرات کے کنارے سے خیمے کبھی کسی مصالحت و مفاہمت کی بنا پر نہیں ہٹائے گئے کہ پانی کا مکمل انتظام کر لیا جاتا۔

بلکہ یزیدی لشکر نے اپنے امیر کے حکم کا احترام کرتے ہوئے "بجبر" خیموں کو ہٹایا اور امام حسینؑ نے اصلاح امر کی آخری کوشش کو جاری رکھنے کے لئے اس جبر کو برداشت کر لیا۔

جس کے بعد اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ امام مظلومؑ اپنے ہمراہ پانی کا کافی ذخیرہ لے کر دریا کا کنارہ چھوڑتے اور جو پانی کی مقدار ایک ہزار کے رسالہ کو سیراب کر سکتی تھی۔ وہ دو چار دن کے لئے اپنے ساتھیوں کے واسطے بھی کافی ہو جاتی۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ حر نے بھی خیام حسینی کو عام جنگی تدابیر کے تحت نہیں ٹھہرایا کہ وہ جگہ میدان کارزار بننے کے لئے زیادہ مناسب اور سازگار ہو

بلکہ اس کے پیچھے بھی ابن زیاد کا یہ ابتدائی فرمان تھا۔

" لَا تُنْزِلْهُ اِلَّا بِالْعَرَاءِ فِی غَیْرِ خُضْرٍ وَعَلٰی غَیْرِ مَاءٍ "

طبری، کامل۔ ابو الفداء، الاخبار الطوال وغیرہ۔

جس کے بعد اس کا بھی کوئی امکان نہیں رہ جاتا کہ حر کا لشکر اصحاب امام کو پانی لے کر دریا کا کنارہ چھوڑنے کا اختیار دیدے۔

اس کی تمام تر کوشش یہی ہوگی امام حسینؑ بے آب وگیاہ منزل پر رہیں اور انکے ہمراہ پانی بھی نہ رہنے پائے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابن زیاد نے اپنے فرمان میں یہ فقرہ "میدان جنگ" کی تعیین کے لئے نہیں استعمال کیا تھا بلکہ اس کا مقصد بھی روز اول سے امام حسینؑ اور انکے بچوں کو پیاس کی مصیبت میں مبتلا کرنا تھا۔

اس کا سبب قتل عثمان کا انتقام ہو جیسا کہ بعض مورخین نے نقل کیا ہے یا جنگی حالات میں اپنے حریف کو پیاس سے ہلاک کر دینا ہو جیسا کہ دیگر مورخین نے نقل کیا ہے اور خطیب اعظم نے ثابت کیا ہے۔

یہ بہرحال مسلم ہے کہ ابن زیاد کے پیش نظر روز اول سے امام حسینؑ کو پیاسا رکھنا تھا۔

اس کے بعد یہ احتمال ناممکن ہے کہ حر بے آب وگیاہ صحرا میں قیام کرنے پر مجبور کرنے کے باوجود یہ اجازت دیدے بے آب وگیاہ مقام پر رہیں لیکن آپ کے خیام میں پانی برابر جاتا رہے۔ یہ تصور تاریخ سے انتہائی غفلت اور حالات کے سلسلے میں کمال بے بصیرتی کا نتیجہ ہے۔

ابن زیاد کے ابتدائی فرمان کے بعد بندش آب کی تاریخ کا متعین کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

حیرت ان مورخین پر ہے جو ابن زیاد کے اس فقرہ کو نقل کرنے کے بعد بھی یہ سوچتے ہیں کہ پانی بآسانی یا بدشواری خیام حسینی تک آتا رہا۔

جنگی حالات سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی یہ جانتے ہیں کہ کوئی دشمن اپنے حریف کو مقصد کے خلاف ادنیٰ سہولت دینے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اور حکم ابن زیاد سے اتنا بڑا اقدام کرنے والا حر کسی بھی قیمت پر اس بات پر راضی نہیں ہوگا کہ خیام حسینی تک پانی پہنچتا رہے اور امام حسینؑ کے بچے سیراب ہوتے رہیں۔

ایسے حالات میں تو "بندش آب" کا ابن سعد کی طرف منسوب کرنا بھی ایک سامحہ کا نتیجہ ہے۔

ورنہ حقیقت امر یہی ہے کہ یہ فرض سب سے پہلے اپنے امکان بھر حر نے انجام دیا ہے۔ اس کے بعد جب خیمے فرات سے ہٹ گئے تو مقصد کی محافظ فوج نے مسئلہ کو اور بھی دشوار بنا دیا اور پانی مکمل طور پر روک دیا گیا۔

ابن سعد کا حکم مکمل طور سے پانی پر پابندی عائد کرنا تھا اور یہ کام اس نے تیسری محرم کو کربلا میں وارد ہوتے ہی انجام دیدیا۔

دنیا کا عام دستور ہے کہ محافظت کا اہتمام کی بلندی اور اس کی اہمیت کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے۔

ابن سعد کی نظر میں "بندش آب" کا مسئلہ صرف جنگی مسئلہ ہوتا تو شاید مصالحت کی گفتگو کے باقی رہنے تک پانی پر پابندی عائد نہ کی جاتی۔ لیکن یہاں ایک طرف امیر کی مرضی ہے اور دوسری طرف قتل عثمان کا انتقام، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں اسباب کسی جنگ و جدل کے تابع نہیں ہیں۔ ان کے لئے ہر امکانی سختی ضروری ہے چاہے لڑائی کے جملہ امکانات ختم ہو جائیں۔

مسئلہ بیعت اس سے ماسوا ہے کہ بیعت کے طلب گار کی آخری کوشش یہ تھی کہ

امام حسین کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیا جائے کہ یہ مصائب سے گھبرا کر بیعت پر آمادہ ہو جائیں اور اس اہم مقصد کے لئے جتنے سخت مشکلات ممکن ہوں ان کے پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

حاکم کی رضامندی۔ قتلِ عثمان کا انتقام۔ بیعت کی طلب۔ اور اس پر جنگی تدابیر کا اضافہ۔ وہ متعدد محرکات ہیں جن کے بعد فوجِ دشمن کی طرف سے کسی سہولت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہر امکانی سختی کا تصور مطابقِ حقیقت ہے چاہے اس کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہ بھی کیا جا سکے۔

جنگ کے دشوار ترین حالات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد خولی اور ابن زیاد کے خطوط میں اس لفظ کا تجزیہ کرنا ضروری ہے کہ خولی نے ابن سعد کے طرزِ عمل کے جنگی اعتبار سے نرمی کا احساس کر کے ابن زیاد کو اطلاع دی۔

"اَمَّا بَعْدُ اَیُّھَا الْاَمِیْرُ اِنَّ عُمَرَ بْنَ سَعْدٍ یَخْرُجُ کُلَّ لَیْلَۃٍ وَیَبْسُطُ بِسَاطًا وَیَدْعُوا الْحُسَیْنَ وَیَتَحَدَّثَانِ حَتّٰی یَمْضِیَ مِنَ اللَّیْلِ شَطْرُہٗ وَقَدْ اَدْرَکَتْہُ عَلَی الْحُسَیْنِ الرَّحْمَۃُ وَالرَّاْفَۃُ فَاْمُرْہُ اَنْ یَنْزِلَ عَنْ حُکْمِکَ ..... وَاَنَا اَکْفِیْکَ اَمْرَہٗ۔

"امیر! عمر بن سعد ہر شب باہر نکل کر دیر دیر تک حسینؑ سے باتیں کرتا رہتا ہے اور اس کا طرزِ عمل حسینؑ کے بارے میں نرمی اور مہربانی کا ہے بہتر ہے کہ تو اسے معزول کر کے مجھے سردار بنا دے۔ میں تیرے حکم کی مکمل اطاعت کروں گا اور حسینؑ کے مسئلے کو صاف کر دوں گا۔"

ابن زیاد نے اس کے جواب میں ابن سعد کو یہ تنبیہی خط لکھا:۔

"اَمَّا بَعْدُ یَا ابْنَ سَعْدٍ قَدْ بَلَغَنِیْ اَنَّکَ تَخْرُجُ فِیْ کُلِّ لَیْلَۃٍ وَتَبْسُطُ بِسَاطًا تَدْعُوا الْحُسَیْنَ وَتَتَحَدَّثُ مَعَہٗ

حَتّٰی یَمْضِیَ مِنَ اللَّیْلِ شَطْرُہٗ فَاِذَا اَتَاکَ کِتَابِیْ فَاْمُرْہُ اَنْ یَنْزِلَ عَلٰی حُکْمِیْ فَاِنْ اَطَاعَ وَاِلَّا امْنَعْہُ مِنْ شُرْبِ الْمَاءِ فَاِنِّیْ حَلَّلْتُہٗ عَلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی وَحَرَّمْتُہٗ عَلَیْہِ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ فَحُلْ بَیْنَ الْحُسَیْنِ وَاَصْحَابِہٖ وَبَیْنَ الْمَاءِ اَنْ یَذُوْقُوْا مِنْہُ قَطْرَۃً کَمَا صُنِعَ بِالتَّقِیِّ النَّقِیِّ عُثْمَانَ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ الْمَظْلُوْمِ"۔ الطبری۔ الاخبار الطوال۔ ناسخ التواریخ وغیرہ۔

"ابن سعد مجھے خبر ملی ہے کہ تو ہر شب میں امام حسینؑ کے ساتھ دیر دیر تک باتیں کرتا ہے۔ لہٰذا میرا خط پڑھتے ہی ان سے کہہ دے کہ میرا حکم مان لیں اور اگر میری اطاعت نہ کریں تو انھیں پانی سے روک دے۔ میں نے اس پانی کو یہود و نصاریٰ تک کے لئے حلال کر دیا ہے اور حسین اور ان کے گھر والوں پر حرام کر دیا ہے۔ حسین اور ان کے اصحاب اور پانی کے درمیان حائل ہو جا۔ اور وہ اسی طرح پانی کا ایک قطرہ نہ پینے پائیں جس طرح عثمان کو پانی نہیں دیا گیا ہے۔"

قتلِ عثمان کے انتقام کی تحریک شامی پروپیگنڈے کی آخری کڑی ہے کہ ایک مرتبہ پھر حضرت علیؑ پر خونِ عثمان لگا دیا جائے اور یہ ثابت کر دیا جائے کہ عثمان کے لئے بندشِ آب میں حضرت علیؑ ہی کا ہاتھ تھا جب کہ تاریخ کا صاف اعتراف ہے کہ محاصرہ کے دوران عثمان کے لئے امیر المومنینؑ ہی نے پانی فراہم کیا تھا۔ اور وسیلہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ہی کو بنایا تھا۔

لیکن پروپیگنڈے کو حق اور باطل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادیں راست

گوئی اور راست بازی پر نہیں ہوتیں۔ اس کے لئے جھوٹ پہلی شرط ہے۔ اور جھوٹ کے بغیر سیاسی پروپیگنڈے کامیاب نہیں ہو سکتے۔

حیرت مورخ طبری پر ہے کہ اسے واقعات کی حقیقت معلوم ہے اور اس نے اس مقام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

مورخ صرف واقعہ نگار نہیں ہوتا اور تاریخ کی کتاب کوئی روزنامہ یا اخبار نہیں ہوتی کہ واقعات جوں کے توں نقل کر دیئے جائیں اور ان پر کوئی رائے بھی نہ دی جائے۔

تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے۔ اور مورخ کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نہایت درجہ دیانت داری کے ساتھ کڑیوں کو ملاتا رہے۔ طبری کا فرض تھا کہ وہ طالب علم کے ذہن کے اس نکتہ کی طرف متوجہ کر دیتا کہ امام حسینؑ پر یہ الزام سراسر غلط تھا اور حضرت کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس طرح بہت سے واقعات مرتب کرنے میں سہولت ہوتی اور بے شمار غلط فہمیاں زائل ہو جاتیں.......... لیکن تعصب اور نمک خواری ان راہوں میں حائل ہو جایا کرتی ہے۔

تاریخی مسائل سے قطع نظر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ خولی نے ابن زیاد کے خط میں لفظ "کل لیلۃ" استعمال کیا ہے اور ابن زیاد نے بھی اپنے جواب میں اس لفظ کی تکرار کی ہے۔

عربی اور اردو دونوں کے محاورات کے اعتبار سے "کل لیلۃ" اور ہر شب کا استعمال ایسے ہی مقامات پر ہوتا ہے جہاں واقعہ دس بیس دن تک برابر پیش آتا رہتا ہے۔ دو چار چھ دن تک پیش آنے والے واقعہ کے لئے اتنی شدت سے ہر شب کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خولی نے یہ خط عاشورہ محرم کے بعد لکھا ہے۔ اور ابن زیاد کا یہ جواب ١٤۔ ١٥۔ محرم کو آیا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔

پھر خولی نے ان حالات کا جائزہ کب لیا۔ اور کتنی راتوں میں ابن سعد اور امام حسینؑ کی باتوں کا مشاہدہ کیا کہ اسے اتنی شدید شکایت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب ابن سعد کا برخواستت ہو جانا ہی ضروری ہے؟

اس سوال کا تجزیہ کرنے کے لئے چند نکات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ کربلا کے حالات دنیا کے دوسرے جنگی حالات کی طرح پُر سکون حالات سے قطعی مختلف تھے۔ اطمینانی حالات میں دو چار دس دن کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور جنگی حالات میں دو چار لمحے بھی فیصلہ کن ثابت ہو جایا کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ ایک دو دن یا ایک دو راتیں۔

حالات کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ دوسری محرم کو امام حسینؑ سرزمین کربلا پر وارد ہوئے۔ اور اسی دن حر نے ابن زیاد کو اطلاع دیدی۔ شب میں ابن سعد نے اپنے انجام کار کے بارے میں فیصلہ کر لیا۔ اور صبح ہوتے ہوتے کوفہ سے کربلا کے لئے روانہ ہو گیا۔

کربلا پہنچنے کے بعد بھی کسی مزید گفتگو کے بغیر خیموں کے ہٹانے کا سوال اٹھا دیا گیا۔ اور فوجوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شمر کربلا آیا۔ اور کوفہ واپس بھی گیا۔ فوجی انتظامات کا جائزہ بھی لیا۔ اور دوبارہ واپس بھی آیا۔ اور دسویں محرم تک یہ سارا واقعہ تمام بھی ہو گیا۔

آٹھ دن کے اندر متعدد بار نامہ و پیام کا آنا جانا۔ نامہ بروں کی دوڑ دھوپ، لشکروں کی مسلسل آمد، اس بات کا ثبوت ہے کہ جنگی حالات عام حالات سے قطعی مختلف تھے اور کام انتہائی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ خولی خود بھی ابن سعد کا مخلص نہیں تھا۔ وہ اپنے کو سرداری لشکر کا اہل سمجھنے کی بنا پر قطعی طور پر اس کا حریف تھا۔ صرف حالات کی مجبوری نے ایک لشکر کی سرداری پر قناعت کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

ورنہ اس کا قطعی خیال یہی تھا کہ میں پوری فوج کی کمان سنبھالنے کا اہل ہوں اور امیر وقت کی مرضی کی تکمیل کے لئے جس قدر میں سزاوار ہوں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ایسے حالات میں ایک رات کے بعد دوسری رات کا آجانا اور اس کا بھی گفتگو میں گزر جانا خولی کے لئے سال دو سال سے کسی طرح کم نہ تھا۔

شوق ریاست ایک ایک لمحہ کو برسوں میں تبدیل کر دیتا ہے اور جذبۂ حکومت ہر لحظہ کو نہ ٹلنے والا زمانہ بنایا کرتا ہے۔

یہ تصور انتہائی غلط ہے کہ یہ واقعہ متعدد دنوں میں پیش آیا۔ اس کے لئے تو ایک دو دن کا گزر جانا بھی بہت ہے۔

جس کا ایک تاریخی ثبوت یہ بھی ہے کہ شمر کربلا میں دو مرتبہ وارد ہوا —— ایک مرتبہ کربلا آیا —— اور پھر کوفہ واپس گیا اور ۹ محرم کو دوبارہ وارد سرزمین کربلا ہو گیا۔

سیاسی بصیرت اور جنگی حالات پر گہری نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ خولی کی طرح شمر کے دل میں بھی جذبۂ ریاست و حکومت کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے حالات کو زیادہ گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ ابن سعد کو برخواست کرانے کے لئے خط و کتابت کافی نہیں ہے۔

یہ خولی نادان ہے کہ اتنے بڑے اقدام کے لئے خط و کتابت کر رہا ہے —— اس کے لئے بہترین طریقہ حاکم سے براہ راست ملاقات اور اسے حالات کی نزاکت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

اور عجب نہیں کہ خولی کے پیغام کی اطلاع ہی شمر کے لئے محرک واقع ہوئی ہو اور اس نے یہ طے کیا ہو کہ اگر خولی کی شکایت کام کر گئی اور ابن زیاد اس کے بہکائے میں آگیا۔

تو ریاست ابن سعد سے نکل کر خولی کی طرف منتقل ہو جائے گی اور میں سردار لشکر ہی رہ جاؤں گا۔

چنانچہ اس نے حالات کا جائزہ لیتے ہی فوراً کوفہ کا رخ کیا اور ابن زیاد کو اس اندازہ سے حالات سمجھائے کہ خولی کے کلام کی تائید بھی ہو گئی اور وہ ابن زیاد جس نے خولی کے جواب میں صرف سختی کا ذکر کیا تھا۔ . . . . . . شمر کے جواب میں ابن سعد کو یہ پیغام بھی بھیج دیا کہ اگر ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا تو ریاست لشکر سے الگ ہو جا اور فوج کی کمان شمر کے حوالے کر دے۔

. . . ایسے ولولہ انگیز ماحول میں . . . . جہاں چاروں طرف ریاست و قیادت کیلئے دوا دوش ہو رہی ہو۔

ہر بڑا "سردار لشکر" فوجی کمانڈر بننے کے خواب دیکھ رہا ہو۔ حالات کی تیز رفتاری کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اور ہر سردار لشکر کے لئے عظیم امکان ہے کہ حاکم وقت کی نگاہ میں محبوب بننے کے لئے حالات کو بد سے بدتر بنا دے اور جس قدر سختی ممکن ہو امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے ساتھ روا رکھے۔

اس کے بعد طبری کی یہ روایت قابل توجہ ہے

" فَبَعَثَ عُمَرُ بْنُ سَعْدٍ عَمْرَو بْنَ الْحَجَّاجِ عَلَى خَمْسِمِائَةِ فَارِسٍ فَنَزَلُوا عَلَى الشَّرِيعَةِ وَحَالُوا بَيْنَ الْحُسَيْنِ وَأَصْحَابِهِ وَالْمَاءِ أَنْ يَسْتَقُوا مِنْهُ قَطْرَةً وَذَالِكَ قَبْلَ مَقْتَلِ الْحُسَيْنِ بِثَلَاثٍ " —— طبری مقتل ابو مخنف۔

"ابن سعد نے عمرو بن حجاج کو پانچ سو سواروں کے ساتھ دریا پر بھیج دیا کہ امام حسینؓ، ان کے اصحاب اور پانی کے درمیان حائل ہو جائیں اور ان لوگوں کو ایک قطرہ پانی نہ پینے دیں۔" یہ واقعہ شہادت سے تین دن پہلے کا ہے۔

حالات کی تیز رفتاری کے پیش نظر اگر ابن زیاد کا دوسرا خط پانچویں محرم کو بھی آیا ہے تو عمرو بن الحجاج کے پہرے کی تاریخ بھی وہی ہے۔ اور طبری کا یہ "اجتہاد" کہ یہ واقعہ شہادت سے تین دن پہلے یعنی ساتویں یا آٹھویں محرم کا ہے —— قطعاً اشتباہ ہے۔

طبری نے حالات کا اندازہ تو کیا ہے کہ تیسری محرم کو ابن سعد وارد ہوا —— تین دن مسلسل امام حسینؓ سے گفتگو کرتا رہا —— چوتھے دن خولی نے شکایت نامہ لکھا —— پانچویں دن جواب آیا اور ابن سعد نے فوراً پہرے بٹھا دیئے۔

حالات کا یہ اندازہ قطعاً بعید از قیاس ہے۔ جب حکومت کی مشینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہو کہ بقول مورخین —— دوسری محرم کو امام حسینؓ کے وارد ہونے کے بعد تیسری محرم تک خط بھی آگیا ہو —— اور کوفہ میں اجتماع بھی ہو گیا ہو۔ اور ابن سعد کو روانہ بھی کر دیا ہو۔

تو یہ بات کتنی عجیب ہے کہ حکومت حالات سے غافل ہو کر چار دن تک صرف خولی کے شکایت نامہ کا انتظار کرے اور اس کے بعد کوئی دوسرا قدم اٹھائے۔

یہ بات عام حالات میں بھی درست نہیں ہے چہ جائیکہ ایسے شدید حالات میں جہاں ہر شخص پر جذبۂ ریاست کے ساتھ حصول انعام کا بھوت سوار ہو اور کسی آدمی کی فکر میں سنجیدگی اور ضمیر میں زندگی باقی نہ رہ گئی ہو۔

سقائی کی حقیقت

حالات کے تجزیہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دینے کا حکم ابتدائی طور پر حر ہی کو دیا گیا ہے اور ابن سعد نے کربلا پہنچ کر اس مقصد کی تکمیل کر دی ہے۔

دو ایک روز کے بعد فرات پر باقاعدہ پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اور یہ واقعہ کسی قیمت پر بھی سات محرم تک نہیں ٹل سکا۔

اس سے بالاتر مسئلہ یہ ہے کہ مکمل پہرے سے پہلے بھی خیام حسینی میں پانی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ابن زیاد کا ابتدائی فرمان موجود تھا۔ انتقام خون عثمان کے جذبات تازہ ہو چکے تھے۔ فرات سے خیمے ہٹائے جا چکے تھے۔ اور پانی کی کوئی بھی سبیل یا دریا کی طرف کوئی بھی قدم ایک جدید اختلاف کو دعوت دینا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ خیام حسینی میں خونریزی کے بغیر پانی کا کوئی قطرہ پہنچ جائے۔

فرق صرف یہ تھا کہ نہر پر پہرہ کے بعد مقابلہ باضابطہ طور پر دریا کے نگہبانوں سے ہوتا اور اس کے پہلے پوری فوج سے مقابلہ ناگزیر تھا۔

فرات پر پہرہ کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب ابن سعد نے یہ محسوس کر لیا کہ اب خیام حسینی میں پانی نہیں رہ گیا ہے۔ راستے کا پانی یقیناً ختم ہو چکا ہے .... اور دریا سے پانی کا کوئی قطرہ گیا نہیں ہے۔ اب خیام حسینی میں پیاس کی شدت ہوگی اور اصحاب حسینؑ دریا کا رخ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

بہتر ہے کہ کسی بھی ایسے اقدام سے پہلے دریا پر پہرہ بٹھا دیئے جائیں تاکہ اصحابِ امام اس طرف آنے کا ارادہ نہ کریں۔ اس طرح جنگ کی نوبت کبھی نہ آئے گی اور پیاس کی شدت بھی باقی رہ جائے گی۔

امامِ مظلوم کسی بھی قیمت پر جنگ کی ابتدا نہ کر سکتے تھے .... آپ روزِ اول سے ان تمام امکانات کی سعی فرما رہے تھے جن سے جنگ کا خطرہ نہ ٹل سکے۔ تو کم از کم رسولؐ کے وارث پر پہل کرنے کا الزام بھی نہ آئے۔ اس لئے آپ کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ دریا کے علاوہ کسی اور جہت سے پانی کا انتظام فرمائیں۔

بعض تاریخ و مقاتل میں امام حسینؑ کے باعجاز چشمہ جاری کرنے کا ذکر انھیں اسباب میں شمار کیا جا سکتا ہے جن کے ذریعہ امام مظلوم دریا کے بغیر بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ اور دشمن کو باخبر کر دینا چاہتے تھے کہ دریا پر قبضہ ہماری بے کسی اور بے چارگی کی دلیل نہیں ہے۔ ہماری ٹھوکروں میں اتنی طاقت موجود ہے کہ ایک اشارہ پر چشمہ جاری ہو سکتا ہے۔

قوتِ اعجاز کا مظاہرہ امتحان کے مراحل پر اثر انداز نہیں ہو سکتا

امامِ وقت کی ذمہ داریاں دونوں باتوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس کی ایک ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ منزلِ ابتلاء و امتحان میں آخری وقت تک صبر کرتا رہے۔

اور دوسری ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ درمیان میں ایسے حالات بھی پیش کرتا رہے جس سے امامت مجروح نہ ہو اور دشمن کو بیکسی کا الزام لگانے کا موقع نہ ملے

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ شمعون یہودی کے دروازے پر قرض لینے والے علیؑ ہی نے مٹی کی دیوار کو سونے کی بنا دیا تھا۔ اور علیؑ کا یہ کردار آواز دے رہا تھا کہ منزلِ امتحانِ بشریت میں قرض لینا لازم ہے۔

لیکن منزلِ اظہارِ کمالِ امامت میں دیوار کو سونے میں تبدیل کر دینا بھی ضروری ہے۔

امام حسینؑ کربلا میں انھیں دونوں منزلوں سے گزر رہے تھے ______ آپ ایک طرف اپنی قوتِ اعجاز کا مظاہرہ کر رہے تھے اور دوسری طرف عبدیت کا امتحان گاہ میں صبر و ثبات کا اظہار فرما رہے تھے۔

ابتدائی منزلوں میں چشمہ کے جاری کرنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امام حسینؑ اپنے اصحاب کے ساتھ اپنے دشمنوں کو بھی باخبر کر دینا چاہتے تھے کہ ہم امامِ وقت، وارثِ رسولؐ اور جانشین حیدرِ کرارؑ ہیں۔ ہماری انگلیوں میں زورِ شق القمر ہے اور ہمارے اشاروں میں قوتِ ردِ شمس ہے۔

ہم منزلِ امتحان میں ان طاقتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ یہ چشمہ آج ضرور جاری ہو گیا ہے، لیکن آج کے بعد یہ نظر نہیں آئے گا۔

چشمہ کا برآمد ہونا پانی کے پینے، پلانے یا امتحان کو ٹالنے کے لئے ہوتا تو یہ عاشور بلکہ عاشور کے بعد تک رہ جاتا ______ جس طرح چشمۂ زمزم آج تک باقی ہے۔

لیکن یہ اقدام صرف امامت کی قوتِ اعجاز کے مظاہرہ کے لئے کیا تھا۔ اسکے بعد اس کا نام و نشان تک نظر نہیں آئے گا۔

چشمہ جاری ہونے کی تاریخ کیا ہے ______؟ اس کی نشاندہی تاریخ کے بیانات سے مشکل ہے ______ اور مسئلہ تاریخی استنتاج سے متعلق ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق "بندشِ آب" سے نہیں ہے ______ "یہ شدتِ عطش" کا نتیجہ ہے۔ اور شدتِ عطش کا کوئی ربط "بندشِ آب" سے نہیں ہے۔

اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا ـــــــ فرات سے ہٹ جانے کے بعد " دشمن " نے " منصوبۂ تشنگی " کی روشنی میں یہ فیصلہ بہت آسان ہے۔ کہ یہ واقعہ چوتھی یا پانچویں محرم سے آگے کا نہیں ہے اور ان تاریخوں میں شدت عطش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

عرب کی تپتی ہوئی زمین پر ـــــــ صحرائے بے آب و گیاہ میں ـــــــ
ـــــــ دریا سے دور رہنے والے قافلے کی پیاس کا کیا عالم ہوگا ـــــــ
اس کا اندازہ آگ برساتی ہوئی دھوپ سے ہوگا۔ خیموں میں مشکیزوں کے پانی سے نہیں۔!

حالات کربلا کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عباسؑ کی سقائی کا کوئی تعلق پانی پلانے سے نہیں تھا بلکہ اس کا تمام تر تعلق ناساعد حالات میں ان امکانی کوششوں سے تھا جنہیں جناب عباسؑ نے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے سلسلے میں صرف کی تھیں۔

نازک سے نازک ترین حالات میں اتنی کوششوں کا جاری رکھنا حضرت عباسؑ جیسے وفادار کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ صرف ساقی کوثر کے لال کا کلیجہ تھا کہ اپنے آخری امکان تک بچوں کی تشنگی کو رفع کرنے کا خیال اپنے سینے سے لگائے رہے اور ایک لمحہ کے لئے اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو سکے۔

سقائی کے اسباب

تاریخی اعتبار سے جناب عباس کی سقائی میں دو چیزوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

(۱) دریا سے پانی لانا۔
(۲) کنواں کھودنا۔

مقاتل نے ان دونوں واقعات کو کسی قدر تفصیل سے درج کیا ہے لیکن استنتاج نتائج کی منزل میں اکثر حضرات نے قدیم مفروضات کی حدوں سے قدم آگے نہیں بڑھائے ہیں۔

کنواں کھودنے کے بارے میں تاریخ میں دو عبارتیں ملتی ہیں۔ ایک عبارت ناسخ التواریخ کی ہے :-

" چون شب نہم محرم بپایان رسید و سفیدۂ صبح بردمید در معسکر حسین آب تنکیاب بود، اہل بیت و اصحاب سخت تشنہ لب شدند و شکایت بحضرت حسین آوردند۔ ابو عبد اللہ برادر خود عباس را طلب

کرد ۔ فرمود با چند تن اصحاب چاہے حفر کنید کہ آبے بر آورید ــــ
دریں کرت بر فتند و چندگہ کاوش کردند آب نیافتند "

ناسخ التواریخ ج ۶ ص ۲۲۵

مقتل ابو مخنف میں یہ واقعہ ان الفاظ میں درج ہوا ہے ۔

" وَاشْتَدَّ الْعَطَشُ بِالْحُسَيْنِ وَاَصْحَابِهٖ وَاَوْلَادِهٖ فَشَكَوْا ذٰلِكَ اِلَى الْحُسَيْنِ فَدَعٰى بِاَخِيْهِ الْعَبَّاسِ وَقَالَ يَا اَخِىْ اِجْمَعْ اَهْلَ بَيْتِكَ وَاحْفِرُوْا بِئْرًا فَفَعَلُوْا ذٰلِكَ فَلَمْ يَجِدُوْا فِيْهَا مَاءً فَطَمُّوْهَا ۔ "

مقتل ابو مخنف ص ۲۷

" جب امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و اولاد پر پیاس کا غلبہ ہوا اور ان لوگوں نے امام حسینؑ سے شکایت کی تو آپ نے اپنے بھائی عباس کو بلا کر فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو ساتھ لیکر کنواں کھود دو ۔ ان لوگوں نے کنواں کھودا لیکن پانی نہ ملا تو بند کر دیا ۔ "

ناسخ اور ابو مخنف کی عبارتوں کا واضح فرق یہ ہے کہ ناسخ نے اصحاب اور اہل بیت دونوں کا ذکر کیا ہے اور ابو مخنف کی عبارت میں صرف اہل بیت کا ذکر ہے ۔ اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے ۔

جزئی فرق یہ ہے کہ ابو مخنف نے کنویں کا انجام بھی درج کیا ہے اور ناسخ نے اسے نظر انداز کر دیا ہے ۔

بعض کتابوں میں ایک سے زیادہ کنوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت نے چار کنویں کھود دے لیکن کسی ایک سے بھی پانی فراہم نہ ہو سکا ۔ اس لئے کہ جب بھی کوئی کنواں تیار ہوتا تھا تو لشکر ابن سعد والے آکر بند کر دیا کرتے تھے ۔

یہ بات شدت مصائب کی تصویر کشی کے لئے تو بہت اہم ہے ۔ لیکن حالات کے پیش نظر کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے ۔

اولاً کسی ایسی جگہ پر کنواں کھودنا جہاں تک فوج دشمن کی رسائی کا امکان ہو خلاف مصلحت ہے ۔

ثانیاً ایک مرتبہ ایسی سعی کے ناکام ہو جانے کے بعد دوبارہ پھر کسی خطرہ کی جگہ پر زحمت کرنا قرین قیاس نہیں ہے ۔

ثالثاً صحرائے بے آب و گیاہ میں چار چار کنویں کھودنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو چند ساعتوں میں انجام پا سکے ۔

دوسری عبارت بھی ناسخ ہی کی ہے جس میں ابن زیاد کا وہ خط درج کیا گیا ہے جو اس نے ابن سعد کے نام لکھا ہے :-

" اَمَّا بَعْدُ بَلَغَنِىْ اَنَّ الْحُسَيْنَ يَحْفُرُ الْآبَارَ وَيُصِيْبُ فَيَشْرَبُ هُوَ وَاَصْحَابُهٗ فَانْظُرْ اِذَا وَرَدَ عَلَيْكَ كِتَابِىْ فَامْنَعْهُمْ مِنْ حَفْرِ الْآبَارِ مَا اسْتَطَعْتَ وَضَيِّقْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَدَعْهُمْ يَذُوْقُوا الْمَاءَ وَافْعَلْ بِهِمْ كَمَا فَعَلُوْا بِالزَّكِىِّ عُثْمَانَ "

ناسخ ص ۲۲۳

" مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حسینؑ برابر کنویں کھود رہے ہیں اور اپنے اصحاب سمیت پانی پی رہے ہیں ۔ لہٰذا میرا خط پاتے ہی انھیں کنویں کھودنے سے روک دے اور ان پر سختی کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھیں اتنا موقع نہ ملے کہ پانی کا مزہ چکھ سکیں ۔ ان کے ساتھ وہ برتاؤ کر جو عثمان کے ساتھ کیا گیا تھا ۔ "

ابن زیاد کے اس خط سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :-

۱- اس فرمان کا تعلق غیبی چشمہ سے نہیں ہے بلکہ کنواں کھودنے سے ہے ــ ... ـ بعض ارباب کتب نے پانی پینے کا ذکر دیکھ کر اسے غیبی چشمہ پر منطبق کر دیا ہے ـ حالانکہ اس کا کوئی تعلق اس چشمہ سے نہیں ہے اور نہ اس سے منع کرنے کا کوئی امکان ہے ـ

۲- اس خط میں کنویں کھودنے کے ساتھ پانی پینے کا بھی ذکر ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کنویں ایسے حالات میں کھودے گئے ہیں جہاں پانی بھی فراہم ہوا ہے ـ

۳- اس خط کا تعلق کسی ایک کنویں سے نہیں ہے بلکہ ابن زیاد کی خبر میں متعدد کنوؤں کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے ـ

۴- فوجِ دشمن کے کنوؤں کو بند کر دینے کی روایت قطعاً قرین قیاس نہیں ہے ایسا ہوتا تو ابن زیاد کے خط کا موضوع ہی نہ پیدا ہوتا ـ

ناسخ جیسے مورخین نے ان تمام زحمات کو آٹھویں اور نویں محرم سے متعلق کیا ہے اور ان کا بیان ہے کہ یہ کنویں آٹھویں محرم کو کھودے گئے ہیں یا نویں محرم کو ــــــ ــــــ لیکن حالات کی روش بتا رہی ہے کہ یہ اندازے واقعہ کے مطابق نہیں ہیں ـ

ابو مخنف کی روایت یہ ضرور اشارہ کر رہی ہے کہ یہ واقعہ شدت عطش کے بعد پیش آیا ہے لیکن سابق میں واضح کیا جا چکا ہے کہ شدتِ عطش بندشِ آب کے علاوہ ایک شے ہے ـ

" بندشِ آب " کا ایک وقت معین ہے لیکن شدت عطش کا سلسلہ ورودِ کربلا کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا ـ

ابن زیاد کے خط میں پانی پینے کا ذکر بھی واضح کر رہا ہے کہ یہ واقعہ ابتدائی تدبیر سے متعلق ہے جہاں چشمہ بھی برآمد ہوا ہے اور کنویں بھی کھودے گئے ہیں. اس کے بعد جب فوجِ دشمن نے اس پر بھی پابندی عائد کر دی تو یہ سلسلہ بھی روک دیا گیا ہے اور مزید کوئی تدبیر نہیں کی گئی ـ

ان قرائن کے بعد خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری کا یہ دعویٰ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ پانی ملنے کی جملہ روایات کا تعلق ساتویں محرم کے قبل سے ہے ساتویں محرم کے بعد پانی کا کوئی قطرہ کسی راہ سے دستیاب نہیں ہو سکا ـ

دوسری لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام حسینؑ نے " ظاہری امکانات " کی بنا پر کوئی تدبیر نظر انداز نہیں کی اور جیسے جیسے ان تدابیر پر پابندی عائد ہوتی گئی ـ آپ ان طریقوں کو ترک فرماتے گئے اور آخر کار خیام حسینی میں " شدت عطش " کے سوا کچھ نہ رہ گیا ـ

گفتگو کے خاتمہ سے پہلے ابن زیاد کی اس بدحواسی کی طرف متوجہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ وہ جب بھی پانی کے سلسلے میں کوئی حکم بھیجتا تھا تو اس میں عثمان کے حالات کا حوالہ ضرور دیتا تھا ـ

اس کے ذہن میں اب بھی یہ بات کھٹک رہی تھی کہ امام حسینؑ کی مظلومیت کو دیکھ کر فوج میں بغاوت پیدا ہو سکتی ہے اور یہ حالات ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں ـ

ضرورت ہے کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے فوجوں کو " قصۂ پارینہ " سنایا جاتا رہے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ قتل عثمان کی ذمہ داری امام حسینؑ اور ان کے بزرگوں پر ہے ـ

ہمارا مقصد ان سے انھیں واقعات کا انتقام لینا ہے. اب جیسے جیسے خونِ عثمان

سے دلچسپی ہو وہ امام حسینؑ پر سختی کو روا رکھے۔
دشمن کے ذہن میں یہ کھٹک اس کے احساس شکست کا نتیجہ ہے اور دشمن کا احساسِ شکست حزبِ مقابل کے فاتح ہونے کی عظیم ترین دلیل ہے۔
سقائی کا دوسرا وسیلہ نہر سے پانی لانا ہے۔ جس کا ذکر مورخین نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

" ولمّا اشتد بالحسین واصحابه العطش امر اخاه العباس بن علی کانت امه من بنی عامر بن صعصعه ان یمضی فی ثلاثین فارسًا وعشرین راجلا مع کل رجل قربة حتی یاتوا بالماء وحاربوا من حال بینهم وبینه فمضی العباس نحو الماء وامامهم هلال بن نافع حتی دنوا من الشریعة فمنعهم عمرو بن الحجاج فجادلهم العباس علی الشریعة بمن معه حتی ازالوهم عنها واقتحم رجالة الحسین الماء فملئوا قربهم ووقف العباس فی اصحابه یذبون عنهم حتی اوصلوا الماء الی عسکر الحسینؑ ——

الاخبار الطوال ص ۲۵۲

" جب امام حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پیاس کی شدت ہوئی تو آپ نے اپنے بھائی حضرت عباسؑ کو جن کی والدہ بنی عامر سے تھیں حکم دیا کہ تیس سوار اور بیس پیادے لے کر بچاس مشکوں کے ساتھ نہر تک جائیں اور پہرہ داروں سے جنگ کر کے پانی لے آئیں جناب عباسؑ پانی کی طرف چلے۔ آگے آگے ہلال بن نافع تھے۔ دریا کے قریب

پہنچے تو عمرو بن الحجاج نے راستہ روکا [illegible]
کو ہٹا دیا۔
اصحاب امام حسینؑ کے پیادے پانی میں داخل ہو گئے اور مشکیں بھر لیں
حضرت عباسؑ دشمنوں کے دفاع میں مصروف رہے
یہاں تک کہ پانی لشکر حسینؑ تک پہنچ گیا۔"

اس روایت کو دینوری کے علاوہ طبری اور ابن اثیر نے بھی درج کیا ہے لیکن اس میں چند باتیں قابل توجہ ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس میں بھی واقعہ کا اصل موضوع شدتِ عطش ہے۔ "بندشِ آب" نہیں ہے۔ جس کے بعد مورخین کے اس خیال کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی کہ واقعہ کا صحیح وقت کیا ہے اور واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا ہے۔

صاحب "ذکر العباس" نے اس واقعہ کو شب ہشتم میں درج کیا ہے اور قرینہ کے طور پر علامہ ہردمی کی عبارت بھی نقل فرمائی ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان خیالات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔

ارباب مقاتل نے بھی شدت عطش کا حساب کر کے شب ہشتم کی تعین کی ہے جس کے بعد پانی کے وجود کا احتمال سہ روزہ تشنگی کے منافی ہے اور سہ روزہ تشنگی تاریخ و روایات کے مسلمات میں ہے۔

شدت عطش کا سلسلہ تیسری محرم کے بعد سے شروع ہو گیا تھا اور چوتھی محرم آتے آتے ریگستانی علاقہ میں عطش کی شدت ناقابل اندازہ تھی۔

اس کے علاوہ اس روایت میں بچاس مشکوں کا ذکر ہے جس میں ۳۰ سواروں کے پاس تھیں اور بیس پیادوں کے پاس۔ اور اصحاب کتب صرف ۲۰ مشک پانی کا ذکر کرتے

کرتے ہیں۔

شاید ان حضرات کی نظر میں "مع کل رجل قربتہ" سے مراد صرف پیادے ہیں جو کسی حد تک قرین قیاس بھی ہے ورنہ ظاہر روایت کی بناء پر تو ۵۰ مشکیں ہونی چاہئیں تھیں۔ جن میں سے ۲۰ کے بھرنے کی نوبت آئی تھی اور ۳۰ افراد دریا تک پہنچ ہی نہ سکے تھے ———— یہ صرف لشکر کے دفاع میں مصروف رہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس روایت کی صحت کی بنا پر حضرت عباسؑ کے سقاء کہے جانے کی وجہ کیا ہے؟

یہ کام تنہا حضرت عباسؑ نے انجام نہیں دیا آپ کے ساتھ پچاس آدمی اور شریک تھے اور ان پچاس میں بھی آپ نے خود کوئی زحمت نہیں فرمائی۔ بلکہ آپ صرف مصروف دفاع رہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ پانی بھرنے کا کام دوسرے اصحاب انجام دیں اور سقاء کا لقب آپ کو دیدیا جائے۔

اکثر ارباب کتب نے آپ کو اس واقعہ کی بناء پر سقاء تسلیم کیا ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ آپ نے پانی خیام حسینی تک پہنچا دیا اس لئے آپ کو سقاء کہا جاتا ہے یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے جبکہ روایت میں اس پانی کے انجام کا ذکر بھی نہیں ہے صرف بعد کے مولفین نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت نے خود پانی نوش فرمایا اور اصحاب کو بھی پلایا۔ لیکن اس کا کیا اعتبار ہے۔

بعض محققین نے روایت کے سلسلے میں رجال روایت سے بھی بحث کی ہے اور انتہائی کاوش کے ساتھ روایت کو ضعیف اور مہمل قرار دیا ہے۔ لیکن میری نگاہ میں ان تمام زحمتوں کی ضرورت نہیں ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے نہ واقعہ کا شب ہشتم میں ہونا ثابت ہے

اور نہ اس واقعہ کی بناء پر سقاء کا لقب قرین قیاس ہے۔

سقاء کا لقب ان زحمات کا نتیجہ ہے جو آپ نے مختلف اوقات میں برداشت فرمائیں اور جن کے نتیجہ میں بے حد مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔

علامہ مقرم کا یہ ارشاد بڑی حد تک قرین قیاس ہے کہ آپ کو مسلسل زحمات کے نتیجہ میں سقاء کے لقب سے یاد کیا گیا ہے ورنہ ان زحمات کا کامیاب ہونا کسی جہت سے بھی ثابت نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ ابتدائی بندش آب کے بعد سے تحصیل آب کے تین وسائل میں دریا کو سب سے آخر میں کیوں رکھا گیا ہے کہ سب سے پہلے چشمہ جاری کیا گیا۔ اس کے بعد کنویں کھود دیے گئے اور اس کے بعد دریا کی طرف رخ کیا گیا۔

لیکن اس کا واضح ساحل یہ ہے کہ فوج دشمن نے دریا سے خیام ہٹانے کے بعد یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ امام حسین بے دست و پا نہ ہو گئے ہوتے تو کبھی دریا نہ چھوڑتے۔ اور اب اصحاب حسین کے پیاس سے ہلاک ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں ہے۔

امام مظلوم نے اتمام حجت کے لئے پہلے چشمہ جاری فرمایا اور دشمن پر یہ واضح کر دیا کہ ہم بیکس و بے حس نہیں ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ اپنی ذات کے لئے تلوار نہیں اٹھاتے ہمیں پیاسا رہنا گوارا ہے لیکن پانی کے لئے جنگ کا آغاز کرنا گوارا نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ نے سلسلۂ اعجاز کو روک کر عالم اسباب کے قوانین کی طرف توجہ فرمائی اور کنووں کے ذریعہ پانی فراہم کرنے کی سبیل کی۔

اس کے خلاف فوج دشمن نے دوسرا قدم اٹھایا اور حسب امکان اس کوشش

پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔

امام مظلوم نے اس مرحلہ پر بھی کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تلوار نہیں اٹھائی ہے۔

لیکن ایک مرحلہ آگیا جب نہر پر پہرہ داروں کے مقرر ہونے کے بعد عمرو بن الحجاج نے یہ طعنہ دینا شروع کر دیا کہ:۔

"یاحسین هٰذا الماء تلغ فیه الکلاب وتشرب
منه خنازیر اهل السواد والحمر والذئاب ولاتذوق
والله منه قطرة حتی تذوق الحمیم فی نار جحیم"

ناسخ ۶ ۲۳۷

"اے حسین! یہ پانی ہے۔ اس سے جانوران صحرا تک سیراب ہو رہے ہیں۔ لیکن تمہیں ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا یہاں تک کہ (معاذ اللہ) جہنم کے مار حمیم کا مزہ چکھو۔

سردارِ جوانانِ جنت کی شان میں یہ گستاخی صرف ایک بے ادبی نہیں ہے بلکہ اپنے کفر کا کھلا ہوا اعلان ہے جس کے بعد اصحابِ امام کو یوں بھی حملہ کرنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا اور اسے کسی قانون میں بھی جنگ کی ابتداء نہیں کہا جا سکتا تھا۔۔۔

لیکن اصحاب نے کمال صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرضیٔ امام کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

امام حسین نے کمال ضبط کے باوجود یہ ضروری سمجھا کہ دشمن کو اس کے پہرے کی حقیقت سے باخبر کر دیا جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ ہم بے کس و بے بس نہیں ہیں۔

ہماری نظر میں اس پہرے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارا سکوت صرف اس لئے تھا کہ ہم جنگ کی ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ہماری طاقت و قوت کو آواز دی گئی ہے تو ہمارا سردار لشکر جا رہا ہے۔ اب جسے روکنا ہو روکے۔ دیکھو! یہ پانی لاتا ہے یا نہیں۔

حیدرِ کرّار کا شیر بڑھا۔ دریا پر قبضہ کیا۔ اور پانی لے کر چلا آیا

کتنا حسین موقع تھا کہ دریا تک پہنچ جانے کے بعد وہیں قبضہ جما دیا ہوتا اور جو بھی جنگ ہوتی وہ دریا کنارے ہی ہوتی —— اس کے بعد شہادت تو بہر حال مقدر تھی۔

لیکن حضرت عباسؑ کے کردار کی بلندی آواز دے رہی تھی کہ مقصد نہر پر قبضہ کرنا یا دریا کی ترائی میں جنگ کرنا نہیں ہے۔ مقصد اس گستاخی اور غرور کا جواب دینا ہے جس میں عمرو بن الحجاج مبتلا ہو گیا ہے۔

اور جب یہ جواب ہو گیا تو اب پانی کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ پانی پئیں گے تو اسی وقت پئیں گے جب دشمن اپنی بندشوں کو ہٹا کر عام حالات میں پانی کی اجازت دے گا۔ اس کے علاوہ دوسرے حالات میں صرف صبر و ضبط کا مظاہرہ کریں گے اور مظلومیت کے ساتھ دنیا سے گزر جائیں گے۔

ہم صبر و ضبط سے کام نہ لیں۔ اور ہمیشہ اپنی قوت و ہمت کا مظاہرہ کریں گے تو ہماری تاریخ میں مظلومیت کا نام کب آئے گا۔

کس میں ہمت ہے جو اظہار قوت کے مواقع پر ہم پر ظلم کر سکے یا ہمیں کسی تعدی کا شکار بنا سکے۔

ہماری مظلومیت ہمارے صبر ہی کا نتیجہ ہے صبر نہ ہوتا تو ہماری مظلومیت کا امکان ہی نہ پیدا ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی حضرت عباسؑ نے قوت وہمت کا مظاہرہ کرنا چاہا تو فوجیں راستہ روکنے سے قاصر رہیں۔

ابھی تو صرف عمرو بن الحجاج کے رسالہ کا پہرہ ہے اور غازی کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے۔ اور پشت پر پچاس افراد کا لشکر بھی ہے۔

اس جرأت و استقلال کا اس وقت اندازہ ہوگا جب مجاہد تنہا ہوگا ——— اور مشک و علم کی ذمہ داری ہوگی ——— جنگ کی اجازت بھی نہ ہوگی ——— تلوار کی جگہ نیزہ نے لے لی ہوگی۔ اور جنگ کی جگہ سقائی کو مل گئی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ایسے نازک حالات میں چار ہزار کا لشکر کچھ نہ بگاڑ سکا اور حضرت عباسؑ فرات تک پہنچ گئے تو اتنے بڑے لشکر کے ساتھ کس کی مجال تھی کہ راستہ روک لیتا۔

یہ صرف مقصد کا تحفظ تھا کہ عباسؑ نے دریا سے سروکار نہیں رکھا اور اپنی ہمت ووفاداری کا پرچم نصب کر کے واپس چلے آئے۔

سقائی کی اہمیت

کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کے ہر واقعہ کی اہمیت اس کے حالات، ماحول اور گرد وپیش کے کیفیات سے معین کی جاتی ہے۔ سقائی بظاہر کوئی اہم کام نہیں ہے پانی پلانا ایک ثواب کا کام ہے اس سے کسی کردار کی تعمیر نہیں ہوتی۔

لیکن اگر یہی سقائی حالات کی نزاکت کا شکار ہو جائے ——— اور دشوار ترین ماحول میں یہ ذمہ داری سنبھال لی جائے تو اس کا نام پانی پلانا یا سیراب کرنا نہیں ہوگا بلکہ اسے صحیح معنوں میں زندگی دینے سے تعبیر کیا جائے گا۔

گزشتہ صفحات میں سقایت کی عظمت پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ کربلا کے ماحول میں سقائی کا کام کتنا اہم تھا اور حضرت عباسؑ نے اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے بعد کس قدر مشکلات کا سامنا کیا ہے۔

حالات کا یہ عالم تھا کہ گرمی کا زمانہ ——— بے آب وگیاہ صحرا ——— عرب کا ریگزار ——— دھوپ کی حدت اور آفتاب کی تمازت کی شدت تھی ——— دریا کا کنارہ چھوٹ چکا تھا ——— پانی کی لہریں پیاس کی شدت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ”بندش آب“ کا احساس عطش کی شدت کو بڑھا رہا تھا ——— خیام کے گرد وپیش آگ جل رہی تھی ——— آگ کے شعلے ماحول کو جھلسائے دے رہے تھے ——— چہروں کی تازگی کا کیا ذکر دل مرجھائے جا رہے تھے رخساروں کے جھلسنے کا کیا تذکرہ جگر بھی خشک ہو گئے تھے۔

ایسے عالم میں ایک سپاہی تھا جو اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اس کیلئے ہر مصیبت قابل برداشت تھی اور ہر دشواری لائق تحمل۔ شرط یہ تھی کہ امامؑ اور ان کے بچوں کو پانی مل جائے۔

سقائی کے اس جذبہ کی اہمیت کا اندازہ سقاء کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا ——— اور سقاء کی نگاہ میں سقایت کی اتنی ہی اہمیت ہے کہ جب مشک کا پانی بہہ جاتا ہے تو خیام کی طرف بڑھنے کے بجائے دریا کا رُخ کر لیتا ہے اور پلٹ کر پھر اسی ترائی میں آجاتا ہے جس سے فوجوں کو ہٹا کر پانی حاصل کیا تھا۔

فوجوں کو موقع مل جاتا ہے۔ اور چاروں طرف سے محاصرہ ہو جاتا ہے۔ جسم

زخمی ہوتا ہے ــــــ شانے قلم ہوتے ہیں ــــــ سر شگافتہ ہوتا ہے لیکن تعالیٰ کی اہمیت اپنے مقام پر محفوظ ہے ــــــ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں واقع ہوتی۔

اور آخر میں دلی جذبات الفاظ کے سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں ــــــ

"مولا میری لاش خیمے میں نہ لے جائیے گا ــــــ مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔"

مجھے اپنا خون گوارا ہے لیکن وفا کا خون گوارا نہیں ہے ــــــ اپنی تنہائی گوارہ ہے۔ لیکن بھتیجی کی مایوسی سے گوارہ نہیں ہے۔

ایک قابلِ لحاظ بحث

علامہ کنتوری طاب ثراہ نے اس مقام پر ایک نہایت ہی دلچسپ بحث یہ کی ہے کہ امام حسینؑ نے اصحاب و انصار کے ہوتے ہوئے اپنے گھر والوں کو کنویں کھودنے پر کیوں مامور کیا۔؟

اور اس کے بعد اس کے متعدد اسباب بیان فرمائے ہیں۔ یہ اسباب اپنے مقام پر معقول اور باارزش ہیں۔

لیکن ایک وجہ انتہائی عجیب و غریب بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس طرح مخدراتِ عصمت کو بھی "چاہ کنی" میں شرکت کا موقع مل جائے گا اور وہ بھی اس ثواب سے محروم نہ رہیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ بات ایک نکتہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ شرف و کرامت اور اجر و ثواب اپنی جگہ پر ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر شرف میں خواتین و مخدرات کو بھی شریک کر لیا جائے۔ ایسا ہوتا تو خندق کھودنے میں بھی ان کی شرکت ہوتی ــــــ مقدماتِ جنگ کی تربیت میں بھی انھیں شریک کیا جاتا ــــــ اور ثواب کی منزل میں انھیں نظر انداز نہ کیا جاتا۔ جب کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور انھیں اکثر مراحل پر الگ رکھا گیا ہے۔

علامہ موصوف کا یہ استنباط غالباً لفظ "اہل بیت" کی پیداوار ہے جسے امام حسینؑ نے "حفر نہر" کے حکم کے ساتھ استعمال فرمایا ہے۔

حالانکہ اس کا استعمال ان مجاہدوں کے لئے ہوا ہے جو خانوادۂ ہاشمی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس عظیم خدمت میں حصہ لے سکتے تھے۔

اس کے علاوہ دوسرے حکم میں خود اصحاب و انصار کا ذکر بھی موجود ہے ــــــ جس کے بعد اس بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

اہل بیت کی شرافت و عظمت اپنے مقام پر ہے اس سے کسی ذی ہوش کو انکار نہیں ہو سکتا ــــــ لیکن اصحاب کی شرافت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔

یہ خانوادۂ ہاشمی کی جلالت اور قمر بنی ہاشم کی عظمت ہی تھی جس نے اس خدمت کی سربراہی حضرت عباسؑ کے حوالے کر دی تھی۔

سقائی کی تاریخ

سابقہ بیانات کی روشنی میں یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عباسؑ کی سقائی کا تعلق عشرۂ محرم کی کن تاریخوں سے ہے۔ اور آپ کے خدمات سقایت کب انجام پائے!

عام طور سے ان خدمات کی تاریخ کے بارے میں آٹھ، نو محرم کا نام لیا جاتا ہے۔ اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے دریا سے پانی لانے کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد کنوئیں کھودنے کا ذکر آتا ہے ——— اور یہ سلسلہ نویں محرم تک پہنچ جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرات پر مکمل پہرہ کے بعد شب ہشتم پانی لائے۔ اور روز ہشتم جب وہ پانی ختم ہو گیا تو پہلا کنوں کھودا ——— اس کے بعد آخری کنواں روز نہم کھودا گیا۔

لیکن یہ سب باتیں بڑی حد تک بعید از قیاس ہیں ——— عرب کے ریگ زار میں کنواں کھودنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ کہ ہر لمحہ ایک نیا کنواں تیار کر دیا جائے۔

نویں محرم کے حالات ——— دشمن کی شدید نگرانی اور اس میں کنوئیں کھودنے کا ذکر بالکل عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

قرین قیاس یہی ہے کہ یہ سب معاملات ابتدائی بندشِ آب[1] سے متعلق ہیں

جن میں امام حسینؑ نے جنگ کی ابتداء کرنے کے خیال سے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اور جب بسہولت پانی کا امکان نہ رہ گیا تو کنوئیں کھودنے کا حکم دیا۔

دشمن نے اس سلسلے پر بھی پابندی عاید کر دی اور اس کی شدید نگرانی ہونے لگی۔ تو آپ نے کنوئیں کھودنے کا کام بھی رکوا دیا۔

اب دشمن نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ اب پانی ملنے کا راستہ کیا ہو گا۔ تو آپ نے بچوں کی تشنگی اور اپنے اقتدار کی اظہار کے لئے حضرت عباسؑ کو بھیج دیا جو بطور رجعت دریا سے پانی لے آئے . . . . . . ورنہ دریا سے پانی لانا ہی ہوتا تو عاشورہ کی جنگ دوسری محرم کو ہی ہو جاتی۔

دشمن کو اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ ایک پہرہ فرات کا پانی نہیں روک سکتا۔ اس نے فوراً پہرہ دار فوج کی تعداد میں اضافہ کر دیا اور اب ساتویں محرم سے مکمل "بندشِ آب" ہو گئی۔ اس بندشِ آب کا تعلق صرف فرات کے پانی سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد پانی کے جملہ ظاہری امکانات ختم ہو چکے ہیں نہ دریا سے پانی آسکتا ہے۔

ص ۳۶۰ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں

[1] اس سلسلے کے تاریخی مصادر موجود تھے اور جمع بھی کر لئے گئے تھے۔ لیکن خطیب اعظم طاب ثراہ کی کتاب "پیاس" کے دیکھنے کے بعد تفصیلات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ناظرین کرام مفصل بحث وہیں ملاحظہ فرما سکتے ہیں

اس مقام پر صرف ان مزید وجوہ و دلائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کی تفصیل اس کتاب میں نہ تھی۔

جوادی

نہ کنویں کھودے جاسکتے ہیں۔ اور نہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے ــــــ اب خیام حسینی ہیں اور شدتِ عطش ـــــــــــــ اطفالِ حسینؑ ہیں اور صدائے العطش۔

زاں تشنگاں ہنوز بہ عیوق می رسد
آوازِ العطش ز بیابانِ کربلا

فیصلہ کن لمحہ

شمر کوفہ سے دوبارہ آچکا ہے ـــــــــ ابن سعد کو معزولی کا مشروط پیغام مل چکا ہے ـــــــ اور وہ زندگی کے ایک دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔ قتل حسینؑ میں تاخیر کرتا ہے تو قیادتِ لشکر ہاتھ سے جاتی ہے ـــــــ اور شمر ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

قتلِ حسینؑ کا اقدام کرتا ہے تو دین، مذہب، نجات، شفاعت ساری باتیں ختم ہوجاتی ہیں ـــــــ ابن سعد ایک لمحہ تک فکر میں ڈوبا رہا اور لیے جو سر اٹھایا تو اس کبر و نخوت کے ساتھ کہ قتلِ حسینؑ حتمی ہوچکا تھا۔ اور سرِ پُر غرور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھک چکا تھا۔

ضمیر کی موت کا یہ عالم تھا کہ امام حسینؑ برابر سمجھا رہے تھے کہ تجھے رَے کا گیہوں نصیب نہ ہوگا ـــــ اور وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا کہ اپنے لئے جو ہی کافی ہے۔ (جلاء العیون ص ١٩٨)

ابن سعد کی اس آمادگی نے شمر کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ـــــــ اور

اس کی حسرتوں پر اوس پڑ گئی ۔

اس کا تمام تر خیال یہی تھا کہ ابن سعد میری طرح سنگدل اور سخت گیر نہیں ہے اس کا طرز عمل صاف صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ صلح کی باتیں کرتا رہے گا اور جنگ کے ہر امکان کو ٹالنے کی کوشش کرے گا ۔

اسی امید میں اس نے کوفہ تک دوڑ لگائی ــــــ اور ابن زیاد کو سمجھا سمجھا کر فرمان بھی لکھوا لیا ــــــ لیکن خدا برا کرے "بدبختی" کا ــــــ کہ وہ کسی کی میراث نہیں ہے ــــــ ہر وقت ہر شخص کے شامل حال ہو سکتی ہے ۔

چنانچہ ابن سعد جنگ پر آمادہ ہو گیا ــــــ اور شمر کو مرعوب کرنے کے لئے اس طرح آمادہ ہوا کہ عاشورہ کی رات آنے سے پہلے ہی اس نے حملہ کا حکم دیدیا ۔

امام حسینؑ نے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا ــــ اور فوراً حضرت عباسؑ کو حکم دیا :- ؎

" ارکب بنفسی انت "

ف علامہ عبدالرزاق مقرم طاب ثراہ نے اپنی کتاب "قمر بنی ہاشم" میں امام حسینؑ کے اس نقرہ کی بلاغت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ یہ نقرہ حضرت عباسؑ کی اس قدر جلالت اور عظمت مرتبت کی نشاندہی کرتا ہے جس کی شہدائے کربلا میں بھی کوئی نظیر نہیں ہے ۔

زیارت وارثہ کے ذیل میں سائر شہداء کربلا کے بارے میں معصوم کا یہ نقرہ ضرور ہے کہ " بابی انتم و امی " میرے ماں باپ تم پر قربان " لیکن اسکا

(بقیہ ص ٣٦٥ پر)

" بھیا تم پر میری جان قربان ! جاؤ اور جاکر دیکھو کہ معاملہ کیا ہے ؟ "

(بقیہ حاشیہ ص ٣٦٤ سے آگے)

کوئی تعلق معصوم کے قربان ہونے سے نہیں ہے ۔ یہ صرف امت کو تعلیم دی گئی ہے کہ تم جب زیارت شہدائے کربلا کے لئے جاؤ تو یہ جملہ زبان پر رکھو ــــــ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ مقام تعلیم مقام تقدیر سے بالکل مختلف ہے ۔

مقام تعلیم میں مخاطب کے فدا ہونے کا ذکر ہوتا ہے اور مقام تقدیر میں خود امام معصوم کے فدا ہونے کا تذکرہ ہوتا ہے ۔

شہدائے کربلا کی عظمت و جلالت اپنے مقام پر ہے ۔ لیکن یہ منزل وہ نہیں ہے جہاں امام معصوم اپنی جان یا اپنے ماں باپ کی جان کو قربان کر سکے ۔

یہ شرف صرف حضرت عباسؑ کے لئے ہے کہ امام حسینؑ نے مقام تعلیم میں نہیں بلکہ مقام تقدیر میں اپنی جان قربان کرنے کا ذکر کر کے قمر بنی ہاشم کی عظمت و جلالت میں چار چاند لگا دیئے ہیں ۔

علامہ موصوف کے اس عظیم افادہ کے علاوہ ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے ــــــ کہ امام حسینؑ نے اپنی موجودگی میں جنگ کے ملتوی کرنے کی تحریک کے لئے حضرت عباسؑ کو بھیجا اور خود سامنے نہیں آئے ۔

جب کہ تاریخ کربلا گواہ ہے کہ امام حسینؑ متعدد بار اتمام حجت کے لئے فوج دشمن کے سامنے آئے ــــــ اور مختلف وسائل سے انھیں سمجھاتے رہے ۔ کبھی ابن سعد سے براہ راست گفتگو فرمائی ۔ کبھی دشمنوں کے سامنے

حضرت عباسؑ بیس افراد کو لے کر فوج دشمن کے سامنے گئے اور پوچھا آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

جواب ملا کہ اب صلح و صفائی کی تدبیریں ختم ہو چکی ہیں۔ حسینؑ سے کہہ دو کہ بیعت کریں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۵ سے آگے)

آ کے اپنا تعارف کرایا۔ اپنا نسب شریف سمجھایا اور انھیں اپنا خون بہانے سے روکا۔

لیکن پہلی منزل میں جب دشمن نے حملہ کا ارادہ کیا تو آپ بنفس نفیس سامنے نہیں آئے ——— بلکہ آپ نے اس کام کے لئے اپنے سردار لشکر قمر بنی ہاشم کا انتخاب فرمایا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اب عباسؑ کا اقدام حسینؑ کا اقدام ہو گا ——— اور ان کی گفتگو امام حسینؑ کی گفتگو تصور کی جائے گی۔

یہ اور بات ہے کہ عباسؑ امام کے حکم سے ہٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ——— تاریخ میں یہ عظمت سب سے پہلے جناب مسلمؑ کو عطا کی گئی ہے ——— جہاں آپ کو مستقل طور پر کوفہ کا سفیر بنا کر بھیجا گیا اور ساتھ یہ سند دی گئی کہ میں اپنے ثقہ و معتمد علیہ بھائی مسلم کو بھیج رہا ہوں۔ میرے آئندہ اقدامات بھی انھیں کے بیانات کی روشنی میں طے ہوں گے۔

اور آج یہ شرف حضرت عباسؑ کو دیا جا رہا ہے۔

فرق یہ ہے کہ حضرت مسلم نے یہ فرائض امام کی عدم موجودگی میں انجام دیئے اور وہاں انجام دیئے جہاں امام کا جانا مصلحت کے خلاف تھا اور حضرت مسلم

(بقیہ ص ۳۶۷ پر)

حضرت عباسؑ کی غیرت و حمیت کے لئے یہ فقرہ ناقابل برداشت تھا لیکن سفارتی ذمہ داریوں کا خیال رکھتے ہوئے واپس مولا کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ دشمن "بیعت یا جنگ" کے سوال پر مصر ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۶ سے آگے)

کی حیثیت ایک تمہید اور مقدمہ کی تھی۔

اور حضرت عباسؑ نے اس خدمت کو امام مظلومؑ کی موجودگی میں انجام دیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام کی موجودگی میں مسائل حرب و صلح کا طے کرنا عباسؑ کا کام ہے۔

سفارت اور نمائندگی کے اشتراک ہی کا یہ اثر ہے کہ معصومین نے دونوں کی زیارت کا بھی ایک ہی جیسا انداز رکھا ہے۔ اور جن الفاظ میں حضرت عباس کو یاد کیا ہے تقریباً انھیں الفاظ میں جناب مسلمؑ کا بھی ذکر ہے۔

یہ اور بات ہے کہ قربانی کی منزل میں حضرت عباسؑ کی منزل جناب مسلمؑ سے کہیں زیادہ بلند تھی۔ جس کا اندازہ کربلا کے واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مسلمؑ فوج دشمن کے لئے حضرت عباسؑ کی جرأت و ہمت کا نمونہ تھے ان کی عمر ۲۸ سال تھی اور حضرت عباسؑ کی عمر ۳۴ سال۔ وہ عقیل کے فرزند تھے اور یہ حیدرؑ کرار کے شیر۔

دشمن نے کوفہ ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ جب ۲۸ سال کے جوان کے مقابلے میں ۵۰۰۰ کی فوج ناکام ہو رہی ہے تو ۳۴ سال کے شیر اور ان کے ہمراہ جمع ہونے والے جوانان بنی ہاشم کی جرأت و ہمت کا کیا عالم ہو گا؟

(بقیہ ص ۳۶۸ پر)

اب حضور کا حکم کیا ہے ؟

آپ نے فرمایا کہ ——— بیعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے ——— اب جنگ ہی ہوگی ——— لیکن دشمن سے کہہ دو کہ ممکن ہو تو ایک شب کے لئے جنگ کو ٹال دے تاکہ ہم لوگ یہ رات ذکر الٰہی میں بسر کر سکیں ۔

دن کا ایک ایک لمحہ بڑی نزاکت کے ساتھ گزر رہا تھا ——— امام حسینؑ اور ابن سعد میں ایک معنوی جنگ جاری ہے ۔

ابن سعد کو معلوم ہے کہ حسینؑ اور ان کے بزرگوں نے عاشورہ کے دن شہادت کی خبر دی ہے

اب اگر یہ واقعہ ایک لمحہ پہلے بھی پیش آجائے تو ان کے بزرگوں کی صداقت مجروح ہو جائے گی ۔ اور اس طرح حاکم کی معنوی فتح ضرور ہو جائے گی ۔

امام حسینؑ ان ناپاک عزائم پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے ۔ آپ ہر امکانی کوشش سے اس موقع کو ٹالنے کی فکر میں تھے ۔ کہ جنگ کا آغاز نہ ہونے پائے ۔ دشمن کا موقف سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اور امام حسینؑ کے صبر و تحمل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ———

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۷ سے آگے)

ابن زیاد کربلا میں صرف امام حسینؑ کو مرعوب کرنے کے لئے فوج نہیں جمع کر رہا تھا ۔ بلکہ اس کے سامنے کوفہ کا تلخ تجربہ بھی تھا ۔ وہ فوج کے ہر اضافہ کے بعد غیر مطمئن تھا کہ کہیں ہاشمی جوانوں کو جلال نہ آجائے اور فتح و کامرانی کا بنا بنایا منصوبہ خاک میں مل جائے ۔

(جوادی)

نتیجہ میں امام حسینؑ نے شب عاشورہ کی حق و صداقت کی جنگ فتح کر لی اور ایک شب کی مہلت مل گئی ۔

اس ایک شب کی مہلت لینے میں عبادت و ذکر الٰہی کا تذکرہ بھی کسی معنویت سے خالی نہیں ہے ۔

امام حسینؑ دشمن کو متوجہ کر رہے ہیں کہ آخری وقت میں بھی طرفین کے عزائم سامنے آجائیں اور واضح ہو جائے کہ تمہارے سامنے صرف جنگ ہے اور ہمارے سامنے جنگ سے بالاتر ذکر خدا کا خیال ہے ۔

مہلت کے اس سوال پر ابن سعد نے زعماء لشکر کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور یہ طے ہونے لگا کہ حسینؑ اور ان کے اصحاب کو مہلت دی جائے یا نہیں ؟ شمر کے لئے یہ بھی ایک حسین موقع تھا ۔ اس کا منشا یہی تھا کہ کسی طرح جنگ چھڑ جائے اور اس کے چھڑنے کا سہرا میرے ہی سر باندھ دیا جائے ۔

اس طرح مجھے تین قسم کے فوائد حاصل ہوں گے ۔

۱۔ حسینؑ کے بزرگوں کی صداقت مجروح ہو جائے گی ۔

۲۔ ابن سعد سے قیادت لشکر چھن جائے گی ۔

۳۔ میں حاکم وقت کی بارگاہ میں سرخرو ہو جاؤں گا ۔

ابن سعد وقت کی نزاکت دیکھ کر گھبرا گیا ۔ اور اس کی قوت فیصلہ نے جواب دیدیا ۔ "حالات یا مزاج"؟ حالات جنگ چاہتے ہیں اور مزاج جنگ پر آمادہ نہیں ۔

اتفاقاً عمرو بن الحجاج بول پڑا ——— اور ابن سعد کی عزت بچ گئی ——— اس نے کہا کہ حسینؑ تو حسینؑ ہیں اگر ترک و دیلم کے غلام بھی ایک شب کی مہلت مانگتے تو ہم مہلت دیدیتے ۔

ابن سعد نے موقع پاتے ہی اس کی رائے کی صحت پر زور دیا ——— اور شمر اپنے اس مشن میں بھی ناکامیاب ہوگیا۔ فوجوں میں چاروں طرف منادی کرادی گئی کہ آج کی رات جنگ ملتوی رہے گی ——— اور کل صبح کو آخری فیصلہ ہوگا۔

جنگ کے التواء کا اعلان تو ہوگیا ——— لیکن شمر کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس نے اپنے مقام پر یہ فیصلہ کیا کہ اب فوجی کمان میرے مقدر میں نہیں ہے اور مجھے صرف سردار لشکر ہی رہنا پڑے گا۔

بہتر ہے کہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں جو مجھے حاکم کے سامنے سرخرو بنا سکے اور ابن سعد کے مقابلہ میں زیادہ مدبر اور مخلص ثابت کر سکے ——— چنانچہ یہی خیال تھا جس نے شمر کو امان نامہ پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ ورنہ التواء جنگ کی تحریک میں شمر کی تقریر اسکے بالکل برعکس تھی۔

"امان نامہ" کی تحریک سے اکثر ارباب قلم کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ شمر کو رشتہ داری کا خیال آگیا اور اس نے حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کو جنگ کی آگ سے بچا لینا چاہا "سچ ہے ماموں کا رشتہ رحم و کرم کی علامت کرتا ہے۔"

حالانکہ یہ خیال انتہائی مہمل ہے۔ شمر جنگی تدابیر میں ابن سعد سے کہیں زیادہ ہوشیار تھا وہ کوفہ سے ہر طرح سے مسلح ہو کر آیا تھا اور اس کے پیش نظر مسئلہ کے تمام جہات تھے۔

اس نے ابن زیاد سے بیک وقت دو پروانے حاصل کئے تھے ——— ایک ابن سعد کے نام کہ جنگ چھیڑ دی جائے اور ایک امان نامہ کی شکل میں حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کے نام کہ تمہارے لئے اب بھی امان کے امکانات ہیں تاکہ جب بھی موقع آجائے میری برتری بہر حال سلامت رہے۔

امان نامہ کی مستقل کوئی حیثیت ہوتی تو جس وقت آغاز جنگ کے بعد حضرت عباسؑ امام حسینؑ کا پیغام لے کر گئے تھے ——— شمر فوراً کہہ دیتا کہ تم سے کیا مطلب ہے۔ تمہارے لئے تو مستقل طور پر امان ہے۔ تم حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دو۔ ہم ان کے بارے میں اپنا فیصلہ کرلیں گے۔

لیکن عصر نہم امان نامہ کا ذکر نہ کرنا ——— اور شب عاشور امان نامہ لے کر آنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شمر حالات کی رفتار کے ساتھ اپنے اقدامات میں تبدیلی کر رہا تھا اور ابن سعد کو بدنام کر کے فوجی کمان سنبھالنے کی فکر میں پریشان تھا۔

اور جب اسے اس منصوبہ میں بھی ناکامیابی ہوگئی تو اب امام حسینؑ کی فوجی طاقت کو کمزور کرنے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

شمر کی نگاہ میں اس کے خاندان سے زیادہ کوئی بہادر خاندان نہ تھا ——— اور حضرت عباسؑ اس خاندان کے چشم و چراغ تھے ——— اس نے سوچا کہ انھیں لشکر حسینؑ سے الگ کر لیا جائے تو لشکر کی کمر خود ہی ٹوٹ جائے گی اور انھیں قتل کر دینے میں کوئی زحمت نہ ہوگی۔

حضرت عباسؑ "شمر" کی "پست فطرتی" سے بخوبی باخبر تھے ——— ——— وہ جانتے تھے کہ یہ عیار و مکار کوئی مخلصانہ اقدام نہیں کر سکتا اس لئے آپ نے اس کی آواز پر لبیک بھی نہیں کہی اور اسے یکسر نظر انداز کر دیا

لیکن جب امام حسینؑ نے فرمایا:-

"اجیبوہ وان کان فاسقا۔"

اگرچہ شمر فاسق ہے لیکن دیکھو کیا کہہ رہا ہے[1] تو مجبوراً اطاعتِ امامؑ کے احترام میں شمر کے پاس چلے گئے۔

شمر نے امان نامہ پیش کر دیا اور اپنی طرف آجانے کی دعوت دیدی۔ غیرت ہاشمی کے لئے یہ آخری فیصلہ کن لمحہ تھا۔

جناب عباسؑ نے شمر سے فرمایا۔ "خدا تیرے امان نامہ پر لعنت کرے تیرا مقصد یہ ہے کہ ہم امام حسینؑ کو چھوڑ کر ملاعین اور ملاعین کی اولاد کی اطاعت میں داخل

---

[1] علامہ کنتوری کا بیان ہے کہ امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کے بجائے ان کے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم شمر کو جواب دو اور اس سے گفتگو کرو تا کہ حضرت عباسؑ کا احترام محفوظ رہے۔ ان کی نظر میں تاریخ کے صحیح الفاظ یہ ہیں۔

" فقال الحسینؑ لاخوتہ اجیبوہ ۔

امام حسینؑ نے ان کے بھائیوں سے کہا کہ شمر کی بات سنو۔

حالانکہ ان دونوں عبارتوں میں کوئی فرق نہیں ہے ———— شمر نے تمام بھائیوں کو آواز دی تھی اور امام حسینؑ کو بھی تمام بھائیوں کو مامور کرنا تھا

" اَجِیْبُوْہُ وَاِنْ کَانَ فَاسِقاً "

کا خطاب اسی جماعت کے لئے ہے ———— صرف حضرت عباسؑ کے لئے نہیں ہے۔

"اخوتہ" ———— میں بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ صرف حضرت عباسؑ کے بھائی مراد ہوں۔ اور وہ خود اس خطاب سے باہر ہوں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ خود اپنے ہی بھائی مراد ہوں۔ اسلئے کہ جناب عباسؑ کے بھائیوں کے علاوہ کربلا میں امام حسینؑ کا واقعی بھائی کون تھا جو اس طرح اپنی جان نثار کرتا اور جسکی اسے آڑے وقت میں ضرورت پڑتی۔ (جوادی)

ہو جائیں گے۔

غضب خدا کا ہمارے لئے امان ہے اور فرزند رسولؐ کے لئے امان نہیں ہے۔

ناسخ التواریخ ۶ ص ۲۲۳، اعثم کوفی ص ۲۶۷

جناب عباسؑ کا جواب معرفت و جرأت سے بھرپور تھا۔ آپ نے ایک طرف وفاداری اور معرفت کا اعلان کیا۔ اور دوسری طرف واضح لفظوں میں یزید و ابن زیاد کے حالات کا اظہار فرما دیا۔

شمر اس آخری تدبیر میں بھی ناکام ہو گیا۔ اور اسے سیاسی و معنوی دونوں محاذوں پر کھلی ہوئی شکست ہو گئی۔

سیاسی اعتبار سے وہ امام حسینؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈال کر سردار کو توڑنا چاہتا تھا اور نتیجہ میں امامؑ مظلوم کی فوجی طاقت کو کمزور بلکہ نیست و نابود کر دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔

جناب عباسؑ کے جواب نے اس منصوبہ کو خاک میں ملا دیا اور یہ بتا دیا کہ میرا ساتھ صرف قرابت کی بناء پر نہیں ہے، اس کی پشت پر معرفت امامؑ کا جذبہ کارفرما ہے اور میری غیرت ایمانی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں بیعت امامؑ کو توڑ کر اطاعت ملاعین میں شامل ہو جاؤں۔

حضرت عباسؑ کا یہ جواب وفاداری کی اس تاریخ کا امتداد ہے جس کا سلسلہ حضرت ابوطالبؑ سے شروع ہوا ہے۔

کل نصرت ابوطالب پر یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ ابوطالب نے رسول اکرمؐ کی امداد قرابت کی بنا پر کی تھی۔ اور آج جناب عباسؑ کی نصرت پر یہی الزام لگا دیا جاتا۔ آپ نے صحیح صورتِ حال کو فوراً واضح کر دیا کہ اور دنیا کو بتا دیا کہ میری نصرت کے پیچھے

رشتہ و قرابت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ یہ خالص نصرتِ دینِ الٰہی ہے جس کا مقصد تحفظِ امامؑ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

معنوی اعتبار سے شمر ملعون کا مدعا مولائے کائنات کے "مشہور مقصد" کی تکذیب تھا کہ عباسؑ امام حسینؑ پر قربان نہ ہونے پائیں۔ اور اس طرح وہ مقصد خاک میں مل جائے جس کے لئے جناب امیرؑ نے عباسؑ کو فراہم کیا ہے۔

اس بات کا علم شمر سے بہتر کس کو ہو سکتا تھا ——— وہ جناب ام البنین کا حقیقی بھائی نہ سہی خاندانی . . . . . عزیز تھا اور عرب میں ایسی خبریں پورے قبیلے میں پھیل جایا کرتی ہیں کہ فلاں عقد کس نوعیت کا اور کس مقصد کے تحت انجام پا رہا ہے۔

جناب عباسؑ نے امان نامہ کو ٹھکرا کر باپ کے مقصد کی لاج رکھ لی۔ اور یہ واضح کر دیا کہ دولت دنیا یا اقتدارِ مادی حقانیت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے . . . . حق والے حق کے ساتھ رہتے ہیں . . . . . انھیں بیعت باطل سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یہ جذبہ اس وقت ابھر کر سامنے آیا جب اسی رات . . . . . حضرت زہیر قین نے خطاب کرکے فرمایا۔

" عباسؑ! تمھیں معلوم ہے کہ تمہارے بابا نے تمھیں کس دن کے لئے مہیا کیا ہے "!

اور شیرِ کربلا نے ایک انگڑائی لے کر فرمایا۔

" زہیر تم آج کے دن شجاعت دلا رہے ہو . . . . . . بس یہ ایک رات اور باقی ہے اس کے بعد دیکھنا کہ عباسؑ اپنے مقصد حیات کو کیونکر پورا کرتا ہے "!

عباسؑ کی انگڑائی میں کیا زور تھا ——— اور ان کے جملوں کے پیچھے کون سا جذبہ کام کر رہا تھا ——— اس کا اندازہ کرنا ایک مورخ کے بس کی بات نہیں ہے۔

مورخ حالات کا خاموش تماشائی ہوتا ہے، اسے دردِ جگر اور "سوزِ قلب" سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

کا فیصلہ عصر سے پہلے ہی ہو جاتا۔ لیکن پیکرِ اخلاص و وفا اور مجسمۂ عرفان عباسؑ مرضیِ امامؑ پر نظر جمائے رہے اور ہر قدم پر خون کے نئے گھونٹ پیتے رہے۔

عباسؑ کی جرأت و ہمت کو ظاہر ہونے کا موقع تو نہیں ملا۔ لیکن ان کی جلالت و عظمت مہرِ نیمروز کی طرح روشن ہو گئی۔ اب دنیا باقاعدہ طور پر یہ اندازہ کر سکتی ہے کہ جرأت و ہمت کے مظاہرے اور ہوتے ہیں اور صبر و شجاعت کے مظاہرے اور۔

جذبۂ و عقل پر غالب آجائے تو جرأت و ہمت ہے اور جذبات و احساسات عقل کے سانچے میں ڈھل جائیں تو شجاعت و عرفان۔

تجدیدِ عہد

عاشورہ کی رات بظاہر "طوق بیعت" اتارنے کی رات تھی ——— اس رات اصحاب کو مکمل آزادی دی جا رہی تھی ——— اور انھیں بتایا جا رہا تھا کہ یہاں "تلف جان" کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جس کو جانا ہو جلد ہی حدود مملکت سے نکل جائے۔

لیکن حقیقتاً یہ تجدیدِ عہد کی رات تھی جب امام حسینؑ اپنے اصحاب و اعزا کو صورت حال سے باخبر کر کے جانے کی مکمل آزادی دے رہے تھے ——— اور ضمناً اس بات کی طرف متوجہ فرما رہے تھے کہ اب جسے بھی رہنا ہے وہ عہدِ وفا کی تجدید کر کے رہے ——— اب موت و حیات کوئی مسئلہ نہیں ہے ——— اب زندگی کی بازی لگانا ہے ——— اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا ہے۔

تجدیدِ عہد کا یہ انوکھا انداز شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو ——— سربراہ مقصد جانے کی اجازت دے رہا ہے اور جانے والے مرنے پر کمر باندھے

ہوئے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ امام حسین نے شب عاشورا اپنے خطبہ میں اپنے اصحاب و اہل بیت کی وفا کا اعلان کرنے سے پہلے یہ واضح کر دیا تھا کہ جسے جانا ہے وہ چلا جائے اور تنہا جانے میں شرم آتی ہے تو ہمارے اہل بیت میں سے ایک ایک شخص کی انگلی پکڑ کر لے جائے۔

لیکن اصحاب و انصار اور جوانان بنی ہاشم ضبط نہ کر سکے اور سب سے پہلے عباس خاندان کی نمائندگی کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ عرض کی۔

"لِمَا نَفْعَلُ ذٰلِكَ لِنَبْقٰى بَعْدَكَ لَا اَرَانَا اللّٰهُ"

"کیا آپ کو چھوڑ کر اس لئے چلے جائیں کہ آپ کے بعد زندہ رہنا ہے خدا وہ دن نہ دکھائے۔"

حضرت عباس کا یہ کہنا تھا کہ اصحاب و اہلبیت کے دلوں کی رگوں میں خون وفا جوش مارنے لگا اور سب نے یکے بعد دیگرے سے اپنے جذبات کا اظہار شروع کر دیا سب سے پہلے گھر والوں نے ان لفظوں کو دہرایا۔ مقتل عوالم۔

اس کے بعد مسلم بن عوسجہ، زہیر بن قین، سعید بن عبد اللہ۔ ایک ایک کر کے اٹھتے رہے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ مولا ——— ایک مرتبہ کا مرنا جینا کیا ہے۔

اگر ستر مرتبہ یا ہزار مرتبہ بھی قتل کئے جائیں اور قتل کے بعد نذر آتش کر دیئے جائیں۔ ہماری خاکستر کو ہوا میں اڑا دیا جائے اور دوبارہ زندگی دیدی جائے تو آپ کی نصرت سے کسی وقت بھی باز نہ آئیں گے۔

اس موقعہ پر امام حسین کے وہ الفاظ بھی قابل توجہ ہیں جن کے جواب میں ان جذباتِ وفا کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

امام زین العابدین کا بیان ہے کہ جب پدر بزرگوار نے شب عاشور تقریر کا ارادہ فرمایا تو میں بحالت مرض دھیرے دھیرے اس مقام تک پہنچا جہاں اصحاب کو جمع کیا گیا تھا اور چاہا کہ بابا کی زبان سے صحیح حالات کا جائزہ لے سکوں اور یہ دیکھوں کہ ایسے مواقع پر آپ کیا ہدایت فرما رہے ہیں۔

آپ نے اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا۔

"اُثْنِي عَلَى اللهِ اَحْسَنَ الثَّنَاءِ وَاَحْمَدُهُ عَلَى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَحْمَدُكَ عَلٰى اَنْ كَرَّمْتَنَا بِالنُّبُوَّةِ وَعَلَّمْتَنَا الْقُرْاٰنَ وَفَهَّمْتَنَا فِي الدِّيْنِ وَجَعَلْتَ لَنَا اَسْمَاعًا وَاَبْصَارًا وَاَفْئِدَةً فَاجْعَلْنَا مِنَ الشَّاكِرِيْنَ ـــــ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفٰى مِنْ اَصْحَابِيْ وَلَا اَهْلَ بَيْتٍ اَبَرَّ وَاَوْصَلَ مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ فَجَزَاكُمُ اللهُ عَنِّيْ اَلَا وَاِنِّيْ لَاَظُنُّ يَوْمَنَا مِنْ هٰؤُلَاءِ ـــ اَلَا وَاِنِّيْ قَدْ اَذِنْتُ لَكُمْ فَانْطَلِقُوْا جَمِيْعًا فِيْ حِلٍّ لَيْسَ عَلَيْكُمْ حَرَجٌ مِنِّيْ وَلَا ذِمَامٌ ـــ هٰذَا اللَّيْلُ قَدْ غَشِيَكُمْ فَاتَّخِذُوْهُ جَمَلًا وَتَفَرَّقُوْا فِيْ سَوَادِهٖ فَاِنَّ الْقَوْمَ اِنَّمَا يَطْلُبُوْنَنِيْ وَلَوْ ظَفِرُوْا بِيْ لَذَهَلُوْا عَنْ طَلَبِ غَيْرِيْ"

ناسخ التواریخ ج ۶ ص ۲۴۲، مقتل عوالم ص ۸

" مالک کی بہترین ثنا۔ اور نرم گرم زمانہ میں اس کا بے حد شکر مالک! تیرا شکر کہ تو نے ہمیں نبوت سے سرفراز کیا۔ قرآن کریم کا علم دیا۔ دین کی بصیرت دی۔ اور مذہب میں گوش شنوا چشم بینا

اور دل دانا عطا کیا۔ مالک ہمیں شکر گزاروں میں قرار دے۔

امابعد۔ میرے علم میں میرے اصحاب سے زیادہ باوفا اصحاب اور میرے گھر والوں سے زیادہ نیکو کار اور حفظ قرابت کرنے والے اہل بیت نہیں ہیں۔ خدا تمہیں جزائے خیر عطا کرے ـــــ

یاد رکھو یہ دن صرف میرے لئے ہے۔ میں نے تمہیں سب کو اجازت دیدی ہے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو چلے جاؤ ـــــ تم سب پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے ـــــ یہ رات بھی چھا چکی ہے ـــــ اسے ذریعہ قرار دے کر اس کی تاریکی میں جہاں چاہو چلے جاؤ ـــــ یہ قوم صرف مجھے چاہتی ہے اور مجھے پالینے کے بعد پھر کسی کی طرف متوجہ نہ ہوگی۔"

دنیا کے دوسرے سربراہوں کی تاریخ میں ایسے واقعات تو مل سکتے ہیں جہاں انھوں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں قوم سے بیعت اٹھالی ہو اور انھیں آزاد کر دیا ہو۔

لیکن ان کی تقریروں کا لہجہ ہمیشہ جذباتی اور نفسیاتی ہوا کرتا ہے تاکہ سربراہوں کا فرض ادا ہو جائے اور لشکر متفرق بھی نہ ہونے پائے۔

امام حسینؑ کے اس خطبہ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ آپ نے اس میں کسی بھی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں فرمایا ـــــ نہ اپنی بے کسی کا اظہار کیا ـــــ اور نہ اپنے سپاہیوں کے جذبات کو ابھارا ـــــ صاف صاف لفظوں میں صورت حال کو واضح کر کے ان کی ذمہ داری کو ختم کر دیا اب وہ جہاں چاہے جا سکتے ہیں۔

لیکن [illegible]

[illegible]

کا انداز حساسیت سے بھرا ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرفانِ امامؑ نے ان کے نفوس کو مخصوص جذبات کے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور یہ امامؑ کے بعد زندگی کو زندگی ہی نہیں سمجھتے ہیں ان کے ذہن میں حیات و کائنات سب امامؑ کے فیوض و برکات کا صدقہ ہیں اور کسی ذرۂ کائنات کو ان سے ہٹ کر باقی رہنے کا حق نہیں ہے۔

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے جذباتِ وفا کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ ہزار بار بھی زندہ کئے جائیں تو آپ کی نصرت سے منہ نہ موڑیں گے اور اس زندگی کو آپ کا صدقہ ہی سمجھیں گے۔

ظاہر ہے کہ اس عرفان و احساس میں حضرت عباسؑ سے بالاتر کون ہو سکتا ہے۔ آپ کا دل معرفتِ امامؑ سے سرشار اور آپ کا مقصدِ وجود قربانی کی دعوت تھا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے احساسات کا اعلان کیا اور ایسے لہجہ میں کیا کہ اس کے بعد اصحاب و اہلبیت میں کوئی خاموش نہ بیٹھ سکا۔ اور ہر شخص نے حسب امکان اپنی وفا کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ حالات نزاکت کے اس موڑ پر آ گئے تھے کہ ہر شخص اپنی تقریر کو سابق کی تقریر سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور دل میں صرف ایک تڑپ تھی کہ مولا ہماری وفا پر اعتماد فرما لیں۔

امام حسینؑ سے بہتر ان قلبی کیفیات کا جاننے والا کون ہوگا۔ آپ نے پہلے ہی ان نفسیات کا احساس کر کے ان کی وفاداری کا اعلان فرما دیا تھا۔ اصحاب کا زورِ بیان امامؑ کے اعتماد پیدا کرنے کے لئے قطعاً نہ تھا۔ یہ دنیائے عرفان کے لئے ایک درس عبرت تھا کہ صحیح عقیدہ اور صالح کردار کے بعد زندگی اور موت کے پیمانے بدل جایا کرتے ہیں۔ کمزور عقیدہ والوں کا معیار حیات اور ہوتا ہے اور مستحکم عقیدہ و الفت والوں کا معیار زندگی اور ا

معرکۂ کارزار

آفتاب کربلا مسافتِ شب طے کر چکا ہے ——— سحر کا رخ بے حجاب جلوہ افروز ہے ——— بندگانِ کردگار عبادتِ پروردگار میں مصروف ہیں اور روحِ یزید جام و سبو میں تیر رہی ہے۔

فوج دشمن صف آرائی پر آمادہ ہے ——— ابن سعد اپنے لشکر کا آخری جائزہ لے رہا ہے ——— چند لمحوں میں جنگ شروع ہونے والی ہے۔ اور ایسی جنگ ہونے والی ہے کہ سر اڑتے ہوئے نظر آئیں گے اور ہاتھ کٹ کٹ کے گرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ادھر امامؑ مظلوم کبھی مصلائے عبادت سے اٹھ چکے ہیں ——— اور جہاد کی آخری تیاریوں میں مصروف ہیں ——— لیکن دونوں کے اہتمام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُدھر اسی ہزار یا کم از کم ۳۰ ہزار کا لشکر ہے۔ اِدھر ۷۲ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴۵ خلوص و وفا کے پیکر ہیں۔

اُدھر میمنہ و میسرہ و قلب میں ۲۰۔ ۲۰ ہزار کی تعداد ہے اور اِدھر ۲۰ سے زیادہ

کی گنجائش نہیں ہے۔

ادھر ابن سعد نے اپنے لشکر کو مرتب کیا ـــــ اور میمنہ پر شمر بن ذی الجوشن کو رکھا ـــــ میسرہ پر خولی بن یزید اصبحی کو رکھا ـــــ قلب لشکر کو دو حصوں پر تقسیم کیا ـــــ سواروں کا افسر عروہ بن قیس کو مقرر کیا اور پیادوں کا سردار شبث بن ربعی کو قرار دیا۔

ناسخ التواریخ ج ۶ ص ۲۴۹

ادھر شاہ کم سپاہ کے پاس اتنی سپاہ کہاں کہ ترتیب لشکر کا کوئی اہتمام کیا جاتا رات تمام عبادت الٰہی میں گزر گئی ہے۔ صبح کو مجاہدین مصلے پر ہیں۔ اور تعقیبات کا سلسلہ جاری ہے۔

دفاع کے فرض ـــــ اور حفاظت خود اختیاری کی ذمہ داری نے ظاہری ترتیب کی دعوت دی ہے تو امام مظلوم نے میمنہ پر زہیر ـــــ میسرہ پر حبیب اور قلب پر عباسؑ علمدار کو مقرر کر کے انھیں رایت لشکر دیدیا ہے۔

ابصار العین ص۲۹ ناسخ ج ۶ ص ۲۴۹

یہ پہلا موقع ہے جب عباسؑ کو اپنے مقصد حیات کی تکمیل کا وسیلہ ہاتھ آیا ہے ـــــ اور سرداری لشکر نے اطمینان دلایا ہے کہ اب ہر آن میدانِ جہاد ہی میں رہنا ہے۔ جوشِ شجاعت حوصلے بڑھا رہا ہے۔ اور حسرت دعائیں دے رہی ہے۔ " خدا کرے اذنِ جنگ مل جائے "

فکر تکمیلِ شہادت میں ہیں شاہ کربلا
دل لرزتا ہے کہ تیرا نام بھی محضر میں ہے
(زوار کراروی)

عباسؑ علمدارِ لشکر ہو تو فتح و ظفر میں کیا دیر ہے ـــــ اور کامیابی و

کامرانی کتنی دور ہے۔ بعید نہیں کہ کربلا کا تختہ الٹ جائے اور جنگ کا نقشہ بدل جائے۔

زہیر کے جواب میں یہ کہا بھی جا چکا ہے کہ آج جوش شجاعت نہ دلاؤ آج تو دنیا کو اندازہ ہو جائے گا کہ شجاعت کسے کہتے ہیں۔ اور عباسؑ کیسا شجاع ہے۔

انھیں نازک حالات میں عباسؑ نے سرداری لشکر کا عہدہ سنبھالا.... اور اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

تاریخ کی غفلتوں کا شکوہ بیکار ہے۔ مورخ سے جذبات کی ترجمانی کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ فوج دشمن کا محاصرہ خیام حسینی۔ اور خیام کے اندر مجاہدین۔ پھر مجاہدین کے سینوں میں دل اور دل کے اندر چھپے ہوئے جذبات کو کیا بیان کرے گا۔

بصیرت آگین نگاہ اور ہوش مند دل و دماغ ہو تو اندازہ کرے کہ عباسؑ کا ایک ایک لمحہ کس اضطراب میں گزر رہا ہے۔

مرثیہ نگار حضرات نے اس مقام پر بہت کچھ وفا کا حق ادا کیا ہے۔ اور تلامیذ الرحمان " ہونے کے ناتے حالات کی تصویر کشی کی ہے ـــــ لیکن مجھے ان جذبات کا تفصیلی تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ یہ باتیں کچھ نظم ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہے ـــــ شعر و سخن کا میدان بلندئ تخیل ہے۔ اور نثر کا میدان اس سے بالکل مختلف ہے۔

بعض سیرت نگار حضرات نے ایک ایک شہید کے سلسلے میں حضرت عباسؑ کی گفتگو اور ان کے جذبات کا بھی تذکرہ کیا ہے ـــــ لیکن میری نظر میں ان تفاصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عباسؑ کا امام حسینؑ کی طرف سے علمدار لشکر ہونا خود ہی ان سارے خدمات کی واحد دلیل ہے۔ عباسؑ امام حسینؑ کے نمائندے ہیں اور ایسا انسان کسی لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہو سکتا۔

منصب تو امامت کا بھائی کو ملا لیکن
عباسؑ کے ہاتھوں میں پرچم ہے امامت کا

(زوار کراروی)

تاریخ بیان کرے یا نہ کرے۔ مقاتل میں ذکر ہو یا نہ ہو۔ ذمہ داری کا اقتضا یہ ہے کہ عباسؑ ہر مجاہد کے ساتھ رہیں۔ ہر ایک کو رخصت کریں اور ضرورت پڑ جائے تو میدان میں اس کی کمک کے لئے جائیں ــــــ گھوڑے سے گرے تو سہارا دیں اور امام حسینؑ میدان میں جائیں تو ان کے ہمراہ رہیں۔ جس کے جستہ جستہ شواہد تاریخ میں اس انداز سے دستیاب ہو سکتے ہیں:-

۱۔ امام حسینؑ کی تقریر پر خیمہ میں کہرام برپا ہوا تو حضرت عباسؑ مخدرات کو سمجھانے کے لئے گئے۔

۲۔ حرؑ آئے تو جناب عباسؑ استقبال کے لئے گئے۔

۳۔ وہب کی رخصت کا وقت آیا تو امام حسینؑ کے ساتھ حضرت عباسؑ کے دل کا اضطراب بھی بڑھ گیا۔

۴۔ عمرو بن خالد صیداوی نے مدد کے لئے بلایا تو حضرت عباسؑ میدان میں کمک کے لئے گئے۔

۵۔ دشمنوں نے خیام میں آگ لگانے کا منصوبہ بنایا تو حضرت عباسؑ نے حملہ کر کے اسے ناکام بنا دیا۔

۶۔ عونؑ و محمدؑ کی جنگ کا وقت آیا تو حضرت عباسؑ حوصلہ بڑھانے کے لئے سامنے

کے لئے سامنے آگئے۔

جناب ام کلثومؑ پریشان ہوئیں تو عباسؑ فدیہ بن گئے۔

سکینہ نے پانی کی شکایت کی تو عباسؑ نے اپنے خدمات پیش کر دیئے۔

خندق کھودنے کا سوال آیا تو عباسؑ آگے آگے رہے۔

بریر ہمدانی کو گھیر لیا گیا تو عباسؑ نے مدد پہنچائی۔

اس کے علاوہ بے شمار شواہد ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عباسؑ روز اول ہی سے اپنے خدمات میں مصروف تھے اور کسی آن اہل بیت و اصحاب کی طرف سے غافل نہ تھے ــــــ سرداری لشکر اور علمبرداری کے بعد تو یہ ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔

اب عباسؑ کے خدمات میں کون انسان شک کر سکتا ہے اور کسے یہ اندازہ نہیں ہے کہ ایسا ذمہ دار انسان اپنے فرائض کو کس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کریگا۔

بعض مولفین نے حضرت عباسؑ کے خدمات میں کنواں کھودنے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ گویا یہ سلسلہ روز عاشور تک جاری رہا اور کنوئیں برابر کھودے جاتے رہے۔

بلکہ بعض حضرات نے تو اور بھی ترقی کی ہے اور پانی کے برآمد ہو جانے کے بعد جناب سکینہ کے کوزہ لیکر آنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ پانی کام نہیں آسکا اور جناب سکینہ طناب خیمہ میں الجھ کر گر پڑیں۔

لیکن یہ سب باتیں بعید از قیاس اور خلاف عقل و منطق ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان بیانات کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور منطقی اعتبار سے یہ ناممکن ہے کہ فوج محاذ جنگ پر لڑ رہی ہو۔ گھمسان کا رن پڑ رہا ہو۔ چھوٹی سی سپاہ ہزاروں کے لشکر سے صف آرا ہو اور سردار لشکر خیمہ کے اندر کنواں کھودنے میں مصروف ہو۔

کا فیصلہ لڑائی سے پہلے ہی ہو جاتا۔ لیکن پیکر اخلاص و وفا اور مجسمۂ عرفان عباسؑ مرضی امامؑ پر نظر جمائے رہے اور ہر قدم پر خون کے گھونٹ پیتے رہے۔

عباسؑ کی جرأت و ہمت کو ظاہر ہونے کا موقع تو نہیں ملا۔ لیکن ان کی جلالت و عظمت مہر نیمروز کی طرح روشن ہو گئی۔ اب دنیا باقاعدہ طور پر یہ اندازہ کر سکتی ہے کہ جرأت و ہمت کے مظاہرے اور ہوتے ہیں اور صبر و شجاعت کے مظاہرے اور۔

جذبۂ عقل پر غالب آجائے تو جرأت و ہمت ہے اور جذبات و احساسات عقل کے سانچے میں ڈھل جائیں تو شجاعت و عرفان۔

گرمی بازار شہادت

عاشور کا دن وہ قیامت خیز تھا۔ جب پوری کائنات اخلاص و وفا نے قربانگاہ عبودیت پر بھینٹ چڑھانے کی قسم کھائی تھی اور ہر مجاہد کی بس ایک ہی تمنا تھی کہ پہلے ہم راہ خدا میں کام آجائیں۔

خواتین و مخدرات بھی بے چین تھیں کہ پہلے ہماری گود کا پالا شہید ہو —— پہلے ہماری کوکھ اجڑے —— پہلے ہمارا سہاگ لٹے۔ اور پہلے ہمارا باغ تمنا نذر خزاں ہو۔

خانوادۂ ہاشم کے جوان تڑپ رہے تھے کہ اصحاب و انصار سے پہلے ہماری جانیں کام آجائیں۔ اور غیروں سے پہلے گھر والے قربان ہوں۔

شہادت کی یہ گرم بازاری اس وقت ہوئی جب ابن سعد نے خیام حسینی کی طرف پہلا تیر رہا کیا اور اس کے زیر اثر چار ہزار تیر اندازوں نے تیروں کی بوچھار شروع کر دی

امام حسینؑ نے بھی اپنے جانبازوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اور مجاہدات کا آغاز ہو گیا۔

حالات اس قدر ہنگامی تھے کہ یہ فیصلہ بھی دشوار ہو گیا تھا کہ کون مجاہد کب میدان میں گیا۔ کب جہاد کیا اور کب کام آگیا۔

اتنا ضرور تھا کہ فوجِ دشمن کے سو سپاہی بھی کٹ جاتے تو کوئی پتہ نہیں چلتا تھا اور مجاہدینِ اسلام میں ایک بھی کام آجاتا تو لشکر میں نمایاں کمی ہو جاتی تھی۔

اصحاب کے درجۂ شہادت پر فائز ہونے کے بعد گھر والوں کی باری آئی اولادِ عقیل کے ایک ایک مجاہد نے جان کی بازی لگائی اور "بروایتے" فرزندِ ارجمند امام حسینؑ "علیؑ اکبر" نے میدان کا رخ کیا اور ہاشمی وقار کو سربلند کیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد جناب عباسؑ نے یہ فیصلہ کیا کہ اب میرے گھر کی قربانیوں کو پیش ہونا چاہیئے ——— مسئلہ صرف یہ تھا کہ پہلے اپنی قربانی پیش کریں یا اپنے بھائیوں کو راہ خدا میں قربان کریں؟

جذباتی فیصلہ تو یہی تھا کہ جذبۂ وفا کے اظہار کے لئے پہلے اپنی جان نذر کریں لیکن عباسؑ کسی جذباتی شخصیت کا نام نہیں ہے۔ عباسؑ ایک ذمہ دار لشکر کا نام ہے آپ کے پیش نظر فوجی ذمہ داریاں بھی ہیں اور آلِ ابوطالب کی عظمت و برتری بھی۔ جذبۂ وفاداری بھی ہے اور قربانی کی معرفت بھی۔

آپ نے طے کیا کہ بھائیوں کی قربانی کے مقدم کرنے میں دوہرے مصالح ہیں۔ ایک طرف ان کی عاقبت کا اہتمام اور ان کی جنت کا انتظام پہلے ہو جائے گا۔ اور دوسری طرف مجھے ان کے غم میں صبر کرکے مزید اجر و ثواب کا استحقاق ہو جائے گا۔ ایک مجاہد اور سپاہی کے لئے گلا کٹا دینا کوئی کام نہیں ہے ——— حقیقی بھائیوں کی لاشیں اٹھا کر صبر کرنا بہت بڑا کام ہے اور فضیلت کے اعتبار سے کام جس قدر دشوار ہو گا اتنا ہی افضل و برتر ہو گا۔

حضرت عباسؑ کو یہ اختیار تھا کہ پہلے اپنی قربانی پیش کرکے صرف اجرِ شہادت حاصل کریں ——— یا بھائیوں کی شہادت کو مقدم کرکے صبر و ضبط کا بھی اجر لیں اور شہادت کا بھی۔

ایک "بزرگ خاندان" ہونے کی حیثیت سے یہ سوال بھائیوں کے بارے میں نہیں اٹھایا جا سکتا۔

یہ ذمہ داری حضرت عباسؑ کے سر تھی۔ ان کے بھائیوں کے سر نہیں تھی ——— جس طرح اصحاب و انصار کی قربانی کا سوال امام حسینؑ سے متعلق ہو سکتا ہے امام حسینؑ کی قربانی کا سوال اصحاب و انصار سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔

مورخین و مؤلفین نے اس مقام پر "حسنِ تعلیل" کے دریا بہائے ہیں۔

طبری کا خیال ہے کہ یہ تقدیم میراث حاصل کرنے کے لئے تھی۔ حضرت عباسؑ کے دوسرے بھائی لاولد تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ پہلے وہ قربان ہو جائیں تاکہ انکی میراث بھی مل جائے۔

ابوالفرج نے یہی تعلیل جعفر کی شہادت کے ذیل میں درج ہے۔

علامہ برغانی کا خیال ہے کہ یہ تقدیم اس لئے کی گئی تھی کہ کہیں میرے بعد شیطان انھیں گمراہ نہ کردے اور یہ شرفِ شہادت سے محروم ہو جائیں اس طرح آلِ ابوطالب کی بدنامی ہو گی اور حضرت عباسؑ کے خاندان پر حرف آجائے گا۔

میرے خیال میں یہ تمام توجیہات دور از کار اور بعید از قیاس ہیں۔

طبری اور ابوالفرج کا خیال تو انتہائی مہمل ہے۔ اسکی مساعدت نہ اسلامی قانون کر سکتا ہے اور نہ ہاشمی اخلاص و کردار۔

اسلامی قانون کے اعتبار سے میراث کا نظام طبقاتی ہے اور ہر بڑے طبقہ کے ہوتے ہوئے چھوٹے طبقہ کو کوئی حصہ میراث نہیں ملتا۔

طبقات کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے طبقہ میں والدین اور اولاد ہیں۔ دوسرے طبقہ میں برادران اور اجداد ـــــ اور تیسرے طبقہ میں اعمام و اخوال چچا پھوپھی ماموں خالہ وغیرہ۔

پہلے طبقہ کے ہوتے ہوئے دوسرا طبقہ وارث نہیں ہوتا اور دوسرے طبقہ کے ہوتے ہوئے تیسرا طبقہ وارث نہیں ہو سکتا۔

حضرت عباسؑ اور ان کے برادران کی قرابت قریبہ میں کوئی شبہ نہیں ہے ـــــ یہ حضرات باپ اور ماں دونوں کی طرف سے اخوت کا مرتبہ رکھتے تھے لیکن تاریخ کی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جناب ام البنین واقعہ کربلا کے بعد بقید حیات رہیں۔

قافلہ الحرم کی واپسی پر ان کے تاثرات ـــــ بقیع میں ان کا گریہ و شیون اور اس پر مروان جیسے سنگ دل کا متاثر ہونا چند تاریخی حقائق ہیں جو بیانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ جناب ام البنین واقعۂ کربلا کے بعد بھی زندہ رہیں۔ اور ایسی حالت میں ان کے ہوتے ہوئے بھائی کے وارث ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت عباسؑ کا کمال تفقہ ـــــ اور ان کا ماحول زندگی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے بارے میں کسی بھی مسئلہ شرع سے ناواقفیت و بے خبری کا تصور کیا جائے۔ چہ جائیکہ ایسا واضح مسئلہ جسے اسلامی قانون کا ادنیٰ طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے۔

طبری و ابوالفرج کی یہ داستان "حسن تعلیل" حضرت عباسؑ کے جذبۂ وفا کی سراسر توہین اور ان کے علمی وقار پر کھلا ہوا حملہ ہے جسے کوئی بھی بابصیرت اور غیرت دار انسان برداشت نہیں کر سکتا۔

اخلاقی اعتبار سے بھی یہ بیان انتہائی رکیک اور ذلیل ہے کہ ـــــ میدان جنگ گرم ہے، قربانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ آل ابوطالب کی باری آچکی ہے اصحاب و انصار داد شجاعت دے کر موت کی میٹھی نیند سو چکے ہیں۔ امام حسینؑ کی بے کسی و تنہائی کے لمحات قریب آ گئے ہیں۔ اور ایسے وقت میں بھائیوں کو قربان کرتے ہوئے کوئی شخص یہ کہے کہ تمہارے مر جانے سے مجھے مال میراث مل جائیگا یہ تصور ایک بدترین انسان کے بارے میں بھی نہیں کیا جا سکتا ـــــ چہ جائیکہ حضرت عباسؑ پیکر وفا، مجسمہ اخلاص (العیاذ باللہ) عباسؑ کے بارے میں یہ سوچنا وفا و اخلاص کی دنیا میں کفر سے کم نہیں ہے۔

ایک وفادار مجاہد کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے بارے میں ایسے تصورات قائم کئے جائیں یا انھیں نوک قلم سے ظاہر کیا جائے۔ دنیا کا معمولی سے معمولی انسان اور بد سے بدتر مفاد پرست انسان بھی ہوتا تو ایسے مواقع پر یہ الفاظ زبان پہ جاری نہ کرتا اور ایسے خیالات کو دل ہی میں رکھتا۔

حضرت عباسؑ بن علی کی منزل تو بہت بلند ہے ان کے بارے میں تو ایسا تصور بھی نہیں قائم کیا جا سکتا۔

اس داستان بے بنیاد کے مہمل و خرافات ہونے پر دو سماجی دلیلیں بھی ہیں۔

اگر حضرت عباسؑ کو یہ یقین ہوتا کہ مجھے کربلا میں شہید نہیں ہونا ہے اور سب کی شہادت کے بعد مکہ یا مدینہ واپس جانا ہے تو ان کے بارے میں اس توہم کا ایک احتمال بھی تھا کہ اس طرح ان کے پاس معاشیات کا ایک سہارا ہو جائے گا۔ اور بھائیوں کا مال وراثت کچھ دنوں کام آئے گا

لیکن تاریخ و مذہب کے مسلمات میں ہے کہ مجاہدین کربلا بالخصوص حضرت

عباسؑ کو اپنی شہادت کا قطعی یقین تھا۔

جس کا واضح اشارہ خود لفظ "تقدم" میں پوشیدہ ہے جو بھائیوں کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے۔ "پہلے تم اس کے بعد ہم"۔

ایسے حالات میں کسی میراث و ترکہ کا تصور کرنا مؤرخ کی جہالت و نادانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

یہ تصور اس کے بارے میں ضرور زیب دیتا ہے جس کے پاس کثیر دولت اور عظیم سرمایہ ہو۔ تاکہ ورثہ کے بارے میں سوچ سکے۔ کہ اس کے مرنے کے بعد یہ مال ہمیں مل جائے گا۔

حضرت عباسؑ کے برادران تو بظاہر کسی دولت و ثروت کے مالک بھی نہیں تھے ——— اور اگر کچھ رہا بھی ہو گا تو اس کے کربلا میں ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے ——— اور پھر ہنگام عاشور تک باقی رہ جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایسے حالات میں میراث کا تصور کرنا شریعت و اخلاق کے علاوہ گرد و پیش کے حالات سے بھی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جس کا احتمال کسی بھی مرد مسلم کے بارے میں نہیں دیا جا سکتا چہ جائیکہ حضرت عباسؑ۔

اس مسئلہ میں ذاتی وضاحت کے باوجود قدرے تفصیل سے کام لیا گیا ہے تاکہ تاریخ پر ایمان لانے والے حضرات مورخین کے علم و عرفان اور ان کی دیانت و امانت کا باقاعدہ اندازہ کر سکیں اور یہ معلوم ہو سکے کہ مورخ نے آل محمدؐ کی اہانت و تذلیل کے لئے کوئی گوشہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔

طبری اور ابو الفرج کی طرح علامہ برغانی وغیرہ کا احتمال بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ حضرت عباسؑ کو اپنے بھائیوں کے بہک جانے کا اندیشہ تھا۔

اس لئے آپ نے چاہا کہ پہلے یہ لوگ شہید ہو جائیں ——— اس کے بعد خود میدان جہاد کا رخ کریں۔

اس لئے کہ اس قسم کے خیالات شہدائے کربلا کے بارے میں انتہائی عجیب و غریب ہیں۔ جن مجاہدین نے مدینہ سے مکہ ——— اور مکہ سے کربلا تک کے صعوبات سفر برداشت کئے ہوں۔

کربلا وارد ہونے کے بعد سے مسلسل مصائب کا سامنا کیا ہو ——— تین دن سے بھوکے اور پیاسے ہوں ——— نہم محرم سے زغہ اعداء میں گھرے ہوئے ہوں ——— صبح سے مسلسل شہادت کا منظر دیکھ رہے ہوں ——— اور شب عاشور مکمل اختیار کے باوجود امام حسینؑ کو چھوڑ کر نہ گئے ہوں۔

ان کے بارے میں یہ احتمال دینا کہ حضرت عباسؑ کی شہادت کے فوراً بعد وسوسہ شیطانی کا شکار ہو جائیں گے۔

ان کا سارا اخلاص حضرت عباسؑ کی نگاہوں کے سامنے کا نتیجہ ہے ——— یا بھائی کے شہید ہو جانے کے بعد امام حسینؑ کی غربت و بے کسی کا بھی خیال نہ کریں گے ——— ایک ایسا تصور ہے جس سے کوئی ذی ہوش انسان اتفاق نہیں کر سکتا۔

تاریخ میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں مورخین نے اپنے "حسن تعلیل" کا مظاہرہ کرنا چاہا ہے اور عدم معرفت کے نتیجہ میں عظیم غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔

حقیقت صرف یہ ہے کہ کربلا میں شہادت کی بنیاد "پہلے تم اس کے بعد ہم" پر تھی۔

وہاں زندگی کا کوئی امکان نہ تھا اور حیات کی تمام راہیں بند ہو گئی تھیں شہیدوں کے سامنے صرف ایک مسئلہ تھا کہ پہلے کون۔

اور پھر باقی رہ جانے والوں کے لئے کسی بھی سکون و اطمینان کا امکان نہ تھا۔

حالات صاف صاف اعلان کر رہے تھے کہ جو جس قدر زندہ رہے گا اسی قدر مصائب و آلام کا شکار ہوگا۔

شہادت میں مصائب دنیا سے نجات اور اجر آخرت کا احتمال تھا اور زندگی میں مصائب و آلام کا سوال۔

مفاد پرستی اور خود غرضی کا تقاضہ یہ تھا کہ پہلے اپنی قربانی دی جائے تاکہ مصائب کم پڑیں۔ اور اجر آخرت بھی جلد ہی مل جائے ——— اور ایثار و اخلاص کا مطالبہ تھا کہ دوسروں کو مقدم کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مصائب کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اور منزل اجر میں ایثار کا ثواب بھی حاصل کیا جا سکے

صبح سے یہ اہتمام امام حسینؑ کر رہے تھے کہ اصحاب و انصار کی قربانی کو گھر والوں پر مقدم کر رہے تھے اور اب یہ اہتمام جناب عباسؑ کر رہے ہیں کہ اپنے بھائیوں کو مقدم کر کے جذبۂ ایثار کا اظہار کر رہے ہیں۔

آپ کے الفاظ اس جذبۂ ایثار کے مکمل آئینہ دار ہیں۔

"تَقَدَّمُوا بِنَفْسِي اَنْتُمْ وَحَامُوا عَنْ سَيِّدِكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوا دُوْنَهٗ" ——— (الاخبار الطوال)

"تَقَدَّمُوْا حَتّٰى اَرَاكُمْ قَدْ نَصَحْتُمْ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ"

"تَقَدَّمْ اَخِيْ حَتّٰى اَرَاكَ قَتِيْلًا، وَاَحْتَسِبَكَ فَاِنَّهٗ لَا وَلَدَ لَكَ۔

"میرے شیرو! بڑھو تم پر میری جان قربان ——— اپنے مولا ——— کی حمایت کرو اور جان دیدو۔"

بڑھو بڑھو! تاکہ میں اپنی آنکھوں سے خدا اور رسولؐ کے بارے میں تمہارا اخلاص دیکھ لوں۔

"بھیا بڑھو! تاکہ میں تمہیں خون میں آغشتہ دیکھ کر صبر کر سکوں تمہارے کوئی اولاد نہیں ہے۔ تمہارا غم مجھی کو اٹھانا ہے۔

طبری اور ابو الفرج کے اشتباہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ روایت میں حضرت جعفر کے لاولد ہونے کا ذکر ہے۔

ان لوگوں نے خیال کیا کہ یہ تذکرہ میراث کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ طبری نے لفظ کو بدلا اور "اَرَاکُمْ" کے بجائے "اَرِثُکُمْ" نقل کیا ——— اور ابو الفرج نے باقاعدہ تفصیل دی کہ حضرت عباسؑ کا مقصد جعفرؑ کی میراث کا جمع کرنا تھا۔

علماء محققین نے دونوں مورخین کی بالکل صحیح گرفت کی ہے اور ان غلطیوں کو بروقت طشت از بام کیا ہے۔

اس طرح مورخین کے اخلاص کا بھی اندازہ ہو گیا اور انکی علمی خیانتیں بھی منظر عام پر آگئیں۔

آقائے بزرگ طہرانی طاب ثراہ کا خیال بالکل قرین قیاس ہے کہ روایت میں لفظ "اَرثیکم" رہا ہوگا جسے طبری نے "اَرِثکم" نقل کر دیا۔ وہاں مرثیہ پڑھنے کا تذکرہ تھا اور یہاں میراث کی فکر لگ گئی۔

یہ اور بات ہے کہ طبری کے بارے میں اتنی خوش فہمی بھی اس کے منصوبوں کی کامیابی کی دلیل ہے ورنہ یہ مورخ اعظم تو ابن سبا جیسی داستانیں بھی تیار کر سکتا ہے لفظوں کی تبدیلی کا کیا ذکر ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں اس نکتہ کی مکمل وضاحت کی جا چکی ہے۔

قربان گاہِ وفا

حضرت عباسؑ علمدار نے وفا کی قربان گاہ پر جو فدیے پیش کئے ہیں۔ ان میں ان کے تین بھائی بھی ہیں اور دو بیٹے بھی۔

تقاضائے ایثار کی بناء پر آپ نے پہلے بھائیوں کو شرف شہادت سے مشرف کیا۔ اس کے بعد بیٹوں کو میدانِ شہادت میں بھیجا۔

تاریخ و مقتل کے بیان کے مطابق آپ کے تین بھائی تھے۔ عبداللہ۔ عثمان۔ جعفر۔

عبداللہ کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ عثمان کی عمر ۲۵ سال اور جعفر کی عمر ۲۱ سال۔ جعفر حضرت امیر کی اولاد میں سب سے کمسن تھے۔ اس لئے کہ آپ کی شہادت ۴۰ھ میں واقع ہوئی تھی اور واقعۂ کربلا سنہ ۶۱ھ میں ٹھیک ۲۰ سال کے بعد ہوا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مولائے کائنات کی شہادت کے موقع پر جعفر کی عمر صرف چند ماہ کی رہی ہوگی۔

آخری فرزند ہونے کے اعتبار سے آپ کو اس فرزند سے بے حد پیار تھا

اور اسی لئے آپ نے ان کا نام اپنے مرحوم بھائی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے جعفر رکھ دیا تھا۔

نام مولائے کائنات نے رکھا تھا ـــــــ اور انجام مقدر نے معین کر دیا کہ جس طرح جعفر طیار راہ خدا میں شہید ہوئے اسی طرح جعفر بن علی بھی راہ خدا میں کام آگئے۔

حضرت عباسؑ نے حفظِ مراتب کے لحاظ سے سب سے پہلے عبداللہ کو میدان کی طرف روانہ کیا۔

آپ میدان میں آئے اور فوج دشمن کو للکار کر یہ رجز پڑھا۔

" انا ابن ذی النجدۃ والافعال
ذاک علی الخیر فی الفعال
سیف رسول اللہ ذو النکال
فی کل قوم ظاہر الافعال

ترجمہ:۔ میں اس صاحب شرف و کرامت "علیؑ" کا بیٹا ہوں جو رسول اکرمؐ کی شمشیر براں اور کائنات کا شہرۂ آفاق مجاہد تھا۔"

رجز پڑھنے کے بعد اس زور کا حملہ کیا کہ پورے میدان میں آپ ہی آپ نظر آرہے تھے۔

ارباب مقاتل کا بیان ہے کہ آپ کے حملے چکی کی گردش کی طرح پورے صفحۂ کارزار کو گھیرے ہوئے تھے۔

دشمن کے یہ حالات دیکھ کر حواس اڑ گئے اور اس نے چاروں طرف سے آپکو گھیر لیا اور آخر میں ہانی بن ثبیت حضرمی نے سر اقدس پر ایک شدید ضرب لگائی جس کے نتیجہ میں آپ شہید ہو گئے۔

اس موقع پر بے ساختہ حضرت مسلم کا جہاد یاد آجاتا ہے ـــــــ جہاں پانچ سو کی فوج کا محاصرہ تھا اور عقیل کا فرزند تنِ تنہا پوری فوج سے مقابلہ کر رہا تھا۔ سردارِ لشکر کے ہوش اڑے ہوئے تھے اور غربت الوطن مسافر کے سکونِ نفس میں ذرہ برابر فرق نہیں پیدا ہوا تھا۔

تاریخ کی نگاہوں نے ایک مرتبہ کوفہ میں ۲۸ سال کے مسلم کا جہاد دیکھا تھا اور ایک مرتبہ کربلا میں ۲۸ سال کے عبد اللہ بن علی کا جہاد دیکھا

عبد اللہ کا اندازِ جہاد جناب مسلم کے مجاہدات کو یاد دلا رہا تھا اور مسلم کا طریقۂ جہاد عبد اللہ کے مجاہدات کا سنگِ بنیاد بنا ہوا تھا۔

تین دن کی بھوک اور پیاس مزید تھی لیکن عبد اللہ حضرت عباسؑ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کا جہاد اس امر کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اب اگر عباسؑ میدان میں آگئے تو کیا ہو گا۔

" دل لرزتا ہے کہ تیرا نام کبھی مختصر میں ہے "

حضرت عبد اللہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان بن علی میدان میں آئے۔ آپ کے رجز کے یہ الفاظ تھے۔

" انی انا العثمان ذو المفاخر
شیخی علیؑ ذو الفعال الطاھر
وابن عم للرسول الطاھر
اخی حسینؑ خیرۃ الاخائر
وسید الکبار و الاصاغر
بعد الرسول والولی الناصر

ترجمہ :۔ میں صاحبِ مفاخر عثمان بن علی ہوں۔ میرے بابا کے

کے کارنامے واضح و روشن ہیں ـــــــ وہ رسولِ طیب و طاہر کے ابن عم تھے ـــــــ میرا بھائی منتخب روزگار ـــــــ اور سردار صغار و کبار ہے۔ اس کا مرتبہ رسولِ مختار اور ولی کردگار کے بعد سب سے بلند تر و بالاتر ہے۔

رجز پڑھنے کے بعد فوجوں کے درمیان در آئے اور جہاد میں معروف ہو گئے ـــــــ ناگاہ خولی بن یزید اصبحی نے ایک تیر مارا اور آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے ـــــــ تیورا کے خاک پر آئے ـــــــ ابان بن دارم کے خاندان کے ایک شخص کو موقع مل گیا اور اس نے بڑھ کر آپ کا سرِ اقدس قلم کر لیا۔

(ناسخ، بحار)

حضرت عثمان کے بعد جعفر بن علی کی باری آئی۔ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے اصغر لیکن جعفر طیار کے ہمنام و ہمسر تھے۔

میدانِ جنگ کا رخ کرتے ہی فوجِ دشمن پر شدید حملہ کر دیا۔ اور زبان مبارک پر رجز کے یہ الفاظ تھے۔

" انی انا الجعفر ذو المعالی
ابن علی خیرۃ النوالی
حسبی بعمی شرفا وخالی
احمی حسینا ذا الندی المفضال

ترجمہ :۔ میں صاحبِ مراتب جعفر ہوں ـــــــ جواد کریم باپ علیؑ کا فرزند ـــــــ میرے شرف کے لئے میرے چچا اور ماموں ہی کافی ہیں۔

میں صاحبِ کرم و فضل حسینؑ کی طرف سے دفاع کر رہا ہوں۔

جہاد کرتے کرتے فوجوں میں گھر گئے۔ اور انی ابن شبیث حضرمی نے موقع پاکر ایک وار کرکے آپکی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

بھائیوں کی شہادت کے بعد بظاہر حضرت عباسؑ کے حوصلے پست ہو جانا چاہیئے تھے۔ اور آپ کی ہمت شکستہ ہو جانا چاہیئے تھی۔

لیکن تاریخ کربلا گواہ ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور جیسے جیسے مجاہدین میدان میں کام آتے گئے سردار لشکر کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے بھائی راہ خدا میں کام آگئے ——— مادر گرامی کی تمنا پوری ہو گئی ——— اور میرے بھائیوں نے اپنے مولا کے قدموں پر جان قربان کر دی۔

انھیں حوصلوں کا نتیجہ تھا کہ بھائیوں کی لاش اٹھانے کے بعد فرزندوں کو تیار کر دیا ——— اور سب سے پہلے فضل کو گلے سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دے کر مولا کے پاس بھیج دیا۔

بیٹا جاؤ چچا سے اجازت لے کر راہ خدا میں قربان ہو جاؤ۔ فضل نے اجازت چاہی ——— اور مولا نے حالات کے پیش نظر دل پر جبر کرکے اجازت دے دی۔

فضل نے میدان جنگ میں قدم رکھا اور اس شان سے رجز خوانی شروع کر دی۔

"اقسمت لو کنتم لنا اعدادا
ومثلکم وکنتم فرادیٰ
یا شرّ جیلٍ سکنوا البلادا
وشرّ قوم اظهروا الفسادا

سنترک جهعکم شرادا
ونرمی الرؤس عن الاجساد

" میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ تم کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو جاؤ۔ میرے اوپر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تم باشندگان دنیا میں بدترین نسل ہو ——— اور مفسدین عالم میں بدترین قوم ہو عنقریب میں تم کو متفرق کر دوں گا۔ اور تمہارے سروں کو جسموں سے جدا کرکے پھینک دوں گا۔

رجز پڑھ کر دشمن پر حملہ آور ہوئے ——— اور تھوڑی ہی دیر میں بکثرت دشمنوں کو تہہ تیغ کر دیا۔

فوج دشمن کے ایک سردار نے یہ منظر دیکھا تو تڑپ کر میدان میں آیا ——— اور پکار کر کہا کہ یہ جوان بڑا بہادر معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کام میں تمام کر دوں گا۔ تین دن کے بھوکے پیاسے مجاہد پر ایسے زبردست پہلوان کا حملہ ——— کوئی معمولی بات نہ تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فضل نے لاکھ سنبھلنا چاہا لیکن ظالم نے ایسی تلوار لگائی کہ بچہ گھوڑے سے گر کر خون میں لوٹنے لگا ——— امام حسینؑ کو آواز دی۔ چچا غلام کی خبر لیجئے۔ امام حسینؑ نے یہ عالم دیکھا تو زار و قطار رونے لگے اور بھتیجے کی لاش کو میدان سے لاکر گنج شہیداں میں لٹا دیا۔

بھائی کا یہ حال دیکھ کر قاسم بن عباسؑ کو جلال آگیا .... جوش شجاعت میں میدان میں آگئے اور آواز دی۔ دشمنو! ہوشیار ہو جاؤ ——— اب رسول اکرمؐ کا غلام اور اسلام کا مجاہد آرہا ہے ——— یہ کہہ کر حملہ کیا اور اسی دشمنوں کو فی النار کر دیا۔ پلٹ کر امام حسینؑ کی خدمت میں آئے اور شدت

عطش کا تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا بیٹا جاؤ عنقریب تمہارے جد بزرگوار تمہیں سیراب کر دیں گے۔

قاسم پلٹ کر میدان میں آئے اور جہاد شروع کر دیا۔ ۲۰ سواروں کو تہہ تیغ کیا اور بالآخر شہید ہو گئے۔ امام حسینؑ نے اپنے عزیز فرزند کو گنج شہیداں میں لاکر لٹا دیا

نور العین ص۱۹۱ ماتین ص۲۷۷

فوجوں کے بادل اور ہاشم کا چاند

بھائیوں اور فرزندوں کی شہادت کے بعد جناب عباسؑ کے لئے آخری قربانی کا مرحلہ آگیا۔

ارباب مقاتل میں اس شہادت کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کا موقعہ محل کیا تھا۔ اور حضرت عباسؑ نے کس موقع پر اپنی قربانی پیش کی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت علیؑ اکبر پہلے شہید ہوئے اور آپ ہاشمی جوانوں میں آخری شہید ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ حضرت علی اکبرؑ سے پہلے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے تھے۔ اور اسی لئے امام حسینؑ نے خیمہ گاہ کا رخ کرکے بنی ہاشم کے بچوں کو

آواز دی تھی کہ علی اکبرؑ کی لاش اٹھانے میں مدد کریں۔

بہرحال علیؑ اکبر شہید ہو چکے تھے۔ تو بھی حضرت عباسؑ کے کلیجہ پر یہ عظیم داغ تھا۔ کہ میں زندہ ہوں اور جان برادر دنیا سے رخصت ہو گیا ہے اور اگر علیؑ اکبر موجود تھے تو بھی یہ ایک نازک مرحلہ تھا کہ چچا بھتیجے کو قربان ہونے دے۔ یا بھتیجا چچا کی شہادت کا منظر دیکھتا رہے۔

ایثار کے تقاضے معلوم ہیں۔ لیکن طرفین کی ہمت اور دونوں کا مخصوص جذباتی لگاؤ کوئی فیصلہ کرنے سے مانع ہے۔ مصالح امامت کیا تھا۔ اور قربانی راہ خدا کیا چاہتی ہے ــــــــ؟ اس کا اندازہ نہ کسی مورخ کو کر سکتا ہے اور نہ کسی مولف کو

حالات کی نوعیت سے کچھ فیصلہ کیا جا سکتا تھا لیکن وہ بھی انتہائی پیچ در پیچ ہیں۔

یہ بہرحال مسلم ہے کہ جب جناب عباسؑ نے میدان کا ارادہ کیا ہوگا تو جنگ کی پوری مشینری حرکت میں آگئی ہوگی۔ اور فوجوں نے از سر نو اپنے آپ کو آمادہ کر لیا ہوگا۔

فوج دشمن کے سامنے عباسؑ کے بارے میں چند اہم مسائل تھے۔

۱۔ یہی وہ مجاہد ہے جس نے ۱۰ سال کی عمر میں صفین کے میدان میں دشمنوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔
۲۔ اسی مجاہد کے کمسن شاگردوں نے بڑے بڑے پہلوانوں کو تہہ تیغ کر دیا ہے۔
۳۔ اسی کے ایک ایک بھائی اور ایک ایک فرزند نے سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔
۴۔ یہی عباسؑ فوج حسینی کا سردار و علمبردار ہے اور اسی سے فوج کا بھرم قائم ہے

۵۔ اس کے خاندانی سابقے شجاعت ہی شجاعت اور ہمت ہی ہمت کے ہیں۔

۶۔ یہ اپنی بات کا ایسا دھنی ہے کہ تین دن کی پیاس کے باوجود "امان نامہ" کو ٹھکرا دیتا ہے اور حاکم وقت پر لعنت بھی کرتا ہے۔

۷۔ اس سے حسینؑ کی کمر مضبوط اور ان کا بازو طاقتور ہے۔

۸۔ یہ حیدرؑ کرار کے بیشۂ شجاعت کا شیر اور بنی ربیعہ کی یادگار ہے۔

۹۔ اس نے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر معمولی سے حملے میں فرات کے پہرے کو توڑ دیا تھا اور دریا پر قبضہ کر لیا تھا۔

یہ تصورات اور خیالات فوج دشمن کو بوکھلا دینے کے لئے بہت کافی تھے۔

چنانچہ جیسے ہی دشمنوں کو یہ اندازہ ہوا کہ اب عباسؑ کے آنے کی باری ہے پوری فوج میں ہلچل مچ گئی۔

حالات و کیفیات سے آنکھ بند کر کے صرف کتابوں کے مذکورات پر اعتماد کرنے والے ایک ایک لفظ کے لئے حوالہ تلاش کرتے ہیں لیکن سیاسی بصیرت رکھنے والے اور جنگی حالات کا اندازہ کرنے والے یہ جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر فوج دشمن کا کیا عالم ہوگا۔

عجب نہیں ہے کہ ابن سعد نے پوری فوج میں اعلان کرا دیا ہو کہ خبردار۔ ہوشیار۔ —— حیدرؑ کرار کا شیر اور حسینؑ کا علمدار آ رہا ہے —— عباسؑ زندہ و سلامت میدان سے جانے نہ پائیں۔ یہ زندہ رہ گئے تو اپنی فوج کی زندگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دشمن کا دل دھڑک رہا ہے اور جنگ کی آخری تیاریاں ہو رہی ہیں —— اور ادھر ۳۴ سال کا بہادر شیر مولا کی خدمت میں سر جھکائے کھڑا ہے ——

"آقا اجازت ہے۔"

امام حسینؑ حالات کی نزاکت کا مکمل اندازہ کر کے عظمت عباسؑ پر ان حسین لفظوں میں تبصرہ فرما رہے ہیں —— "بھیا تم سردار لشکر ہو۔ سردار کے بعد لشکر کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔

عباسؑ نے موقع پا کر داہنے بائیں دیکھا۔ اور سر جھکا کر خاموشی سے عرض کیا۔

"مولا وہ لشکر کہاں ہے جس کا میں سردار ہوں۔"

امام حسینؑ کے دل پر چوٹ لگی۔ فرمایا۔ بھیا۔ لشکر تو تمام ہو گیا ہے۔ اب فقط سردار ہی باقی رہ گیا ہے لیکن اگر جانا ہی چاہتے ہو تو بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ ناسخ ۲۹۰ جلا العیون ص ۲۰۹

آپ نے یہ فرمان سنا اور فوراً در خیمہ کا رخ کیا —— آواز دی۔ بچو! مشکیزہ لاؤ۔ اب عباسؑ پانی کے لئے جا رہا ہے —— سکینہ دوڑ کر آئی —— عرض کی —— چچا جان، آپ پانی کے لئے جا رہے ہیں؟ اور یہ کہہ کر جلدی جلدی مشکیزہ لائی اور لا کر چچا کے حوالے کر دیا۔ عباسؑ مشکیزہ لے کر چلے۔

ایک مرتبہ امام حسینؑ نے آواز دی۔ بھیا۔ اہلحرم سے آخری مرتبہ رخصت ہو کر آؤ۔ عباسؑ خیمے میں گئے۔ بچوں کو الوداع کہا۔ مخدرات سے رخصت ہوئے اور مشک و علم لیکر میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔

دل پکار رہا ہے —— مالک! مولا کے سامنے عزت رکھ لینا —— پروردگار بچوں کی آس نہ ٹوٹنے پائے —— میرے پالنے والے —— ! وفا کی آبرو رکھ لینا۔

خیمہ سے نکل کر میدان میں قدم رکھا تھا کہ ایک مرتبہ فوجیں گھر کر آ گئیں —— چاروں طرف سے محاصرہ ہو گیا —— اب فوجوں کے بادل تھے اور ہاشم کا چاند

عباسؑ کے نفسِ مطمئن پر ان انتظامات کا کوئی اثر نہیں تھا۔ مشکیزہ علم سے باندھ لیا تھا تاکہ پوری فوج ارادے سے باخبر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ شیر کو ترائی کی طرف جانا ہے ـــــــ سقارِ بچوں کے لئے پانی لینے جا رہا ہے اب جسے روکنا ہے وہ راستہ روکے۔

دشمن نے عزمِ عباسؑ کو دیکھا ـــــــ اور ہاتھ میں صرف نیزہ دیکھا ـــــ اب کیا تھا۔ ایک طرف سے حملہ کے لئے تلواریں بڑھیں۔ دوسری طرف فرات کے پہرہ داروں کو ہوشیار کیا گیا۔

شیر کے سامنے بیک وقت دو مسائل پیدا ہو گئے۔ دشمنوں کو ہٹائے تو کس طرح اور دریا تک جائے تو کس طرح۔

یہ جرأت و ہمت کا کمال تھا کہ نیزہ سے فوجوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور ایک مرتبہ فوجوں سے خطاب کرکے فرمایا۔

"أَدَأَنْتُمْ كَفَرَةٌ أَمْ مُسْلِمُوْنَ. هَلْ يَجُوْزُ فِيْ دِيْنِكُمْ أَنْ تَمْنَعُوْا الْحُسَيْنَ وَأَطْفَالَهُ مِنْ شُرْبِ الْمَاءِ وَالْكِلَابُ وَالْخَنَازِيْرُ يَشْرَبُوْنَ مِنْهُ وَالْحُسَيْنُ وَأَطْفَالُهُ يَمُوْتُوْنَ عَطَشًا أَمَا تَذْكُرُوْنَ عَطَشَ الْقِيَامَةِ۔"

(انوار الشہادہ ص ۵۵)

ترجمہ:۔ "تم لوگ کافر ہو یا مسلمان ـــــ تمہارے دین میں یہ جائز ہے کہ کتے اور سور دریا کا پانی پیتے رہیں اور امام حسینؑ اور ان کے بچوں پر پانی بند کر دیا جائے۔ کیا تمہیں قیامت کی پیاس یاد نہیں ہے۔"

"یہ ساقیِ کوثر کا لال ہے۔ اس سے تمہاری عاقبت و آخرت وابستہ ہے۔ تمہیں اس کی آمد سے اختلاف ہے تو راستہ چھوڑ دو۔ یہ کسی دور دراز ملک روم یا ہند وغیرہ چلا جائے اور تمہارا عراق و حجاز خالی کر دے۔"

(مہیج الاحزان ص ۱۶۳)

دشمن نے اس تقریر پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور چاروں طرف سے حملے جاری رہے۔ آخر کار عباسؑ نے بھی ایک شیرانہ حملہ کیا اور دریا کی بلندی پر قبضہ کر لیا۔ ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر دشمن کو اپنے قبضہ سے خبردار کیا۔ اور فرات کے پہرہ داروں کو آواز دی کہ اب دوسرا قدم فرات میں ہو گا۔ جسے راستہ روکنا ہے آگے بڑھے۔

دشمن نے چاروں طرف سے گھیر ڈالا۔ اور چار ہزار فوجوں نے فرات کے محاصرہ کو مضبوط کر دیا۔ عباسؑ نے صورتِ حال کو دیکھ کر رجز شروع کیا۔

أُقَاتِلُ الْقَوْمَ بِقَلْبٍ مُهْتَدِ
أَذُبُّ عَنْ سِبْطِ النَّبِيِّ أَحْمَدِ
أَضْرِبُكُمْ بِالصَّارِمِ الْمُهَنَّدِ
حَتَّى تَحِيْدُوْا عَنْ قِتَالِ سَيِّدِيْ
إِنِّيْ أَنَا الْعَبَّاسُ ذُوْ التَّوَدُّدِ
نَجْلُ عَلِيِّ الْمُرْتَضٰى الْمُؤَيَّدِ

"میں ایک ہدایت یافتہ دل کے ساتھ اس قوم کے ساتھ جنگ کر رہا ہوں اور سبطِ پیغمبرؐ سے دفاع کر رہا ہوں۔ میں تمہیں اس وقت تک تہہ تیغ کرتا رہوں گا جب تک میرے آقا سے جنگ کرنے سے باز نہ آ جاؤ۔ میں صاحبِ مودت عباسؑ ہوں۔ میرا بابا علیؑ مرتضیٰ ہے جسکی تائید قدرت نے کی ہے۔"

رجز کے بعد صرف ایک مرحلہ رہ گیا تھا کہ گھوڑے کو ایڑ لگائیں اور فوجوں کے حصار کو توڑ کر فرات میں داخل ہو جائیں۔

لیکن ایک پیاسے کے لئے یہ کام آسان نہیں تھا بمثل مشہور ہے۔ "پانی دیکھ کر پیاس بھڑک اٹھتی ہے۔"

عباسؑ پیاسے تھے اور کیسے پیاسے۔ تین دن کے پیاسے۔ ایسے پیاسے جس کی پیاس کو زمین کی گرمی۔ آفتاب کی تمازت۔ زخموں کی کثرت۔ بچوں کی فریاد ــــ اسلحہ کی تپش۔ ہوا کی سوزش۔ آگ کی حرارت اور مجاہدوں کی شہادت نے دہ چند کر دیا تھا۔

ایسے پیاسے کو دریا نظر آجائے تو پیاس کا عالم کیا ہوگا؟ اس کی صحیح تصویر یہ ہے۔ سو

سقے کا جگر پھنکتا ہے ساحل کی ہوا سے
پانی میں جو اترے گا تو اٹھے گا دھواں اور

اتنی شدید دشواریوں کے باوجود عباسؑ نے ایک شیرانہ حملہ کیا اور فوجوں کو ڈھکیل کر فرات تک پہنچ گئے۔ دفعتہ ہلکی خنکی کا احساس ہوا تو جھک کر دیکھا کہ گھوڑا فرات میں کھڑا ہے۔ فوراً اتر پڑے اور مشکیزہ کو پانی میں ڈال دیا۔ کئی دن کا خشک مشکیزہ کافی دیر تک تر ہوتا رہا۔ اس کے بعد غازی نے اسے بھرا اور دوش پر رکھ کر دریا سے نکل آیا۔

ارباب مقاتل کا بیان ہے کہ اس دوران میں عباسؑ نے چلو میں پانی بھی لیا اور ایک مرتبہ امام حسینؑ اور ان کے بچوں کی پیاس کو یاد کر کے پھینک دیا۔ تاریخ اور مقتل کو اتنا ہی بیان کرنے کا حق ہے جتنا مشاہدہ میں آیا ہے۔ ارادوں کی تحدید کرنا ان کے حدود بیان سے باہر ہے۔

یہ بہر حال صحیح ہے کہ عباسؑ نے پانی لے کر پھینک دیا۔ لیکن یہ بات کہ پینے کا ارادہ کیا اور بچوں کی پیاس یاد آگئی اس لئے پھینک دیا ــــــــ کسی طرح قرین عقل نہیں ہے۔

عباسؑ جیسا وفادار انسان اور پینے کا ارادہ کرے؟ معاذ اللہ

بات صرف یہ تھی کہ عباسؑ نے چلو میں پانی لے کر ایک مرتبہ پھر فوج دشمن کو متوجہ کر دیا کہ تم نے اپنی بساط وحیثیت دیکھ لی۔ آج پھر فرات میرے قبضہ میں ہے۔ یزید اور اس کے لشکر کی کیا ہستی ہے۔ ہم نے یہ دریا اس کے باپ سے چھین لیا تھا۔

اب یہ اور بات ہے کہ ہم پانی پئیں گے نہیں۔ پانی پینا ہوتا تو تمہیں دریا سے بھگا چکے ہوتے۔

ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ تمہاری شقاوت کا سلسلہ کب تمام ہوتا ہے اور تم ہمارے لئے پانی کو کب مباح کرتے ہو۔ جب تک تم از خود پانی سے قبضہ نہیں ہٹاؤ گے ہم اپنی مظلومیت کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔ اور تمہارا ظلم یونہی بے نقاب ہوتا رہے گا۔ چلو سے پانی پھینک کر دریا سے باہر آئے تو زبان پر یہ فقرات جاری کئے۔

یَا نَفْسُ مِنْ بَعْدِ الْحُسَیْنِ هُوْنِی
فَبَعْدَهٗ لَاکُنْتِ اَنْ تَکُوْنِی
هٰذَا الْحُسَیْنُ شَارِبُ الْمَنُوْنِ
وَتَشْرَبِیْنَ الْبَارِدَ الْمَعِیْنِ
هَیْهَاتَ مَاهٰذَا فَعَالُ دِیْنِی
وَلَا فَعَالُ صَادِقِ الْیَقِیْنِ

"اے نفس حسینؑ کے بعد زندگی کا کیا لطف ۔ ایسی زندگی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ کہ حسینؑ موت کا جام پئیں اور تو ٹھنڈا پانی پئے ۔ یہ نہ دین کا طریقہ ہے اور نہ کسی صادق الیقین انسان کا طرزِ عمل ۔

خیمہ کا رخ کیا ۔ دوش پہ مشک سکینہ ۔ ہاتھ میں علم ۔ گھوڑے پر سوار ۔ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں ۔ دل میں صرف ایک جذبہ ہے کہ پانی خیام حسینی تک پہنچ جائے ۔ اور زیرِ لب ایک دعا ہے کہ مالک! عباسؑ کی حسرتوں پر پانی نہ پھرنے پائے ۔ اور میں بچوں کے سامنے سرخرو ہو جاؤں ۔

عباسؑ کا بڑھنا تھا کہ بھاگی ہوئی فوجیں پلٹ پڑیں ۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہو گیا ۔

دشمن کو ایک فکر تھی کہ پانی خیام حسینی تک نہ پہنچنے پائے ۔ اور عباسؑ کی صرف ایک تمنا تھی کہ پانی خیموں تک پہنچ جائے ۔

موقع کی نزاکت کو دیکھ کر تیر اندازی کو آگے بڑھا دیا گیا ۔ اور کمانیں دوش سے اتر آئیں ۔ ترکش سے تیر نکلنے لگے اور دشمن نے یہ منصوبہ بنا لیا کہ اس قدر تیر برسائے جائیں کہ مشک میں پانی نہ رہ جائے اس کے بعد عباسؑ خیمے کی طرف چلے بھی جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے ۔

عباسؑ نے للکار کر یہ رجز پڑھا ۔

لا ارهب الموت اذا الموت رقی
حتیٰ اواری فی المصالیت لقا
نفسی لنفس المصطفیٰ الطهر وقا
انی انا العباس اغدو بالسقا

ولا اخاف الشر یوم الملتقیٰ

"موت لاکھ سر پر آجائے، میں موت سے ڈرنے والا نہیں ۔ تہہ خاک دفن ہو جانا میرے لئے کوئی ہیبت ناک بات نہیں ہے ۔ میرا نفس امامؑ کے نفسِ اقدس کی سپر ہے ۔ میں عباسؑ ہوں عباسؑ ـــــــ سقائی میرا کام ہے اور میدانِ جنگ سے نہ ڈرنا میرا شعار ۔"

اور پھر ہر خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے ـــــــ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مشک سکینہ میں تا دیر پانی محفوظ رہا ـــــــ لیکن اس کی حفاظت میں عباسؑ پر کیا گزر گئی ۔ اس کا اندازہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے ۔

تیروں کا مینہ برستا رہا اور مجاہد میدان کی منزلیں طے کرتا رہا ۔ کون حساب کر سکتا ہے کہ اس درمیان میں عباسؑ کے جسم اقدس میں کتنے تیر پیوست ہو گئے اور غازی کا بدن کس قدر زخمی ہو گیا ۔

یہ ضرور ہے کہ ابھی تک عباسؑ کو اپنے زخموں کا احساس نہیں ہے ۔ اور دشمن "احساس شکست" سے تباہ ہو اجا رہا ہے ۔ شیر کے قدم بڑھتے جا رہے ہیں اور فوج دشمن کی آس ٹوٹتی جا رہی ہے ۔

آخر کار فوج دشمن نے یہ طے کیا کہ جب تک عباسؑ کے ہاتھ سلامت رہیں گے ان کا راستہ روکنا مشکل ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ان کے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ شیر کے سامنے آئے کون؟ اور حیدرؑ کرار کے لال کا مقابلہ کون کرے؟

مکر و فریب کی دنیا میں بڑی وسعت ہوتی ہے ـــــــ اس کے وسائل

بڑی حد تک غیر محدود ہوتے ہیں ۔ کوفہ کی آزمودہ کار فوج جانتی ہے کہ علیؑ کے شیروں سے مقابلہ کرنے کا صرف ایک راستہ ہے ـــــ اور وہ ہے مکر و فریب۔

کل مسلم کو گرفتار کرنے کے لئے یہی حیلہ اختیار کیا گیا تھا اور آج عباسؑ کے شانوں کو قلم کرنے کے لئے یہی بہانہ تلاش کیا جارہا ہے ۔ زید بن ورقا ایک کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھا اور جب شیرِ ذوالجلال کا شیر بڑھتا ہوا اس منزل پر پہنچا تو اس نے اچانک ایک وار کر دیا جس سے آپ کا داہنا ہاتھ قلم ہوگیا۔

یہ امر تصور و احساس سے تعلق رکھتا ہے کہ ایک زخم کا اثر کیا ہوتا ہے اور ایک سپاہی کے ہاتھ قلم ہوجانے پر اس کی نفسیاتی تاثرات کیا ہوں گے ۔ وہ اپنے کو کس قدر بے بس تصور کرے گا۔

لیکن یہ عباسؑ کا کلیجہ تھا کہ ہاتھ کٹنے کا درد اور خون بہنے کا منظر دیکھنے کے باوجود حوصلوں کا یہ عالم تھا کہ نہ ایک لمحہ کے لئے ٹھہرے اور نہ ایک پل کے لئے قدم پیچھے ہٹے ـــــ بڑھے اور بڑھتے ہی رہے۔ دل کے حوصلے زبان پر رجز بن کر آرہے تھے۔

والله ان قطعتم یمینی
انی احامی ابدا عن دینی
وعن امام صادق الیقین
نجل النبی الطاهر الامین
نبی صدق جاءنا بالدین
مصدقا بالواحد الامین

" خدا کی قسم اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قلم کر دیا ہے تو یاد رکھنا

کہ میں ہمیشہ اپنے دین کی حفاظت کرتا رہوں گا اور اپنے صادق الیقین امام سے دفاع کرتا رہوں گا۔ یہ اس نبی طاہر و امین کا فرزند ہے جو دین الٰہی لے کر آیا ہے اور جس نے خدائے واحد کی تصدیق کی ہے ۔"

(ناسخ ۶ ص ۲۹۱ نور العین ص ۵۸)

رجز کے ساتھ چند قدم اور بڑھے تھے کہ دشمن نے پھر دوسرا حیلہ تلاش کیا اور ایک کمین گاہ سے حکیم بن طفیل نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ آپ کا دوسرا شانہ بھی قلم ہوگیا۔ اور مجاہد بے دست و بازو ہوگیا۔

ذمہ داریوں کا ایک انبار ۔ مشک سکینہ ۔ علم اسلام ۔ نیزۂ جنگ لجام فرس ۔ اور اس پر بازوؤں کا قلم ہوجانا ایک انسان کے حواس اڑا دینے کے لئے بہت کافی تھا۔

لیکن یہ عباسؑ کا دل و جگر تھا کہ ایسے مصیبت کے وقت میں بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے اور اسی ہمت و عزم کا اعلان کرتے رہے۔

" یا نفس لا تخشی من الکفار
وابشری برحمة الجبار
مع النبی السید المختار
قد قطعوا ببغیهم یساری
فاصلهم یا رب حر النار

" اے نفس کفار سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرے لئے رحمت جبار اور جوار نبی مختار ہے ۔ ان لوگوں نے ظلم و ستم سے میرا بایاں ہاتھ بھی قلم کر دیا ہے پروردگار انھیں داخل جہنم کرے۔"

ابن سعد نے یہ منظر دیکھا تو کمال حیرت و استعجاب اور شدتِ وحشت و دہشت میں فوج کو آواز دی۔

" عباسؑ کو روکنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ مشک پر تیر برسائے جائیں جب تک مشک میں پانی رہے گا یہ بہر حال آگے بڑھتے رہیں گے۔

حکم کا ملنا تھا کہ چاروں طرف سے تیروں کا مینہ برسنے لگا۔ ایک تیر سینہ اقدس میں لگا ــــــــ ایک آنکھ میں پیوست ہوا لیکن عباسؑ کے حوصلوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ناگاہ ایک تیر مشک سکینہ پر لگ گیا اور پانی بہنے لگا۔ پانی کا بہنا تھا کہ عباسؑ کا دل ٹوٹ گیا۔

پشت فرس پر سر جھکا کر بیٹھ گئے ــــــــ سر کا جھکنا تھا کہ ایک ظالم نے اس زور سے ایک گرز مارا کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور زمین کی طرف مائل ہوئے گرتے گرتے با آوازِ بلند مولا کو پکار کر کہا۔

"علیکَ منی السّلام یا اباعبداللّٰہ" "یا اَخَاہُ اَدْرِکْ اَخَاکَ"

" بھیا بھائی کی خبر لیجیے۔

اتنا کہا اور خاک پر آ گئے۔ امام حسینؑ کے کانوں تک عباسؑ کی یہ آواز پہنچی تو آپ کمر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آواز دی۔

" اَلْآنَ اِنْکَسَرَ ظَهْرِی وَقَلَّتْ حِیلَتِی وَشَمِتَ بِی عَدُوِّی "

" بھیا اب میری کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی اور دشمن طعنے دینے لگے۔

امام حسینؑ کے پر تاثر کلمات نے عباسؑ کے دل پر کیا اثر کیا اس کا ایک باوفا مجاہد ہی اندازہ کر سکتا ہے۔

کاش کسی کے پہلو میں ویسا ہی حساس دل ہوتا تو سوچتا کہ جب امام مظلومؑ نے

اپنی بیکسی کا اظہار کیا ہوگا۔ اور یہ فرمایا ہوگا۔ کہ عباسؑ دشمن مجھے طعنے دے رہے ہیں حسینؑ تمہارا علمدار کہاں ہے؟ حسین تمہارا وفادار سردار کہاں ہے؟ تو عباس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اور بے بسی کے حساس نے جسم اقدس کو کس طرح تڑپایا ہوگا۔

زخموں کے بعد ہوش و حواس کا سلامت رہنا عباسؑ ہی جیسے دل و جگر والے کا کام ہے۔

سینے میں تیر، آنکھ میں تیر، سر پر گرز۔ مغز سر پارہ پارہ۔ شانے کٹے ہوئے اور اس کے بعد اس قدر باہوش کہ امام کی تشریف آوری پر ہاشمی اخلاق اور اسلامی آداب کا مکمل مظاہرہ ہو رہا ہے۔

امام حسینؑ نے مجاہد کی آواز سنی اور میدان کا رخ کیا۔ ٹوٹی ہوئی کمر۔ میدان کا راستہ۔ دشمنوں کا نرغہ، راستہ کیوں کر طے ہوا اور امام مظلوم کیسے سرہانے پہنچے۔ یہ مسائل مخصوص قلب و نظر اور حساس ترین دل و جگر کے طالب ہیں۔

راستہ میں عباسؑ کے دونوں ہاتھ بھی ملے اور آپ نے گھوڑے سے اتر کر انھیں سینے سے بھی لگایا۔ (ذکر العباس بحوالہ موسوعۃ النجوم ۲ / ۴۷)

علامہ شیخ جعفر شوستری نے اس روایت پر اعتراض کیا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے حضرت عباسؑ فرات سے واپس آ رہے تھے اور امام حسین فرات کی طرف جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں پہلے حضرت عباسؑ سے ملاقات ہونی چاہیے تھی۔ اس کے بعد ان کے ہاتھوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ یہ معاملہ کیسے برعکس ہو گیا ــــــــ مقاتل کے بیان کے مطابق پہلے ہاتھ قلم ہوئے ہیں۔ اس کے بعد شہادت واقع ہوئی ہے۔

لیکن یہ تصور صرف جغرافیائی ملاحظات سے پیدا ہوا ہے۔ کاش اس میں وفا کے تقاضے اور عباسؑ علمدار کی وصیت کو شامل کر لیا جاتا تو یہ خیال نہ پیدا ہوتا۔

وفا کا شدید تقاضا یہی تھا کہ اب خیمہ کا رخ نہ کیا جائے۔ مشک کا پانی تو بہہ چکا ہے۔ اب خیمہ میں جا کر کیا کریں گے۔

عباسؑ کے احساس کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ امام حسینؑ سے وصیت کے دوران فرمایا کہ مولا! میری لاش کو خیمے میں نہ لے جایئے گا۔ مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔

بھلا وہ وفادار جو مرنے کے بعد بھتیجی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا وہ زندگی میں خیمہ کی طرف کس طرح جائے گا؟

عقل و منطق کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ مشک کے پانی کے بہنے کے بعد عباسؑ نے گھوڑے کا رخ موڑ دیا ہوگا اور پھر فرات کی طرف واپس ہو گئے ہوں گے۔ اسی لئے امام مظلوم نے پہلے آپ کے ہاتھ دیکھے اسکے بعد جسم اقدس تک پہنچے۔

امام حسینؑ کے نفسیاتی تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے عباسؑ کے مصائب پر بھی نظر کرنا ہوگی۔ جو لاتعداد زخموں کے ماسوا عباسؑ کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دونوں ہاتھ قلم ہو چکے ہیں۔ سر زخمی ہے اور مغز سر دو پارہ ہو چکا ہے۔ ایسے میں جو انسان گھوڑے سے گرے گا اس کا کیا عالم ہوگا۔ نہ ہاتھ ہیں کہ زمین پر ٹیک سکے۔ نہ سر سلامت ہے کہ اس کا سہارا لے سکے۔ مجاہد ہے اور مظلومیت۔ شہید راہ خدا ہے اور بیکسی۔

زمین لرز گئی ہوگی۔ آسمان تھرا گیا ہوگا۔ قبر علیؑ کو زلزلہ ہوگا۔ دل ام البنین کانپ رہا ہوگا۔ اور روح زہراؑ فریاد کر رہی ہوگی۔ میرے لال کے وفادار بہادر۔ میرے عباسؑ تیرے اوپر کیا گزر گئی۔

کاش زہراؑ کربلا کے میدان میں ہوتی تو تجھے اپنی گودی میں جگہ دیتی۔

عباسؑ کا یہ صدمہ معصومین کے دلوں کو ہمیشہ تڑپاتا رہا اور بیمار کربلا زیارت کے موقع پر فرماتے رہے۔ "اَشْہَدُ اَنَّکَ قُتِلْتَ مَظْلُوْمًا۔"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بڑی مظلومیت کے ساتھ شہید کئے گئے۔"

امام حسینؑ بھائی کی آواز پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے سرہانے پہنچے۔ سر زانو پر رکھا۔ دونوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ نے فرمایا۔

عباسؑ! کوئی وصیت؟ کوئی تمنا؟ کوئی آرزو؟

عرض کی! مولا۔ ایک آرزو ہے کہ وقت آخر آپ کی زیارت کر لوں۔ لیکن کیا کروں کہ ایک آنکھ میں تیر پیوست ہے اور دوسری آنکھ میں خون جم گیا ہے۔ دیکھنے سے بالکل مجبور ہوں۔

امام حسینؑ نے خون کو صاف کیا اور عباسؑ نے جمال امامت کی زیارت کی اور وصیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولا! میری لاش کو خیمے میں نہ لے جایئے گا مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے میں نے بھتیجی سے پانی کا وعدہ کیا تھا اور اسے وفا نہ کر سکا۔

امام حسینؑ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ آخری ہچکی آئی اور عباسؑ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کو چھوڑ دیا۔

سکینہ نے مرثیہ پڑھا۔

اليوم نامت اعين بك لم تنم
وتسهدت اخرى فعز منامها

"عباسؑ آج وہ آنکھیں سو گئیں جو تیری ہیبت سے نہ سو سکتی تھیں
اور وہ آنکھیں بیدار ہو گئیں جن کا اب سونا مشکل ہے۔"

امام حسینؑ اٹھے اور لاش عباسؑ کو فرات کے کنارے چھوڑ کر خیمہ کا رخ کیا۔

ادھر اہل حرم انتظار میں تھے کہ عباس آرہے ہوں گے۔ بچے مچل رہے تھے کہ پانی آرہا ہوگا۔ سکینہ بچوں کو تسکین دے رہی تھی کہ اب پانی ضرور آئے گا۔ اب میرا چچا پانی لینے گیا ہے کہ اچانک درِ خیمہ پر مولا کی آواز آئی۔

سکینہ دوڑ کر دروازے تک پہنچی خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ کیا دیکھا کہ چچا کے بجائے بابا کھڑے ہیں۔ دوڑ کر قدموں سے لپٹ گئی۔

"یا ابتاہ ھل لک علم بعمی العباس"

بابا کیا آپ کو چچا عباس کا کچھ علم ہے؟ انھوں نے بڑی دیر لگا دی ہے۔ وہ مجھ سے پانی کا وعدہ کر کے گئے تھے۔ میرا چچا بے وفا نہیں ہے۔

امام کے جگر پر خنجر چل گیا۔ بچی سے کیا کہیں۔ اور کیا کہہ کر تسلی دیں —— مظلومیت نے پکار کر کہا —— سکینہ! اب چچا کا ذکر نہ کرو۔ چچا فرات کے کنارے ابدی نیند سو رہا ہے۔

شانِ جہاد

اربابِ مقاتل نے جناب عباسؑ کے اندازِ جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے مقتولین کے اعداد و شمار کو بھی جمع کیا ہے اور اس کی پوری تفصیل بھی درج کی ہے کہ کس موقع پر کس عالم میں اور کس قدر افراد کو واصلِ جہنم کیا ہے؟

فرات سے پہلے فرات کے بعد۔ شانے قلم ہونے سے پہلے اور شانے قلم ہونے کے بعد۔ طاویہ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے اور طاویہ پر سوار ہونے کے بعد وغیرہ

یہ مجموعی تعداد علامہ اسفرائنی اور علامہ دربندی کے بیان کے مطابق ڈھائی

ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ جب کہ ملا جعفر تبریزی مرحوم کے بیان کے مطابق "لیلۃ الہریر" میں امیر المومنین کے مقتولین کی تعداد صرف ۵۲۳ تھی۔

ظاہر ہے کہ ان اعداد و شمار پر مکمل طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ میں درج ہو جانا اس کے مستند اور سند ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ درایت و منطق بھی ایک چیز ہے۔

"لیلۃ الہریر" کی گھمسان کی لڑائی میں رات کے وقت مقتولین کا شمار کر لینا کسی مورخ کے بس کی بات ہے اور نہ کسی رپورٹر کے امکان کی۔

کربلا میں بھی حضرت عباسؑ کے جہاد سے چھائی ہوئی ہیبت اور اڑے ہوئے حواس میں کسے فرصت و ہمت تھی کہ وہ مقتولین کے اعداد و شمار جمع کرائے اور وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ کہ کس مقام پر کس عالم میں کتنے افراد کو قتل کیا گیا ہے

یہ صرف ایک اندازہ ہے جو حقیقت سے کہیں کم ہے۔ دشمن یوں بھی مقتولین کی تعداد کو چھپا دیا کرتے ہیں۔ پھر رپورٹر کو انھیں افراد کی اطلاع ہو سکتی ہے جن کی لاشیں علامت میں سامنے آگئیں ان کا شمار کیا جا سکا۔

مختلف حالات کے مقتولین کی تعداد کا تعین مقاماتِ قتل کے اعتبار سے ہوا ہوگا کہ مجاہد فلاں حالت میں فلاں مقام پر تھا اس لئے یہ مقتولین کا ڈھیر اس حالت کے مقتولین کا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ تین دن کا بھوکا پیاسا انسان۔ زخموں سے چور۔ حالات سے شکستہ دل اور بے دست و بازو ہونے کے بعد بھی کتنی ہمتِ مردانہ سے جہاد کرتا رہا اور دشمنوں کو مسلسل موت کے گھاٹ اتارتا رہا۔

امیر المومنین کے مقتولین سے موازنہ اس لئے بھی نامناسب ہے کہ آپ امامِ وقت

اور صاحب علم غیب تھے۔ آپ کی ذمہ داریاں دوسرے کسی بھی مجاہد سے کہیں زیادہ مختلف اور کہیں زیادہ بالاتر تھیں۔

آپ کی جلالت و ہمت کا معیار مقتولین کی تعداد نہیں ہے بلکہ وہ انداز قتل ہے جس میں ستر ستر پشت کے مومنین کا خیال رکھا جاتا تھا اور نسلوں میں آنے والے صاحبان ایمان کی خاطر مقابلہ پر آنے والوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں امام حسینؑ کا نام یقیناً لیا جا سکتا ہے کہ آپ بھی ان تمام مراتب و خصوصیات کے حامل تھے۔ اور آپ کے مقتولین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے جبکہ امام زین العابدینؑ کا بیان ہے کہ میرے بابا ایک شخص کو قتل کرتے تھے اور ایک کو اس کی نسل کی بنا پر چھوڑ دیتے تھے۔

ہر زد پر آ جانے والے کو قتل کر دینا غیر امام اور غیر معصوم کا کام ہے اور نسلوں کا لحاظ کر کے تلوار اٹھانا امام معصوم کی ذمہ داری ہے۔ پھر بھی کربلا میں موت کی ایسی گرم بازاری تھی کہ بنی ہاشم کا کمسن بچہ بھی آیا ہے تو دس بیس کو تہہ تیغ کئے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہوا۔

عباسؑ تو بہر حال عباسؑ تھے۔ ان کی ہمت و ہیبت اور ان کی طاقت و شجاعت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

افسوس کہ لڑنے کی اجازت نہ ملی
ورنہ درِ کوفہ درِ خیبر ہوتا

وصیت :-

مقاتل میں جناب عباسؑ کی یہ وصیت بھی درج کی گئی ہے کہ بھیا! میرے لاشے کو خیمے میں نہ لے جایئے گا۔ مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔

علمائے اسلام نے اس وصیت کے اسباب کو بھی موضوع بحث قرار دیا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ عباسؑ کو واقعاً سکینہ سے شرمندگی تھی اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اگر لاش کے سرہانے بھتیجی نے آ کر پانی کا وعدہ یاد دلا دیا تو میری روح پر کیا گزر جائے گی ______ تقاضائے وفا بھی ہے کہ اب بھتیجی کا سامنا نہ کیا جائے۔

بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا اور حضرت عباسؑ امام حسینؑ کی شکستہ کمر کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کو یہ زحمت نہیں دینا چاہتے تھے کہ آپ لاشے کو خیمہ میں لے جائیں۔

علامہ عبدالرزاق مقرم کی تحقیق یہ ہے کہ امام حسینؑ نے ایک عظیم مصلحت کے تحت لاشہ کو دریا کے کنارے چھوڑ دیا تھا تاکہ حضرت عباسؑ کا مزار مبارک عام شہداء سے الگ رہے اور آپ کے کرامات و کمالات صبح قیامت تک جداگانہ انداز سے ظاہر ہوتے رہیں۔

کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ اس توجیہ میں اور دوسرے وجوہ میں کوئی منافات نہیں ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ اس توجیہ کا تعلق امام حسینؑ کے مصالح سے ہے اور اُن کا تعلق حضرت عباسؑ کے جذبات سے ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ امام حسینؑ پارہ پارہ جسم کو اٹھانے کی طاقت رکھتے تھے لہٰذا دوسری توجیہ یکسر بے محل ہے۔

اس لئے کہ امام حسینؑ کے اقتدار و اختیار میں شک نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی حالات کے پیش نظر دیکھنا پڑے گا کہ حضرت عباسؑ کے جذباتِ وفا کا تقاضا کیا تھا اور وہ امام حسینؑ کی اس زحمت کو برداشت کر سکتے تھے یا نہیں؟

پہلی وجہ بالکل واضح ہے اور حضرت عباسؑ کے جذبات و احساسات کے عین مطابق ہے ـــــــ مسئلہ صرف یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ وصیت ثابت بھی ہے یا نہیں؟

علامہ مقرم کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ثبوت سے ان کی مراد کیا ہے؟

وہ کس قسم کا ثبوت چاہتے ہیں۔ کتب مقاتل میں روایت کا درج ہونا ایک بہترین ثبوت ہے جب کہ روایت کسی بھی مسلمہ اور قانون کے خلاف نہیں ہے۔

بنا بریں وجہ اول زیادہ وجیہ اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ وصیت بالکل بے بنیاد ہے اور حضرت عباسؑ نے اس قسم کی کوئی وصیت نہیں کی تھی۔ تو علامہ مقرم کا بیان سب سے زیادہ قرین قیاس اور مطابقِ عقل و منطق ہے ـــــ

(واضح رہے کہ بعض ضعیف روایات میں حضرت عباس کی لاش کے خیمے میں لے جانے کا بھی ذکر ہے۔

خدا جانے کہ اس راوی کو کہاں سے دھوکا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اشتباہ بھی اسی اشتباہ کی ایک فرع ہو کہ حضرت عباسؑ کی شہادت نویں محرم کی شام کو واقع ہو گئی ہے جب کہ یہ واقعہ عباسِ اصغر کا ہے عباسؑ علمدار کا نہیں۔)

اَندازِ رَجز

حضرت عباسؑ کی عظمت و جلالت کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کے ان اشعار پر بھی نظر کرنا پڑے گی۔ جو آپ نے جہاد کی منزل میں رجز کے طور پر ارشاد فرمائے تھے۔

عام طور سے حضرت عباسؑ کی بلندی اور برتری ان کی ہمت و طاقت کے اعتبار سے ہی سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہمت و طاقت انسانی عظمتِ کردار کی دلیل نہیں بنا کرتی۔ حضرت عباس کی جلالت قدر اس عظیم معرفت کی بنا پر ہے جس نے طاقت کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے رجز میں اپنی ہمت و طاقت، جرأت و ہیبت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ واضح طور پر دین خدا کی عظمت اور امام حسینؑ کے مراتب و مناقب کا تذکرہ کیا ہے۔

تا کہ فوج دشمن یہ اندازہ کر لے کہ جس قافلہ پر بغاوت و خروج کا الزام لگایا گیا ہے ــ یہ دین کے پرستار اور مذہب کے وفادار ہیں۔ امام حسینؑ کے جد بزرگوار حضرت احمد مختار اور ان کے پدر نامدار حیدرِ کرار تھے۔ ان کے خلاف صف آرائی کرنا دین سے بغاوت اور اسلام سے مقابلہ ہے۔ ان پر خروج و بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

تبلیغ حق اور اتمام حجت کا یہ انداز صرف اس مجاہد کو زیب دیتا ہے جو شجاع اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ نیابت و سفارت کی عظیم تر ذمہ داریوں کا حامل ہو اور جنگ کو مکمل اسلامی آئین کے تحت سر کرنا چاہتا ہو۔

تاثرات

انسان کی عظمت و جلالت کے بے شمار پیمانوں میں ایک عظیم پیمانہ وہ تاثرات بھی ہیں جو اس کے مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

زندگی میں اخلاص و محبت کا مظاہرہ کرنے والے بے شمار مل جاتے ہیں۔ اختلاف کے اظہار پر مکر و ریا ــــــ اور مصلحت و حالات کے لاتعداد غلاف چڑھتے رہتے ہیں۔

لیکن مرنے کے بعد یہ حالات یکبارگی بدل جایا کرتے ہیں۔ نہ مروت و رواداری کا کوئی سوال رہ جاتا ہے اور نہ مکر و ریا کا۔ نہ نگاہوں کا سامنا مدح و ثنا پر آمادہ کرتا ہے نہ مصالح وقت مہر بلب بناتے ہیں۔

ایسے میں جو تاثر بھی قائم ہوتا ہے وہ بڑی حد تک حقیقت کا آئینہ دار اور شخصیت کے جذب و کشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت پر زمین کا خون اگلنا۔ آسمان کا لہو برسانا۔ جنات و ملائکہ کا نوحہ پڑھنا۔ رسول اکرم کا ام سلمہ کے خواب میں گریباں چاک آنا ــــــ ایسے تاثرات ہیں جن سے شخصیت کی عظمت و جلالت اور اس کی گوناگوں محبوبیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت عباسؑ کی جلالت و برتری کا اندازہ بھی اسی پیمانے سے کیا جا سکتا ہے۔ زندگی میں آپ کی محبوبیت و اخلاص پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ شہادت کے بعد آپ کے نہ رہنے کا احساس کس قدر اثر انگیز واقع ہوا ہے اور آپ کی کمی کائنات کے لئے کس قدر محسوس کی گئی ہے۔

ان تاثرات کو الگ الگ شخصیتوں کے اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے اور تجزیہ و تفصیل کے بعد ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس اثر لینے والے کی کیا منزل تھی اور اس کے تاثرات کا کیا انداز تھا؟

امام حسینؑ

ارباب مقاتل کا بیان ہے کہ حضرت عباسؑ کی آخری آواز آتے ہی امام حسینؑ کی زبان اقدس پر یہ فقرات آ گئے۔

" اَلْاٰنَ اِنْکَسَرَ ظَهْرِیْ وَقَلَّتْ حِیْلَتِیْ "

" عباسؑ اب کمر ٹوٹ گئی۔ تدبیر کی راہیں بند ہو گئیں "

تاریخ اسلام میں یہ فقرہ ایک مرتبہ جناب امیرؑ نے حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت پر استعمال کیا تھا اور ایک مرتبہ امام حسینؑ نے کربلا میں استعمال کیا ہے۔ حضرت امیرؑ کے اس فقرے کو صرف منہاج الدموع ص۳۳ نے نقل کیا ہے اور امام حسینؑ کے اس فقرہ کو بیشتر ارباب مقاتل نے درج کیا ہے۔

منہاج الدموع کی روایت کی صحت و عدم صحت سے قطع نظر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں یہ فقرہ ایسے ہی جلیل القدر انسان کی شہادت پر استعمال ہوتا ہے جو جعفر طیارؓ جیسا وفادار، علمبردار اور نیک کردار ہو۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ روایات نے صرف حضرت عباسؑ کو مثیل جعفر طیارؓ قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے باغ جنت میں پر پرواز عطا ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

اس کے باوجود حضرت عباسؑ کو ایک انفرادیت اور امتیاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب امیرؑ کے سامنے ان کے کسی ایسے بھائی نے انتقال نہیں کیا تھا جس کا مرتبہ جعفر طیارؑ سے بلند تر ہو کہ جعفر طیار کے بارے میں اس فقرہ کے استعمال سے یہ اندازہ کیا جائے کہ ان کی جلالت و عظمت مولاؑ کی نگاہ میں کیا ہے۔

لیکن امام حسینؑ کے سامنے ان کے ایک معصوم بھائی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اور ان کی شہادت پر امام حسینؑ نے نوحہ بھی پڑھا تھا۔ گریہ بھی کیا تھا۔ آنسو بھی بہائے تھے۔

یہ اور بات ہے کہ امام حسینؑ کے مرثیے میں یہ نہیں فرمایا تھا کہ بھیا ——— آج میری کمر ٹوٹ گئی!۔

یہ خیال نہ ہو کہ یہ فقرہ چھوٹے بھائی کی شہادت پر استعمال ہوتا ہے اور امام حسنؑ بڑے بھائی تھے۔

اس لئے کہ امیر المومنین نے اسے جعفر طیارؑ کی شہادت پر استعمال کیا ہے جو بلاشبہ مولائے کائنات سے بڑے اور عمر کے اعتبار سے بزرگ تر تھے۔

سوال صرف یہ ہے کہ امام حسینؑ نے یہ فقرہ کل کیوں نہیں استعمال فرمایا تھا اور آج کے لئے کیوں اٹھا رکھا تھا۔

کیا اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کی نظر میں جناب عباسؑ کا مرتبہ امام حسنؑ سے بلند تر تھا۔؟ ہرگز نہیں۔

امام حسنؑ امام وقت تھے۔ معصوم تھے۔ منصب الٰہی کے حامل تھے۔ اور حضرت عباسؑ ان تمام فضائل و کمالات میں کسی فضیلت کے مالک نہیں تھے۔

اس کے بعد یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ امام حسنؑ کی شہادت پر موقع پر حضرت عباسؑ موجود تھے۔ اس لئے امام حسینؑ کو اس تنہائی اور کمزوری کا احساس نہیں ہوا جو ایک

ایسے بھائی کی شہادت پر ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب کربلا میں عباسؑ علمدار نے آخری سلام کیا۔ تو امام حسینؑ کے قلب نازنین نے محسوس کر لیا کہ اب کوئی ایسا دمساز اور جاں نثار ممکن نہیں ہے۔ اب نہ تو کمر کی طاقت ہے اور نہ بازو کا زور۔

یہی وجہ تھی کہ شہادت حضرت عباسؑ کا تاثر امام حسینؑ کے پورے وجود سے ظاہر ہوا ہے۔ ہاتھ کمر تک پہنچ گئے۔ اور چہرہ حزن و الم سے تصویر غم بن گیا بلکہ مقتل کا بیان تو یہ ہے کہ:۔

"بَانَ الْاِنْكِسَارُ فِيْ وَجْهِ الْحُسَيْنِ مُحْسِنًا
مَهْمُوْمًا مَغْمُوْمًا وَدُمُوْعُهٗ تَجْرِيْ عَلٰى خَدَّيْهِ"

"امام حسینؑ کے چہرے سے خستگی و شکستگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور آپ مہموم و مغموم ہو کر بیٹھ گئے۔ عالم یہ تھا کہ دونوں رخساروں پر مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔" (دمعۂ ساکبہ ص ۳۳۸)

امام زین العابدینؑ

صاحب دمعۂ ساکبہ ناقل ہیں کہ جب امام حسینؑ رخصت آخر کے لئے خیمہ میں آئے تو جناب زینبؑ انھیں لئے ہوئے بیمار بھتیجے کے پاس آئیں اور شانہ ہلا کر بیدار کیا فرمایا۔

"میرے لال! باپ رخصت آخر کے لئے آیا ہے"۔

بیمار نے رخصت آخر کا نام سنا اور دل تڑپ گیا۔ عرض کی بابا جان! یہ رخصت آخر کا کیا مطلب ہے؟ آپ کے اصحاب و انصار کہاں ہیں؟ وہ چاہنے والے جاں نثار کہاں گئے؟

امام حسینؑ نے ایک ایک کی شہادت کی خبر سنائی۔ بیمار کربلا کا دل تڑپتا رہا۔

آخر میں آپ نے پوچھا بابا جان! میرا چچا عباسؑ کہاں ہے؟

عباسؑ کے بارے میں سوال کا ہونا تھا کہ جناب زینبؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اللہ اس قدر نازک سوال۔ دیکھیں بھیا کیا جواب دیتے ہیں۔

امام حسینؑ چند لمحے خاموش رہے اور آخر میں فرمایا۔

"بُنَیَّ اِنَّ عَمَّکَ قَدْ قُتِلَ"

"بیٹا وہ بھی شہید ہو گئے"

شہادت کا نام سننا تھا کہ

"بَکیٰ عَلِیُّ بْنُ الْحُسَیْنِ بُکَاءً شَدِیْداً"

بیمارِ کربلا چیخ کر رونے لگے۔ ارے میرے چچا۔ ہائے میرا چچا۔

امام حسینؑ پر اس شہادت کا یہ اثر ہوا کہ چہرہ کا رنگ اڑ گیا اور کمر ٹوٹ گئی تو بیمارِ کربلا پر یہ اثر ہونا ہی چاہیئے تھا۔

یہ چچا کی شہادت ہی کی خبر نہیں تھی۔ باپ کی بیکسی اور اپنی مجبوری کی خبر تھی۔ خیام کے لٹنے اور چادروں کے چھننے کی خبر تھی۔ لشکر کے خاتمہ اور دشمن کے طعنے کی خبر تھی۔ یہ خبر اشارہ کر رہی تھی کہ اب مصائب کے نئے باب کا وقت آگیا۔ اب آلِ محمدؐ کو دیار بدیار قیدی بن کر جانا ہے۔

امام زین العابدینؑ کا اس شدت سے گریہ کرنا حضرت عباسؑ کی عظمت و جلالت کی بہترین دلیل ہے۔ اور اس کے بعد حضرت کا یہ ارشاد گرامی کہ میرے چچا کے مرتبہ پر تمام شہداء اولین و آخرین غبطہ کریں گے، اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت عباسؑ کی عظمت و برتری کی مثال صرف اس امت میں نہیں۔ امم سابقہ میں بھی موجود نہیں ہے۔

جنابِ زینبؑ :

مشہور و معروف روایت ہے کہ جب جناب زینبؑ کو حضرت عباسؑ کے رخصت ہو کر میدان میں جانے کی اطلاع ملی اور آپ نے دیکھا کہ اب بھائی سے ملاقات کا امکان نہیں ہے تو ایک مرتبہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اور فرمایا۔ "صَدَقَ اَبِیْ" میرے بابا نے سچ کہا تھا۔

امام حسینؑ نے فرمایا۔ بہن اس فقرہ کا مطلب کیا ہے۔

عرض کی بھیا! میں بابا کی خدمت میں تھی۔ بابا میرے بازوؤں کو بوسہ دیکر فرمانے لگے زینب! ایک دن ان بازوؤں میں رسیاں باندھی جائیں گی۔ میں مضطرب تھی اور جس وقت مجھے اس اسیری کا خیال آیا تھا یہ سوچ کر دل کو مطمئن کر لیتی تھی کہ جس کا عباسؑ جیسا بھائی سلامت ہو اس کے بازوؤں میں کون رسی باندھ سکتا ہے۔

لیکن بھیا اب معلوم ہو گیا کہ وہ وقت آگیا جب زینبؑ فوجِ شام کی قیدی بنے گی اور اسے دیار بدیار پھرایا جائے گا۔ ؎

حق کو اللہ نے بخشا ہے برادر کوئی
چھین سکتا نہیں اُس بی بی کی چادر کوئی
وقت کی بات جو پابندِ رسن ہے زینبؑ
ورنہ عباسؑ سے بھائی کی بہن ہے زینبؑ

(پیامِ اعظمی)

مخدراتِ عصمت

امام ابواسحاق اسفرائنی کا بیان ہے کہ "جب امام حسینؑ لاشِ عبّاسؑ علمدار سے پلٹ کر خیمہ میں آئے تو درِ خیمہ پہ کھڑے ہو کر یہ خبرِ غم سنائی۔ سیدانیو! عبّاس فرات کے کنارے شہید ہو گئے۔

یہ سننا تھا کہ بیبیاں خیموں سے باہر نکل آئیں اور گریہ و شیون کا ایک شور برپا ہو گیا۔ شدتِ گریہ کا عالم یہ تھا کہ ملائکۂ آسمان بھی آنسو بہا رہے تھے اور ماتم کر رہے تھے۔

" امام حسینؑ نے یہ منظر دیکھا تو دوڑ کر بیبیوں کو خیموں میں واپس کیا اور سب کو تسلی دی۔" نور العین ص۶۰

امام مظلومؑ کی میدان سے واپسی کا منظر علامہ جہندی نے اپنے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

" رَجَعَ اِلَی الْخَیْمَۃِ وَھُوَ یَکْفَکِفُ دُمُوْعَہٗ بِکُمِّہٖ

" امام حسین اس عالم میں خیمے کی طرف پلٹے کہ آپ اپنے آنسوؤں کو آستین سے خشک کر رہے تھے۔"

بیبیوں کے خیمے سے نکلنے میں جناب زینبؑ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عام مخدرات تڑپ کر باہر نکل آئی ہوں اور یہ چاہتی ہوں کہ کسی طرح اپنے کو لاشِ عبّاس تک پہنچا دیں ——— لاش خیمہ تک آ گئی ہوتی تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔

لیکن ——— آہ . . . . .

جناب سکینہؑ

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب علمدار کی شہادت کی خبر سن کر عام مخدرات کا یہ عالم تھا تو پیاری بھتیجی "سکینہ" کا کیا عالم ہو گا۔

سکینہؑ نے چچا کو دریا پہ بھیجا تھا۔ سکینہ ہی نے مشکیزہ لا کر دیا تھا۔ سکینہؑ آس لگائے بیٹھی تھی۔ سکینہ کے گرد بچے جمع تھے اور وہ بچوں کو برابر سمجھی رہی تھی۔ بچو! گھبراؤ نہیں۔ اب میرا چچا دریا پر گیا ہے۔ اب پانی ضرور لائے گا۔

لیکن ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ چچا کے بجائے بابا میدان سے آئے ہیں اور چچا کا علم اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ بچوں کی آس ٹوٹ گئی اور سکینہؑ تڑپ کر درِ خیمہ پر آ گئی۔ بابا آپ کو کچھ میرے چچا عبّاس کی خبر ہے۔ انھوں نے بہت دیر لگائی۔ بابا وہ پانی کا وعدہ کر کے گئے تھے۔ اور میرا چچا بے وفا نہیں ہے۔ اسرار الشہادات ص۲۳۶

یہ معصومانہ جذبات صاف صاف آواز دے رہے ہیں کہ عباسؑ کا اعتماد، وفا اور ان کا کردار بے مثال تھا۔ انھوں نے آلِ محمدؐ کی راہ میں قربانیاں کی تھیں۔ اور انھیں قربانیوں کا اثر تھا کہ امام حسینؑ اور ان کے اہلِ حرم پر جب بھی کوئی مصیبت پڑتی تھی تو بے ساختہ عباسؑ یاد آتے تھے۔

امامؑ مظلوم گھوڑے سے گرے تو عباس کو پکارا ——— (مقتل ابو مخنف ص۳۷۶)
ظالموں نے تلواروں سے حملے کئے تو عباسؑ کو یاد کیا ——— (ابو مخنف ص۳۷۷)
خیموں میں آگ لگی تو سیدانیوں نے عباسؑ کو پکارا ——— (ریاض القدس ص۱۸۱)
جناب زینبؑ شام غریباں میں طلایہ پھرنے لگیں تو عباسؑ کو آواز دی۔
سکینہؑ کے دامن میں آگ لگی تو گھبرا کر عباسؑ کو فریاد کے لئے پکارا۔
اسیروں کا قافلہ روانہ ہونے لگا تو ناقہ پر سوار ہونے کے لئے ثانیٔ زہراؑ نے عباسؑ کو آواز دی۔ (اسرار الشہادات ص۳۹۷)

یاد آتے ہیں حضرت عباسؑ
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

راہِ کوفہ و شام

مقاتل کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہادتِ امامؑ مظلوم کے بعد آپ کا سرِ اقدس اُسی شب خولی کے ہمراہ کوفہ بھیج دیا گیا اور اسے کوفہ میں کوچہ بہ کوچہ دیار بدیار پھرایا گیا تھا۔ مسجد حنانہ کے زیر سایہ آپ ہی کا سرِ اقدس رکھا گیا تھا جس کے زیرِ اثر مسجد کی دیواریں جھک گئی تھیں۔

باقی سرہائے شہداء گیارھویں محرم کو اسیروں کے ساتھ کوفہ لے جائے گئے اور انھیں نوک ہائے نیزہ پر نصب کیا گیا۔

صرف حضرت عباسؑ کے سر کے بارے میں یہ روایت ہے کہ آپ کا سر گھوڑے کی گردن میں آویزاں تھا اور ظالم جب گھوڑے کو دوڑاتا تھا تو سرِ مبارک برابر ٹھوکریں کھاتا جاتا تھا۔

مقاتل میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ تفریق کیوں تھی۔ لیکن بعض روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرِ اقدس نوکِ نیزہ پر ٹھہرتا ہی نہ تھا اور جب بھی اشقیاء نوکِ نیزہ پر نصب کرنے کی کوشش کرتے تھے، اپنے ارادہ میں ناکام ہو جاتے تھے۔

یہ بات بظاہر تعجب خیز ہے۔ اور اس وقت مزید تعجب خیز ہو جاتی ہے جب شام کے واقعات میں آپ کا سر نوکِ نیزہ پر دیکھا جاتا ہے
یہ ممکن ہے کہ پہلے واقعہ کا تعلق کوفہ سے ہو اور دوسرے کا شام سے۔ لیکن

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کوفہ میں یہ سر نوکِ نیزہ پر کیوں نہیں ٹھہرا۔

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ کوفہ حضرت علیؑ کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ یہاں کے لوگ آلِ محمدؐ سے باقاعدہ طور پر واقف تھے۔ اور حضرت زینبؑ اس احترام کے ساتھ رہ چکی تھیں کہ کوفہ کی عورتیں ملاقات کے لئے اجازت طلب کیا کرتی تھیں۔ شام کی یہ نوعیت ہرگز نہیں تھی۔ یہ جگہ ابتدا سے دشمنانِ اہلِ بیت کا مرکز تھی اور یہاں یزید کا باپ معاویہ حکومت کر رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس قدر بے پردگی کا نفسیاتی اثر کوفہ میں ہو سکتا ہے شام میں نہیں ہو سکتا۔

حضرت عباسؑ نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ نوکِ نیزہ پر اس طرح سر بلند ہو کر جب آنکھیں کھلیں تو اپنی بہنوں اور سیدانیوں کو کوفہ کے دربار و بازار میں سر برہنہ دیکھیں۔ شام میں حالات کسی قدر تبدیل ہو گئے تھے اور تماشائی بھی عادی ہو گئے تھے اس لئے آپ نے نوکِ نیزہ پر ٹھہرنا گوارہ کر لیا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے سر کو نوکِ نیزہ پر نصب کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور جب آپ نے اس منصوبہ کو ناکام بنا دیا ہو تو ظالم جذبۂ انتقام میں اہلِ حرم کو تازیانوں سے اذیت دی ہو اور انھوں نے تڑپ کر آپ سے گزارش کی ہو کہ ——— ہاشم کے چاند اب نیزہ پر بلند ہو جا ورنہ ہم یوں ہی تازیانوں پر تازیانے کھاتے رہیں گے۔

حضرت عباسؑ کے لئے دونوں باتیں بے حد سخت تھیں۔ نوکِ نیزہ سے سیدانیوں کے کھلے سروں کا دیکھنا اور سیدانیوں کی پشتِ اقدس پر ظالموں کے تازیانوں کے نشان دیکھنا۔ آپ نے پہلے اپنے جذباتِ حمیت کا اعلان کیا اس کے بعد جب سیدانیوں کی تازہ مصیبت سامنے آئی تو قلبِ نازنین پر جبر کر کے یہ مصیبت بھی برداشت کر لی۔

شام

گیارہویں محرم کا چلا ہوا قافلہ یکم صفر کو وارد سرزمین دمشق ہوا۔ تین دن تک قافلہ کو بیرونِ شہر روک کر شہر کو آراستہ کیا گیا۔ بازاروں کی آئینہ بندی کی گئی ——— دربار میں اعیانِ مملکت کو جمع کیا گیا ——— راستوں پر تماشائیوں کا مجمع لگایا گیا ——— اور ایسے عالم میں رسولِ اکرم کی ذریت کو دربار میں داخلہ کا حکم دیا گیا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب بھی انسان پر کوئی تازہ مصیبت وارد ہوتی ہے تو اسے اپنے یار و مددگار اور اعوان و انصار یاد آتے ہیں۔ حسینی اہلِ حرم کی نگاہ میں عباسؑ سے بڑا معین و مددگار کون ہو سکتا ہے؟

بھلا جن بچوں نے شدتِ عطش میں عباسؑ کو یاد کیا ہو خیام کی غارتگری میں عباسؑ کو پکارا ہو، شمر کے طمانچوں پر عباسؑ کا نام لیا ہو۔

جس خاتون نے گنجِ شہیداں پر نظر ڈالنے کے بعد فرات سے عباسؑ کو آواز دی ہو ——— وہ جب تازہ مصیبت سے دوچار ہوں گے تو سوائے عباسؑ کے کسے بلائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب مقاتل کے بیان کے مطابق بازارِ شام میں سکینہؑ کی نظر چچا کے سر پر پڑ گئی تو چچا چچا کہہ کے ایک نعرہ مارا اور دل تڑپ گیا۔

شام سے رہائی کے موقع پر قید خانے میں شہیدوں کے سر آئے تو جناب ام کلثومؑ نے دوڑ کر سرِ عباسؑ اٹھا لیا اور بین کرنا شروع کر دیئے۔

نفسیات کے اس تجزیہ کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مقاتل نے اہل حرم کے تاثرات کو کس انداز سے بیان کیا ہے اور اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ باتیں عین مطابق فطرت ہیں۔ ان کے لئے کسی مقتل کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں اگر کوئی موقع اس کے خلاف آجائے تو مقتل کا فرض ہے کہ اس کی نشاندہی کرے ——— تاریخ، عالم کے تازہ حوادث کی ترجمانی کرتی ہے ——— مطابقِ فطرت حالات کی عکاسی تاریخ کا کام نہیں ہے۔ ان حالات کو ہر انسان اپنے ذوق سے محسوس کر سکتا ہے۔

شعراء کرام کو "تلامیذ الرحمان" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ احساس شدید تر ہوتا ہے اور وہ ان کیفیات کا وجدانی ذوق رکھتے ہیں۔ حالات کی ترجمانی میں "زبانِ حال" کو اسی لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے مذکورات کا علم نہیں ہوتا بلکہ احساس کا علم ہوتا ہے۔

"زبانِ مقاتل" میں فریب ریاکاری ——— خودستائی کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔

لیکن زبانِ حال میں ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ احساس صحیح اور وجدان ذوق صحت مند اور سالم ہو۔ اس کے بغیر نہ حال کا احساس ہو سکتا ہے اور نہ اس کی ترجمانی ممکن ہے۔

قافلہ اہلحرم مدینہ میں

ایک سال تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد قافلۂ حرم کو رہائی نصیب ہوئی اور یہ لٹا ہوا قافلہ کربلا ہوتا ہوا مدینہ کے لئے روانہ ہوا۔ ایک مدت کے بعد "مدینہ والے" مدینہ واپس آئے تو اس عالم میں کہ جناب ام کلثومؑ نے مدینے کو دیکھتے ہی آواز دی۔

"نانا کے مدینے! ہمارے آنے کو قبول نہ کرنا۔ ہم حسرتیں لے کر آئے ہیں۔
مدینے! ہم تجھ سے رخصت ہوئے تھے تو بھرا گھر ہمارے ساتھ تھا۔
اور واپس آئے ہیں تو نہ بچے ہیں اور نہ والی و وارث۔"

بیرونِ مدینہ قافلہ ٹھہرا ——— امام زین العابدینؑ نے بشیر بن جذلم کو حکم دیا کہ مدینہ والوں کو ہماری آمد کی اطلاع کر دے۔ "بشیر" حکم پا کر چلا۔ شہر میں داخل ہو کر آواز دی۔

يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ بِهَا
قُتِلَ الْحُسَيْنُ فَاَدْمُعِيْ مِدْرَارٌ
اَلْجِسْمُ مِنْهُ بِكَرْبَلَاءَ مُضَرَّجٌ
وَالرَّاْسُ مِنْهُ عَلَى الْقَنَاةِ يُدَارُ

ترجمہ: "مدینے والو! مدینہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ حسینؑ مارے گئے! دیکھو میرے آنسو برابر بہہ رہے ہیں ——— مدینہ والو

قیامت ہے کہ حسینؑ کا جسم خاک و خون میں آغشتہ زمین کربلا پر رہا اور انکے
سر کو نوک نیزہ پر دیار بدیار پھرایا گیا۔"

اس آواز کا سننا تھا کہ سارا مدینہ بیتاب ہو کر نکل پڑا۔ شہر میں ایک کہرام برپا تھا۔ بشیر محلہ بنی ہاشم میں پہنچا تو کیا دیکھا کہ ایک معظمہ "باحالتِ تباہ" اسی منزل کی طرف دوڑتی چلی جارہی ہیں جہاں قافلہ ٹھہرا ہوا ہے۔ زبان پر واحسیناؑ واحسینا کے نعرے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ جناب ام البنینؑ مادرِ حضرت عباسؑ ہیں جنہیں اپنا شہزادہ یاد آرہا ہے اور اس کے غم میں اپنے فرزند کے غم کو بھلا دیا ہے۔

اس عالم میں ایک بچہ پر بھی نظر پڑی جو سرِراہ کھڑا ہوا تھا۔ بشیر قریب پہنچا۔ بچہ نے بڑھ کر راستہ روکا اور کہا بشیر بولا تو شہید ہو گئے۔ یہ بتا میرے بابا آئے ہیں یا نہیں۔ بابا آئے ہوں تو میں اچھے کپڑے پہن کر آؤں ورنہ سیاہ لباس پہن لوں!!

بشیر نے پوچھا فرزند! تمہارا بابا کون ہے اور تم کس کے انتظار میں ہو۔ عبیداللہ بن عباسؑ نے کہا۔ میرا بابا عباسؑ علمدار ہے۔"

بشیر کا دل تڑپ گیا۔ سر جھکا کر بولا۔ "بیٹا! اب ماتمی لباس پہن لو۔ تمہارے بابا کربلا کے میدان میں شہید ہو گئے۔" (ریاض القدس ا صـ۱۵۸)

مدفن مقدس

" مدفن " اس جگہ کا نام ہے جہاں کسی مرنے والے کو سپرد خاک کیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مسلمان جب عالم ناپائیدار سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے اعزا اور چاہنے والے قبر کا اہتمام کرتے ہیں اور نہایت ہی اہتمام کے ساتھ اسے سپرد خاک کرتے ہیں۔

شریعت اسلامی نے بھی دفن اموات کو بے حد اہمیت دی ہے اور اسے ہر مسلمان کی ایک ذمہ داری قرار دی ہے۔ " دفن اموات " واجب کفائی ہے لیکن واجب کفائی اپنے وجوب میں کفائی نہیں ہوتا۔ وجوب کے ادا ہونے میں کفائی ہوتا ہے۔ اس کے وجوب کا تعلق ہر مسلمان سے ہوتا ہے

یہ اور بات ہے کہ مقصد کے حصول کے بعد باقی افراد سے یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔

کربلا کی تاریخ اس مسئلہ میں بھی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ یہاں کے نام نہاد مسلمانوں نے اپنے مقتولین کی لاشوں کو تو دفن کر دیا۔

لیکن فرزند رسولؐ اور دیگر شہدؓا راہ خدا کی لاشوں کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں کی اور انھیں ریگ گرم صحرا پر چھوڑ کر انکے وارثوں کو قیدی بنا کر چلے گئے۔

ان شہداء کے دفن کا اہتمام مالک کائنات نے کیا۔ امام زین العابدینؑ نے باعجاز قید کوفہ سے تشریف لا کر بنی اسد کے تعاون سے تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے۔

آپ کا خصوصی اہتمام یہ تھا کہ ایک قبر تیار کر کے اس میں بہ نفس نفیس اپنے پدر بزرگوار کو دفن کیا اور کسی کو اس امر میں شریک نہیں ہونے دیا۔

دوسری قبر میں اپنے بھائی حضرت علیؑ اکبر کو دفن کیا۔ تیسری قبر میں حبیبؓ ابن مظاہر کو دفن کیا۔ اور ایک قبر میں تمام شہدؓا کربلا کو دفن کیا۔

ان سب سے فرصت پانے کے بعد فرات کے کنارے ایک قبر تیار کرائی اور اپنے چچا عباسؑ علمدار کو دفن فرما دیا۔

حضرت عباسؑ کا امتیاز یہ ہے کہ آپ کی قبر مطہر تمام شہداء کی قبور سے جدا اور قدرے دور ہے۔ علما اعلام نے اس جگہ کی تعبیر "شط فرات" "مقابل حائر" جیسی لفظوں سے کی ہے۔ اعلام الوریٰ ص ۱۲۷، عمدۃ الطالب ص ۳۲۹، الزار النعمانیہ ص ۳۴۴ وغیرہ۔

اس امتیاز کے مختلف اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ امام حسینؑ سے حضرت عباسؑ کی وصیت کا احترام ہے کہ میری لاش خیمہ میں نہ لے جائیے گا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ شیر کے قبضہ کا احترام ہے کہ صبح قیامت تک فرات کے کنارے ایک پیاسے ہی کا قبضہ رہے گا۔

"علامہ مقرمؒ" نے تو یہ توجیہ کی ہے کہ یہ صبح قیامت تک حضرت عباسؑ کی امتیازی شان کو باقی رکھنے کا اہتمام ہے .... کہ دنیا قبروں کا انداز ہی دیکھ کر یہ سمجھ لے

کہ اس شہید میں کوئی خصوصیت ہے جو دیگر شہداء میں نہیں ہے ——— اور اس کے کرامات و کمالات بھی اسی کے نام سے موسوم ہوتے رہے اور ان کی عظمت صاحب کراؑ کی عظمت کا اعلان کرتی رہے۔

شہدائے کربلا میں سب ہی "عام تاریخ دفن" کے اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔

دنیا میں ہر شخص کا مدفن ایک ہوتا ہے اور یہاں ایک ایک شہید کے دو دو مدفن پائے جاتے ہیں۔ کہیں جسم دفن ہوا ہے اور کہیں سر اقدس۔

لیکن حضرت عباسؑ اس میں بھی ایک انفرادیت کے حامل ہیں۔ آپ کے جسد اقدس کو تین مدفن میسر ہوئے۔ ایک وہ جگہ ہے جہاں تن پاش پاش کو دفن کیا گیا۔ ایک وہ منزل ہے جہاں سر اقدس کو سپرد خاک کیا گیا۔ اور ایک وہ مقام ہے جہاں دونوں ہاتھوں کو تھوڑے فاصلہ پر زیر خاک چھپایا گیا ہے۔

یہ مقامات کہاں ہیں۔ اور ان نوعیت کیا ہے؟

یہ ایک الگ بحث ہے جس میں کوئی تحقیقی رائے قائم کرنا سخت مشکل ہے۔ اتنا ضرور مسلم ہے کہ جسم اقدس اسی مقام پر دفن ہوا ہے جہاں روضۂ مطہر بنا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں بازو اور سر اطہر کے بارے میں روایات مختلف ہیں اور یہ اختلاف روایت کسی اور شئے کی نشاندہی کرے یا نہ کرے اتنا ضرور بتاتا ہے کہ اس شہید کی لاش مطہر بھی صحیح و سالم نہ رہ سکی اور اسے ظالموں نے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

سر اقدس کے بارے میں علامہ محسن الامین عاملی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دمشق کے قبرستان "باب الصغیر" میں دفن ہے۔ اور میں نے خود اس جگہ پر ایک کتبہ دیکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب یہ کتبہ محفوظ نہیں ہے۔ ص ۲۹۰ واقعہ ۱۳۲۱ھ کا ہے۔

حبیب السیر کی روایت ہے کہ امام زین العابدینؑ تمام سروں کو اپنے ہمراہ دمشق سے کربلا لائے اور وہیں جسموں سے ملحق فرما دیا۔

تاریخی اعتبار سے کسی ایک بیان کی صحت کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن کرامات کی تفصیلات اور وجدانِ و ذوق کی اعانت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مظالم کے خاتمے کے بعد شہیدوں کے سر و تن میں جدائی نہیں رہ سکتی اور ہر سر اپنے جسم کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔

اب یہ کس طرح ہوا اور اس کے وسائل و اسباب کیا تھے؟ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔

صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کربلائے معلی میں شہید اکرام کی قبروں کے قریب کھڑا ہو کر محو مناجات ہو جائے اور استغراقی کیفیت پیدا کرے تو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ جسم بے سر سے مخاطب نہیں ہوں بلکہ ایک ایسے جسد اقدس سے خطاب کر رہا ہوں جس کا سر اس کے ساتھ ملحق ہے اور وہ برابر میرے حالات کو دیکھ کر اپنی نگاہ عنایت سے اشارہ کر رہا ہے۔

زیارت

کسی عظیم شخصیت کی بارگاہ میں حاضری دینے کا نام ہے۔ زیارت۔۔

زیارت انسان کے قلبی تاثرات کی ترجمان اور اس کے داخلی جذبات کی عکاس ہوا کرتی ہے۔

زیارت اس بات کی دلیل ہے کہ زائر اپنے "مزور" کا احترام کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کو لائق تعظیم سمجھتا ہے۔

قانونِ اخلاق میں زیارت اور ملاقات کی بے حد اہمیت ہے۔ انسانی برادری کا قیام اسی مروت و اخلاق اور اسی طرز معاشرت سے وابستہ ہے اور انسان اسی باہمی

تعاون کے سہارے زندہ ہے۔

مادی قانون میں اس ضابطۂ اخلاق کی حدیں موت پر ختم ہو جاتی ہیں ——— اور موت کے بعد نہ کوئی حاضری کے لائق رہ جاتا ہے۔ نہ کسی کی زیارت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

رسمی طور پر قبروں کا احترام ضرور ہوتا ہے اور ان کے نشانات کو بھی باقی رکھا جاتا ہے۔

لیکن حیات کے جملہ تصورات ختم ہو جاتے ہیں اور لقا کے سارے جذبات خاک میں مل جاتے ہیں۔

مذہب کا قانون اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام نے جن بزرگ شخصیتوں کی زیارت کا حکم دیا ہے انھیں زندگی اور موت دونوں میں یکساں حیثیت عطا کی ہے اور ان کے احترام میں حیات و موت کا کوئی امتیاز نہیں رکھا۔

زیارات میں سلام سے پہلے "اذن دخول" اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ سلام کرنے والا کسی مردہ کو سلام نہیں کر رہا ہے اور نہ حاضری دینے والا کسی میت کے سرہانے کھڑا ہے۔

خالص میت کی قبر ہوتی تو دعائے مغفرت کی جاتی سلام نہ کیا جاتا۔ فاتحہ پڑھا جاتا۔ اجازت نہ لی جاتی۔

زیارت اور اس کے بعد سلام اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب قبر حقیقی معنوں میں زندہ ہے اور موت نے صرف مادی رشتۂ حیات کو قطع کیا ہے۔

مرسلِ اعظمؐ کا ارشاد ہے کہ زیارت سے روکنے والے امت کے اشرار ہیں۔ انھیں نہ میری شفاعت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ وہ حوضِ کوثر پر وارد ہو سکتے ہیں۔

(سفینۃ البحار)

عام مومنین کی قبروں کی زیارت کے مستحب و مطلوب ہونے کے بعد حضرت عباسؑ

کی زیارت کی عظمت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

یہ ایک ایمانی فریضہ۔ ایک اخلاقی ذمہ داری۔ ایک وفا کا اقتضا۔ اور ایک غیرتِ اسلامی کا مطالبہ ہے جسے کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

زیارت نہ کرنا بے توجہی کی حد تک پہنچ جائے تو ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے

زیارت کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ جس طرح بزرگانِ قوم کی نظر میں مرنے والے کی عظمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دنیائے فانی سے رخصت ہو جانے والے کے مراتب و مناقب کے بارے میں ہزار روایات ایک طرف ہیں اور ایک زیارتِ معصوم ایک طرف۔

زیارت کا ایک ایک فقرہ عظمت کا غماز ہے اور ایک ایک انداز جلا قدر کا نشان۔

حضرت عباسؑ کی زیارت[1] آغازِ کتاب میں نقل کی جا چکی ہے۔ اس کے الفاظ پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عباسؑ کا مرتبۂ کمال کس بلندی پر ہے اور بعض اوقات تو یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی امام معصوم کی تعریف ہے یا ایک ایسے بلند کردار انسان کی مدح و ثنا ہے جو کمالِ معرفت کی بنا پر اپنے کو امام معصوم کا غلام کہتا اور سمجھتا تھا۔

زیارت کے ساتھ دو رکعت نماز زیارت بھی مستحب ہے۔ روایت ابو حمزہ

---

[1] بعض علماء نے حضرت عباسؑ کی زیارت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسے "عملی طور پر" زیارتِ امام حسینؑ پر بھی مقدم کیا ہے۔ انکی دلیل یہ ہے کہ حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے لئے "باب الحوائج" کا مرتبہ رکھتے ہیں اور انسان کیلئے مناسب یہی ہے کہ وہ گھر میں آئے تو دروازے کی طرف سے آئے۔
میں نے سال گذشتہ ۱۳۹۲ھ میں زیارت کے موقعہ پر سرکار آیۃ اللہ السید محمد باقر الصدر طاب ثراہ کو اسی ترتیب سے زیارت کرتے دیکھا ہے۔ (جوادی)

اس نماز کا ذکر نہیں ہے۔

لیکن بعض دوسرے روایات۔ اور علماء اعلام کے ارشادات میں اس کا ذکر ضرور ملتا ہے اور اثبات استحباب کے لئے اتنی مقدار کافی ہے۔

علامہ مجلسی نے اس نکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ روایت میں نماز کا ذکر نہ ہونا اس کی حرمت کی دلیل نہیں ہے۔ بہت سے بہت استحباب ثابت نہ ہو سکے گا تو "بر جائے" مطلوبیت بھی پڑھ سکتے ہیں ——— اور بعنوان "ایصالِ ثواب" و "کارِ خیر" بھی پڑھی جائے تو استحباب بھی ثابت ہو جائے گا۔

علامہ مقدم طاب ثراہ کا بیان ہے کہ خود زیارت کے ساتھ بھی نماز کا استحباب ثابت ہے اس کے لئے کسی اور عنوان کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اکثر علماء اعلام نے نماز کا ذکر کیا ہے اور علماء اعلام بدعت کو استحباب کا درجہ نہیں دے سکتے۔

ذکر نماز کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کی نظر میں اس کا استحباب ثابت ہے یہ اور بات ہے کہ ہم تک وہ دلیل نہیں پہنچ سکی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض روایات میں مطلق زیارت کے ساتھ نمازِ زیارت کا ذکر ہے۔

اس میں معصوم اور غیر معصوم کی تفصیل بھی نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر معصوم کی طرف سے وارد ہونے والی زیارت میں "نمازِ زیارت" بالخصوص مستحب ہے ——— اور باقی زیارات میں "ہدیۂ میت" اور ایصالِ ثواب وغیرہ کے عنوان سے پڑھی جا سکتی ہے۔

بوسۂ قبر

قبر اطہر کی زیارت کی طرح اسے بوسہ دینا بھی ایک امر مستحب ہے۔

مزار بحار صفحہ ۱۸ کی روایت کی بنیاد پر خود صادق آل محمدؐ نے صفوان جمال کو تقبیل قبر کا حکم دیا ہے اور علماء اعلام نے بھی اپنی کتابوں میں قبر اقدس کو بوسہ دینے کا ذکر کیا ہے۔

قبر اقدس کی طرح چوکھٹ کو بوسہ دینا بھی ایک تعظیم و احترام کا طریقہ ہے جو قطعاً ایک محبوب عمل ہے۔ سرکار مجدد محمد باقر بہبہانی حرم سید الشہداؑ کی طرح حرم حضرت عباسؑ میں بھی عتبہ مبارکہ کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

علماء اعلام کی سیرت مبارکہ شرعی حجت کے نہ ہونے کے باوجود ایک اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ ان کے "شرعی اعمال" اس بات کی دلیل ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں جواز یا استحباب کی کوئی اہم دلیل ہے جو ہماری نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔

واضح رہے کہ بوسہ دینا سجدہ کرنے سے مختلف ایک امر ہے۔ بوسہ دینا ایک محبوب عمل ہے۔ اور سجدہ کرنا قطعاً غیر محبوب ہے۔

سجدہ کا مسلم قانون یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے۔ معصوم کی چوکھٹ پر خدا کا سجدۂ شکر ہوتا تو سبحان اللہ۔ ورنہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

یہ اور بات ہے کہ یہ صرف ایک عقلی احتمال ہے ورنہ در معصوم پر سجدہ کرنے والے معصوم کو معصوم اور بزرگ کو بزرگ ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تصور بھی نہیں پیدا ہو سکتا کہ یہ بندے خدا ہو گئے ہیں، یا انھیں بھی خدا کا شریک قرار دیا جا سکتا ہے ——— "العیاذ باللہ"

مرثیہ

اخلاقی دنیا کا عظیم ترین فرض اور نفسیاتِ انسان کا اہم ترین مظہر مرثیہ ہے۔ مرثیہ۔ اُن جذبات دلی کا کے اظہار کا نام ہے، جو کسی انسان کے غم میں ابھرا کرتے ہیں۔ اور وابستگان کے قلوب کو برما دیا کرتے ہیں۔ ہیئت اور تکنیک سے قطع نظر مرثیہ صرف جذبات غم کا اظہار ہے اور بس۔

یہ اور بات ہے کہ اس سے ضمنی طور پر مرنے والے کے کردار اور اس کی شخصیت وحیثیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ جذبہ کا تعلق ایک خصوصیت اور امتیاز پیدا کرتا ہے اور مرثیہ کی حقیقت اسکے بغیر ناتمام رہ جاتی ہے۔

قصیدہ اور مرثیہ کا بنیادی امتیاز یہی ہے کہ قصیدہ ان جذبات کے اظہار کا نام ہے جو کسی صاحب کمال کے کمال سے متعلق ہوتے ہیں اور مرثیہ ان جذبات کے اظہار کا نام ہے جو صاحب کمال کے غم والم سے پیدا ہوتے ہیں۔

مرثیہ کی تاریخ انسانی نفسیات کی تاریخ ہے۔ اور مرثیہ کا وجود انسانی جذبات

کی پیداوار ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ صاحبِ کمال انسان دنیا سے اُٹھ جائے اور اُس کے وابستگان اُس کا مرثیہ نہ پڑھیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مرثیہ کبھی نثر میں ہوتا ہے اور کبھی نظم میں۔

اصلاحی طور پر نثر میں اظہارِ غم کو مرثیہ نہیں کہا جاتا ——— لیکن یہ مفہوم مرثیہ کا تصور نہیں ہے۔

یہ صرف عربی مزاج کا تقاضا تھا کہ عرب فطری طور پر شاعر ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو اجتماعی طور پر نظم ہی میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ ان کا رجز۔ ان کی مدح ——— ان کی ہجو سب عام طور پر نظم ہی سے متعلق ہوا کرتی تھی ——— مرثیہ بھی انھیں اصنافِ اظہار میں سے ایک صنف کا نام تھا۔ اس لئے اس کا بھی نظم میں ہونا ناگزیر تھا۔

دھیرے دھیرے ان کے اصول و قوانین مرتب ہونے لگے اور اردو شاعری میں مرثیہ قصیدہ سے بالکل الگ ایک صنفِ سخن بن گیا۔

عربی شاعری میں اس قسم کے امتیاز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہاں قصیدہ اور مرثیہ کا فرق صرف جذبات سے متعلق تھا۔ ہیئت اور تکنیک سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ——— اردو زبان میں دونوں کا فرق مادہ اور ہیئت دونوں سے متعلق ہو گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب مرثیہ پڑھنا ایک اخلاقی فرض اور جذباتی مطالبہ ہے تو جس قدر مرنے والا صاحبِ اوصاف و کمالات ہوگا اُتنا ہی مرثیہ جامع اور ہمہ گیر ہوگا اور جس قدر تاثر شدید ہوگا اُسی قدر مرثیہ کی اثر انگیزی بھی ہوگی۔

جناب عباسؑ کی شخصیت بھی ایک عظیم ترین شخصیت ہے۔ آپ کے کمالات بے حد جامع اور ہمہ گیر تھے۔ اس لئے آپ کے مرثیہ کا انداز عام افراد سے مختلف

ہونا چاہیئے تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب بقیع میں جناب اُمّ البنین آپ کا مرثیہ پڑھا کرتی تھیں تو مروان جیسا دشمنِ اہل بیت بھی چند لمحہ ٹھہر کر آنسو بہایا کرتا تھا۔ اور آپ کے بیان سنے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

عام طور سے مشہور یہی ہے کہ سب سے پہلے جناب عباسؑ کا مرثیہ آپ ہی نے پڑھا ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے اس سے پہلے بھی مرثیہ کا وجود ملتا ہے اور تاریخ کربلا کے بیان کے مطابق سب سے پہلے آپ کا مرثیہ امام حسینؑ نے پڑھا ہے۔

لاشِ علمدار کے سرہانے پہنچ کر امام حسینؑ نے جن جذبات کا مظاہرہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔

أَخِي يَا نُورَ عَيْنِي يَا شَقِيقِي
فَلِي قَدْ كُنْتَ كَالرُّكْنِ الْوَثِيقِ
أَيَا ابْنَ أَبِي نَصَحْتَ أَخَاكَ حَتَّى
سَقَاكَ اللهُ كَأْساً مِنْ رَحِيقٍ
أَيَا قَمَراً مُنِيراً كُنْتَ عَوْنِي
عَلَى كُلِّ النَّوَائِبِ فِي الْمَضِيقِ
فَبَعْدَكَ لَا تَطِيبُ لَنَا حَيَاةٌ
سَتُجْمَعُ فِي الْغَدَاةِ عَلَى الْحَقِيقِ
أَلَا لِلّٰهِ شَكْوَايَ وَصَبْرِي
وَمَا أَلْقَاهُ مِنْ ظَمَأٍ وَضِيقِ

(اسرار الشہادات)

اس کے بعد جناب اُمّ البنین کے دو مرثیے ہیں جن میں آپ نے اپنے جذباتِ غم کا اظہار کیا ہے اور اپنے لال کی اس مصیبت کا تذکرہ کیا ہے جو پورے واقعۂ کربلا میں ایک انفرادی مصیبت ہے اور جس کے بیان کرنے کی نصیحت ایک ذاکرِ حسینؑ کو عالمِ دریا میں خود جناب عباسؑ نے کی تھی۔

فرماتی ہیں سو

يَا مَنْ رَأَى الْعَبَّاس
كَرَّ عَلَى جَمَاهِيرِ النَّقَدْ
وَوَرَاهُ مِنْ أَبْنَاءِ حَيْدَرْ
كُلُّ لَيْثٍ ذِي لِبَدْ
أُنْبِئْتُ أَنَّ ابْنِي أُصِيبَ
بِرَأْسِهِ مَقْطُوعَ يَدْ
وَيْلِي عَلَى شِبْلِي أَمَالَ
بِرَأْسِهِ ضَرْبُ الْعَمَدْ
لَوْ كَانَ سَيْفُكَ فِي يَدَيْكَ لَمَا دَنَى مِنْكَ أَحَدْ

(البصار العین ص۳۱ منتہی الآمال)

ترجمہ :- " اے وہ شخص جس نے میرے لال عباس کو عظیم لشکر پر ایسے عالم میں حملہ کرتے دیکھا ہے جب اس کے پیچھے بہت سے حیدری شیر اور بھی تھے۔ مجھے خبر دی گئی ہے کہ میرے لال کے سر پر اس وقت ضربت لگی جب اس کے ہاتھ قطع ہو چکے تھے اور اس ضربت نے اسے گھوڑے سے گرایا تھا۔"

میرے لال! کاش تیری تلوار تیرے ہاتھ میں ہوتی تو کوئی شخص تیرے قریب بھی آنے کی ہمت نہ کرتا۔"

دوسرا مرثیہ

اس مرثیہ میں آپ نے اپنی کنیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اظہارِ غم کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اُمّ البنین اس ماں کا نام ہوتا ہے جس کے فرزند زندہ رہتے ہیں اور میرے لال تو کربلا میں کام آ چکے ہیں۔ اب مجھے اُمّ البنین نہ کہنا چاہیئے۔

" لَا تَدْعُوِنِّي وَيْكِ أُمَّ الْبَنِينْ
تُذَكِّرِينِي بِلُيُوثِ الْعَرِينْ
كَانَتْ بَنُونَ لِيَ أُدْعَى بِهِمْ
وَالْيَوْمَ أَصْبَحْتُ وَلَا مِنْ بَنِينْ
أَرْبَعَةٌ مِثْلُ نُسُورِ الرُّبَى
قَدْ وَاصَلُوا الْمَوْتَ بِقَطْعِ الْوَتِينْ
تَنَازَعَ الْخِرْصَانُ أَشْلَاءَهُمْ
فَكُلُّهُمْ أَمْسَى صَرِيعًا طَعِينْ
يَا لَيْتَ شِعْرِي أَكَمَا أَخْبَرُوا
بِأَنَّ عَبَّاسًا قَطِيعُ الْيَمِينْ

(البصار العین ص۳۲)

" میری بہنو! مجھے اُمّ البنین نہ کہو۔ مجھے میرے شیر یاد آ جاتے ہیں۔ کبھی میرے بیٹے زندہ تھے تو میں اُمّ البنین تھی۔ اب تو ان میں کوئی زندہ بھی نہیں رہ گیا۔

بائے میرے چار تیر تھے۔ اور سب ہی گلا کٹائے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ اُس وقت شہید ہوئے جب بھوک اور پیاس نے ان کے جوڑ بند تک خشک کر دیئے تھے۔

کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے کہ میرے عباسؑ کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے۔"

مرثیہ فضل بن حسنؑ

علامہ عبدالحسین امینی طاب ثراہ نے الغدیر ۵/۳ پر ایک مرثیہ درج کیا ہے جس کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ امام حسینؑ کا مرثیہ ہے اور بعض کا خیال ہے کہ امام حسینؑ کی زبانِ حال ہے۔ اور بعض حضرات نے حضرت عباسؑ کے پوتے فضل بن حسن بن عبید اللہ بن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔

أَحَقَّ النَّاسِ أَنْ يُبْكىٰ عَلَيْهِ
فَتًى أَبْكَى الْحُسَيْنَ بِكَرْبَلَاءِ
أَخُوهُ وَ ابْنُ وَالِدِهٖ عَلِيٍّ
أَبُو الْفَضْلِ الْمُضَرَّجُ بِالدِّمَاءِ
وَمَنْ وَاسَاهُ لَا يُثْنِيْهِ شَيْءٌ
وَجَادَ لَهُ عَلىٰ عَطَشٍ بِمَاءِ

(قمر بنی ہاشم مقرم ر ۷)

ترجمہ: "کائنات انسانیت میں سب سے زیادہ مستحق گریہ وہ جوان ہے جس نے کربلا میں امام حسینؑ کو رلا دیا۔ وہ امام حسینؑ کا

بھائی ابوالفضل ہے جو خاک و خون میں آغشتہ ہے اور جس نے بھوک و پیاس کے باوجود جنگ بھی کی اور بھرپور بھائی کی مواسات اور ہمدردی بھی کی۔"

ان مراثی کے علاوہ بے شمار مرثیے مختلف زبانوں میں تاریخ میں موجود ہیں۔

ان مراثی کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اسی دور کے ہیں جس دور کا واقعہ ہے اور واقعہ سے قریب ترین تعلق رکھنے والوں کے تاثرات ہیں۔

۲۲۱

لیکن ابوالفضل العباسؑ کے حالات کا تجزیہ گواہ ہے کہ وہ ایک مرد کامل تھے اور ان کی زندگی یقیناً ایسی تھی کہ انھیں مرد کامل کہا جائے۔

وہ علم و عرفان کے اعتبار سے بھی کامل تھے اور عزم و ہمت کے اعتبار سے بھی۔ .... فن حرب کے اعتبار سے بھی کامل تھے۔ اور جذبۂ خدمت کے اعتبار سے بھی۔ ان کا کمال ان کی میراث تھا۔ ان کے عزائم کی بلندی انھیں اب و جد سے ملی تھی۔

ان کے ارادوں کی پختگی ان کی آغوش تربیت کا عطیہ تھی اور ان کا حوصلۂ جہاد ان کے نسلِ ابوطالب میں ہونے کا نتیجہ تھا۔

ازواج و اولاد

ازواج و اولاد کی بحث سیرت نگاری کے موضوع سے زیادہ مربوط نہیں ہوتی — لیکن بعض جہات سے ان امور کا بھی ارتباط قائم ہو جاتا ہے اور ان سے بھی انسانی سیرت و کردار کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ مختصر طور پر اس موضوع کی بھی وضاحت کر دی جائے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی بھی نشاندہی کر دی جائے۔

علماء انساب کا اتفاق ہے کہ جناب عباس کی زوجۂ محترمہ کا اسم گرامی لبابہ تھا جو پدری رشتہ سے جناب عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب کی صاحبزادی ——— اور مادری رشتہ سے جناب ام حکیم جویریہ بنت خالد بن قرط کنانیہ کی نور نظر تھیں۔

آپ کی زندگی روز اول سے مصائب سے دوچار رہی ——— ابتدائے حیات میں معاویہ کے حاکم بسر بن ارطاۃ نے آپ کے دو بھائی عبد الرحمٰن اور قثم کو ماں کی گود سے چھین کر ان کے سامنے قتل کر دیا تھا، جس کی وجہ سے آپ کی مادر گرامی کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ان کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ہر وقت اپنے فرزندوں کو یاد کیا کرتی تھیں اور نالہ

شیون میں مصروف رہا کرتی تھیں۔

آپ کے گریہ و زاری کا یہ عالم تھا کہ ایک یمنی شخص کو آپ کے حال پر رحم آگیا اور اس نے بسر کے دربار میں تقرب حاصل کر کے موقع نکالا اور اس کے دونوں فرزندوں کو قتل کر دیا۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب نے عبید اللہ بن عباس کے دونوں بچوں کی شہادت کا حال سنا تو آپ کو بے حد صدمہ ہوا اور آپ نے بسر کے بارے میں بددعا کی جس کے بعد اس کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ غلیظ کھا کھا کر ۸۶ھ میں واصل جہنم ہو گیا۔

امیر المومنین کی اس بددعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو جناب عبید اللہ اور ان کے فرزندوں سے کس قدر محبت تھی۔ اور آپ ان کی قربانیوں سے کس قدر متاثر تھے۔ انھیں عبید اللہ کی بیٹی تھیں جناب لبابہ جن سے جناب عباسؑ کا عقد ہوا تھا۔ . . . . اور اس عقد کے نتیجہ میں مالک نے چند فرزند و دختر عطا کئے تھے۔

جناب عباسؑ کے فرزندوں کی تعداد میں شدید اختلاف ہے۔ ایک عبید اللہ کا ہونا یقینی ہے۔ کہ باتفاق مورخین جناب عباسؑ کی نسل انھیں سے چلی ہے — باقی کا وجود مختلف اعتبار سے اختلافی حیثیت رکھتا ہے۔

مقاتل کا بیان ہے کہ آپکے دو فرزند کربلا میں شہید ہوئے ایک کا نام فضل تھا اور دوسرے کا نام قاسم۔

علامہ مقرمؒ نے حدیقۃ النسب کے حوالہ سے ایک حسن کا اضافہ کیا ہے اور ایک دختر کا بھی ذکر ہے جیسے حدائق الانس نے لکھا ہے۔

عبید اللہ کے بارے میں ایک روایت واپسئ اہل حرم کے موقع پر درج کی جا چکی ہے۔

آپ اپنے وقت کے عظیم علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کی تین بیویاں تھیں۔ رقیہ بنت الحسن۔ بنت معید بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب۔ بنت مسور بن مخرمہ زبیری۔

امام زین العابدینؑ آپ کا بے حد احترام کیا کرتے تھے اور جب بھی آپ کو دیکھتے تھے بے ساختہ رونے لگتے تھے۔

آپ کا ارشاد تھا کہ میں عبید اللہ کو دیکھتا ہوں تو ان کے پدر بزرگوار کے کارنامے اور ان کی مظلومیت یاد آجاتی ہے۔

جناب لبابہ کی مصائب خیز زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں دو کمسن بھائیوں کی شہادت دیکھی اور انتہا میں دو کمسن بچوں کی شہادت دیکھی۔ درمیان میں شوہر کی شہادت کے ساتھ ایک بھرے گھر کی شہادت کا منظر بھی دیکھا۔

آپ کے تفصیلی حالات کتابوں میں نہیں ہیں۔ لیکن بچوں کے حوصلے اور ان کا جذبۂ شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ باپ کے ساتھ ماں نے بھی تربیت میں مکمل حصہ لیا ہے اور اس حوصلے کے ساتھ سنوارا ہے کہ دین الٰہی پر قربان ہو جائیں اور مولا کے کام آئیں۔

جناب عبید اللہ کی تربیت میں تو زیادہ تر آپ ہی کا ہاتھ تھا۔ ان کی جلالت و عظمت اور ان کا علمی وقار دلیل ہے کہ ماں نے اپنے لال کو پروان چڑھانے میں کس مشقت کا سامنا کیا ہے اور کربلا کے ہولناک مصائب کو نظر میں رکھنے کے باوجود اپنے لال کو اپنے مرحوم شوہر کی یادگار بنا دیا ہے۔

جناب لبابہ کے کردار کو ان کی مادر گرامی کے کردار سے ملایا جاتا ہے تو ان کی عظمت کا ایک اور نقش ابھر آتا ہے۔

ان کی والدہ ماجدہ کے سامنے ان کے دو بچے قتل ہوئے تھے تو ہوش و حواس کھو

بیٹھی تھیں اور عقل و دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن جناب لبابہ نے نہایت ہی حوصلے سے اپنے بچوں کو قربان کر دیا اور ہوش و حواس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مصائب کی اس تاریخ کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صبر و ضبط کے ابتدائی مرحلہ کا نام ہے حکیم اور صبر و ضبط کی معراج کا نام ہے لبابہ۔ جناب عبید اللہ کے صرف ایک فرزند تھے حسن۔

جناب حسن کے پانچ بیٹے تھے۔ ۱۔ افضل۔ ۲۔ حمزہ۔ ۳۔ ابراہیم۔ ۴۔ عباس ۵۔ عبید اللہ۔ اور حسن اتفاق یہ ہے کہ یہ سب کے سب علماء و فضلاء اور اہل شعر و سخن تھے۔

فضل۔ اپنے وقت کے عظیم ترین ادیب اور شجاع تھے۔ ان کے تین فرزند تھے اور تینوں ادیب تھے۔

حمزہ۔ اپنے جد بزرگوار امیر المومنین کی شبیہ تھے۔ اور بقول علامہ مقرمؒ اسی بنا پر مامون نے انھیں ہزار درہم انعام دیا تھا۔

ان کی شادی جناب عبد اللہ بن جعفر کے فرزند علی بن عبد اللہ کے بیٹے حسین کی دختر زینب سے ہوئی تھی۔ جن کے دادا علی کو لوگ زینبی کے نام سے یاد کرتے تھے اور انکی شہرت انکی مادر گرامی زینب کی وجہ سے تھی۔

ابراہیم۔ ایک عظیم فقیہ اور ادیب تھے۔ انکے ۹ فرزند تھے جن میں ابو الحسن علی بن یحیی بن علی بن ابراہیم نقیب بغداد تھے۔ (عمدۃ الطالب)

عباس۔ اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

عبید اللہ۔ ان کے بارے میں محمد بن یوسف کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ

بارعب اور بامروت شخص دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ مامون کے زمانے میں حرمین کے متولی اور قاضی شہر بھی تھے۔

"ابویعلی حمزہ"

حضرت عباسؑ کی نسل میں دور حاضر کی معروف ترین شخصیت جناب حمزہ کی ہے، جن کی قبر مطہر حلہ میں پائی جاتی ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ حمزہ بن قاسم بن علی بن حمزہ بن الحسن بن عبید اللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب —

نجاشی۔ خلاصہ۔ علامہؒ۔ سفینۃ۔ البحار۔ تنقیح المقال، لمقانی۔

آپ اپنے وقت کے عظیم ترین علماء میں شمار ہوتے تھے۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں آپ کا دور حیات تھا جس کی وجہ سے آپ ثقۃ الاسلام کلینیؒ صاحب کافی کے ہمعصر تھے۔

سعد بن عبد اللہ اشعری۔ محمد بن اسمعٰیل بن زاریہ القمی۔ حسن بن مشیل۔ علی بن عبد اللہ بن یحییٰ۔ جعفر بن مالک فزاری کوفی۔ ابو الحسن علی بن الجنید الرازی۔ محمد بن علی بن حمزہ بن الحسن جیسے جلیل القدر اعلام امت آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

حکومت وقت کے شدید ترین مظالم کے دور میں جناب نرجس خاتون کو آپ ہی نے پناہ دی تھی۔

آپ کی قبر کا سراغ آیۃ اللہ محمد مہدی قزوینیؒ نے اس طرح لگایا تھا کہ آپ حلہ میں قیام پزیر تھے اور قبر حمزہ کی زیارت کے لئے نہیں جاتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ جناب حمزہ کی قبر رے میں ہے اور یہ قبر جعلی ہے۔

ایک دن خواب میں دیکھا کہ بزرگ زیارت کی دعوت دے رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ یہ قبر جناب حمزہ ہی کی ہے اور اس کا تذکرہ کتب رجال میں موجود ہے۔

صبح کو اٹھ کر آپ نے جملہ کتب رجال کا مطالعہ کیا اور قبر کی تحقیق کے بعد زیارت کے لئے آئے۔ اتفاق سے اسی شکل وصورت کا ایک عرب نظر آگیا۔ آپ نے باصرار تمام اس سے دریافت کیا۔

لیکن اس نے معذرت کی کہ میں مرد عامی ہوں۔ مجھے کتب رجال کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ حاضرین روضہ نے بھی اس امر کی تصدیق کی۔

تو سرکار موصوف کو اندازہ ہوگیا کہ یہ امام عصر کی عنایت تھی اور آپ کا منشا تھا کہ اس قبر مطہر کی زیارت کی جائے ——— جنتہ الماویٰ حکایت ۴۵۔

مولف! نجف اشرف کے قیام کے دوران اکثر حلہ کے تذکرہ کے دوران حمزہ وقاسم کا نام سنا کرتا تھا۔ لیکن ان حضرات کی شخصیت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ ایک تعطیل میں قبلہ محترم مولانا شمیم الحسن صاحب قبلہ بنارسی اور علامہ طالب جوہری (کراچی) کے ہمراہ حلہ کی زیارت کے لئے روانہ ہوا تو چاروں طرف گردش کرتے کرتے بمشکل تمام جناب حمزہ کی قبر تک پہنچا۔ معلوم ہوا کہ یہ نسل حضرت عباس میں ایک جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے اور ان کا روضہ آج تک مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

گرد و نواح کے عرب مرد وزن نہایت ہی عقیدت سے روضہ پر حاضری دیتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔

مالک کائنات اس جلیل القدر سید و عالم دین کے طفیل میں ان کی مرادیں کو پورا کرتا ہے اور ان کے دامن تمنا کو گوہر مراد سے بھر دیتا ہے۔

حضرت عباسؑ کا یہ امتیازی شرف ہے کہ آپ کی اولاد طاہرین میں جن شخصیتوں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ سب اہل علم وفضل اور ارباب کمال و جمال تھے۔

قربانی کے صلہ میں آخرت کے مدارج اپنے مقام پر ہیں۔ دنیا میں اتنی بڑی نیک نامی بھی عنایت الٰہیہ کا عظیم ترین نمونہ ہے۔

جو ہر فردِ بشر یا مجاہدِ راہِ خدا کو نصیب نہیں ہوتا۔

بابُ المُراد

انسانی زندگی میں خارق عادت اور غیر معمولی افعال کا صادر ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور صبح و شام تازہ بہ تازہ ایجادات عالمِ ظہور میں آتی رہتی ہیں۔

فکر و نظر اور علم و ہنر کی دنیا میں وہ مناظر مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جن کا تصور بھی تقریباً محال تھا۔

کون سوچ سکتا تھا کہ زمین پہ رہنے والا انسان خلاؤں میں پرواز کریگا۔

—— کس کے تصور میں تھا کہ گھر کی محدود فضا میں زندگی گزارنے والا ایک لمحہ میں آفاق کی وسعتوں میں سیر کریگا۔

کس کے وہم و گمان میں تھا کہ آن کے آن میں دنیا بھر کی خبریں اور تصویریں نگاہوں کے سامنے آجائیں گی۔ نہ کوئی جگہ قابلِ جستجو رہے گی نہ کوئی مرض ناقابلِ علاج رہ جائے گا۔

خطۂ ارض کا گوشہ گوشہ انسانی قدموں کا روندا ہوا ہوگا اور جسمِ انسانی

کی ایک ایک رگ طبیب حاذق کے ہاتھ میں ہوگی۔

یہ غیر معمولی اعمال اور خارق عادت ایجادات صبح و شام کے نظارے بن چکے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے یہ تصور انتہائی لغو ہے کہ انسان غیر معمولی اعمال پر قادر نہیں ہے یا خارق عادت افعال انجام نہیں دے سکتا۔

فرق صرف یہ ہے کہ یہ سارے اعمال و ایجادات اپنے مادی اسباب کے تحت عالم ظہور میں آتے ہیں۔

فضا پیما آلات اور فلک سیر سیارات اپنے مخصوص اسباب و آلات کے تابع ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ فکر انسانی کے درجات و مراتب کی بنا پر ایک انسان اس درجۂ انکشاف تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ منزل تک پہنچ جانے والا غیر معمولی اسباب کی بنا پر پہنچ گیا ہو یا اس کے مادی اسباب ہی نہ ہوں۔

اسباب سب موجود ہیں صرف ذہن کی رسائی درکار ہے جس کا ذہن رسا ہو گیا وہ موجد کہا گیا اور جس کا ذہن رسائی نہ پا سکا وہ متبع شمار کیا جانے لگا۔

مذہبی دنیا میں کرامت و اعجاز کا سلسلہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں غیر معمولی اور خارق عادت کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن ان کے عام مادی اسباب نہیں ہوتے۔ ان کا تعلق تمام تر روحانی اسباب اور ربانی فیوض و برکات سے ہوتا ہے۔ مادی اسباب کے تحت منظر عام پر آنے والے غیر معمولی عمل کو ایجاد و انکشاف کہتے ہیں۔ اور غیر مادی اور غیر معمولی اسباب کی بنا پر منصۂ شہود پر آنے والے عمل کو کرامت و اعجاز۔

کرامت و اعجاز کی دنیا کا کوئی تعلق عالم مادیت سے نہیں ہے۔ اس کے اسباب عام عالم اسباب میں تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے ظہور میں مالک کی عنایت اور رب العالمین کے فیض و کرم کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

صاحب ایجاد و انکشاف سیکڑوں اور ہزاروں ہو سکتے ہیں۔ لیکن صاحب کرامت و اعجاز بہت کم ہوتے ــــ کرامت و اعجاز کے لئے روحانی کمال اور معنوی ارتقاء درکار ہے۔ اور معنوی ارتقاء کی منزل تک پہنچنے کے لئے ریاضت نفس۔ اطاعت الٰہی۔ بندگی رب۔ تسلیم و رضا جیسے عظیم جذبات درکار ہیں۔ جن کا وجود ہر فرد بشر میں ممکن نہیں ہے۔

کرامت و اعجاز میں بھی باہمی طور سے ایک نازک فرق پایا جاتا ہے۔

کرامت کا تعلق کبھی خدائی دعوی کے اثبات اور منصب کے اظہار سے ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ کرامت صرف ضرورت مندوں کی حاجت روائی اور بے نواؤں کی مشکلکشائی سے متعلق ہوتی ہے۔

پہلی قسم کی غیر معمولی اعمال کو معجزہ کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کے اعمال کو کرامت۔

معجزہ و کرامت دونوں ہی بلند نفس اور پاکیزہ کردار کے طالب ہیں۔ دونوں ہی کے لئے عظیم عرفان اور غیر معمولی روحانیت درکار ہے ــــ لیکن صاحب اعجاز کا مرتبہ کچھ بلند ہوتا ہے۔

وہ اپنے منصب کی بنا پر ایک مزید امتیاز کا حامل ہوتا ہے۔ اسے رب العالمین مخصوص اعتماد کے قابل سمجھ کر منصب بھی عنایت کرتا ہے۔ صاحب کرامت کا یہ انداز نہیں ہوتا ہے وہ بلند نفس اور بلند کردار ضرور ہوتا ہے لیکن صاحب منصب و عہدہ الٰہی نہیں ہوتا۔ جس کے بعد یہ واضح ہے کہ صاحب اعجاز ہونا ایک خدائی دین اور ربانی عطیہ ہے۔

اور صاحب کرامات ہونا اتنا بلند مرتبہ نہ ہونے کے باوجود کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے بھی بڑی روحانیت و معنویت اور عظیم تر علم و عرفان درکار ہے۔

دور حاضر میں ہر مرنے والے کو "صاحب کرامات" سمجھ لینا اور ہر ایک کی قبر

سے توسل کرنا ایک رسم عام بن گیا ہے۔

توسل کرنے والے کو صاحبِ قبر کا اسم و رسم تک نہیں معلوم ہوتا۔ اور وہ گردِ قبر اعتکاف کرنے مسلسل مرادیں مانگتا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ کرامت ہونے کے لئے کوئی شرط ہی نہیں ہے۔ اور اس کے لئے کسی روحانی مرتبہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہی جہالت تھی جس نے وہابیت کی تحریک کو آگے بڑھایا اور یہ تحریک روز بروز آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

متوسلین و معتقدین کے اژدحام کے باوجود جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبر ہی نہیں ہے۔ یا کسی جانور اور پست ترین انسان کی قبر ہے۔

ایسے حالات میں مرادیں پوری ہونے کا پروپیگنڈہ قہری طور پر ایک ذہنی ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔ اور مذہب سے بیزاری کا جذبہ عام ہو جاتا ہے۔ وہابیت کی تحریک ایسے ہی مواقع کی تلاش میں رہتی ہے کہ مذہب سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اپنی تحریک کے لئے راہیں ہموار کر لے۔

"ہوشمند انسان" اور دانش جو طالب علم کے لئے یہ بڑا آزمائشی لمحہ ہے۔ اس کا ذوقِ مذہب توسل اور توجہ پر مجبور کرتا ہے۔ اور اس کے گرد و پیش کے حالات بدگمانی اور بدظنی کی فضا ہموار کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ کوئی ایسا معیار مقرر کر لیا جائے جس سے بزرگانِ ملت کی عظمت و برتری بھی برقرار رہے اور "قبر پرستی" جیسے توہمات کو فروغ بھی نہ ملنے پائے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک عام مردِ مومن کا احترام بھی موت و حیات میں مختلف نہیں ہوتا۔ اور مرنے کے بعد اس کا وہی احترام باقی رہ جاتا ہے جو حالتِ حیات میں تھا۔

اولیاء خدا اور خاصانِ رب کی منزل اس سے بلند تر ہے۔ اُن سے تو یہ توقع

قطعی صحیح اور برحق ہے کہ وہ بعدِ موت بھی اُسی طرح رہنمائی اور حاجت روائی کرتے رہیں گے جس طرح حیات کی حالت میں کیا کرتے تھے۔

عام افراد کے بارے میں یہ تصور بھی قطعی ہے کہ وہ نہ حالتِ حیات میں کچھ کر سکتے تھے اور نہ بعد الممات ہی کچھ کر سکتے ہیں۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ کون "ولی خدا"۔ اور "خاصہ رب" ہے اور کس میں ان صفات کا فقدان ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا معیار عوام کی رائے کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وہ تو بہرحال ہر قبر کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اور ہر خاص و عام کو ولی و مرشد تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں صاحبِ قبر کی تحقیق کرنا بھی ولایت کی توہین اور ایک قسم کا کفر ہے۔ ان کے معتقدات کا کوئی اعتبار نہیں ہے

ضرورت ہے کہ ان کی رائے سے ہٹ کر کوئی معیار تلاش کیا جائے۔ اور اس کی روشنی میں ولی و غیر ولی کے درمیان خطِ فاصل کھینچا جائے۔

بظاہر یہ مسئلہ زیادہ دشوار نہیں ہے اور اس کا واحد حل یہ ہے کہ کرامت کے مفہوم پر غور کر لیا جائے اور پھر حالات کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔

کرامت مادی اسباب کے نتیجہ میں ظاہر ہونے والے غیر معمولی عمل کا نام نہیں ہے کہ ہر صاحبِ قبر صاحبِ کرامت ہو جائے۔ اور اس میں مسلم و کافر اور موحد و مشرک کا بھی فرق نہ رہ جائے۔

کرامت ایک خدائی عطیہ اور ربانی فضل ہے جس کے بعد بندہ اس قدر صاحبِ اختیار ہو جاتا ہے کہ حیات و موت دونوں حالات میں رہنمائی اور حاجت روائی کر سکتا ہے۔ اور اس کا فیصلہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کہ اس نے کس کو یہ حیثیت دی ہے اور کسے نہیں دی۔ کس کے شاملِ حال یہ فضل کیا ہے اور کس کو اس فضل سے محروم رکھا ہے۔

وہ جسے صاحبِ فضل کہہ دے گا صاحبِ فضل ہوگا۔ کائنات میں کوئی اس کے پاس آئے یا نہ آئے۔ اور وہ جسے صاحبِ فضل نہ کہے گا وہ صاحبِ کرامت نہ ہوگا چاہے ساری کائنات اس کی بارگاہ میں جمع ہو جائے۔

اُس کے کہنے کے انداز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی وہ خود اعلان کرتا ہے اور کبھی اپنے مستند صاحبِ منصب کے ذریعہ اعلان کروا دیتا ہے۔ اور جس کی شخصیت و حیثیت کو غیر معمولی کہہ دیتا ہے وہ صاحبِ کرامات ہو جاتا ہے۔ اور جس کو ایک عام انسان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا وہ صاحبِ کرامات نہیں قرار پاتا۔

حضرت عباس کے صاحبِ کرامات ہونے کی بہترین دلیل یہ ہے کہ انھیں الٰہی منصب دار۔ سبطِ رسول الثقلین حضرت امام حسینؑ نے ایک عظیم مرتبہ کا حامل بتایا ہے۔ اور اپنی طرف سے "باب المراد" قرار دیا ہے۔ اب امام حسینؑ سے طلبِ فیض کرنے والا حضرت عباسؑ کے در پر آئے گا۔ اور امام حسینؑ کی بارگاہ میں رسائی کا طلب گار حضرت عباسؑ کی چوکھٹ پر سرِ نیاز جھکائے گا۔

حضرت عباسؑ صاحبِ علم و عرفان بھی ہیں اور صاحبِ روحانیت و معنویت بھی۔ ان کے فضائل و کمالات اور ان کے مراتب و مناقب کے بارے میں مختلف معصومین کی شہادتیں موجود ہیں۔

اُن کی عظمت و برتری کا مسلم ہونا یقینی ہے اور انھیں مالک کی طرف سے کرامت و امتیاز کا عطا ہونا کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔

واقعۂ کربلا سے آج تک کی تاریخ پر نظر رکھنے والا انسان جانتا ہے کہ حضرت عباسؑ سے اسقدر کرامات کا ظہور ہوا ہے کہ شاید ہی کائنات میں کسی "فردِ بشر" سے اتنے کرامات کا ظہور ہوا ہو۔

زائرین کربلا کی رہنمائی۔ صاحبانِ حاجت کی حاجت روائی۔ اسیرانِ مشکلات کی رہائی

وہ بے شمار مواقع ہیں جہاں حضرت عباسؑ یا ان کے آثار و فیوض و برکات کا مسلسل مشاہدہ کیا گیا ہے۔

واقعات کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ان کے نقل کرنے کی کوئی خاص افادیت ہے۔

واقعات وہاں نقل کئے جاتے ہیں جہاں واقعہ کسی معصوم سے متعلق ہوتا ہے۔ تو اسے سند بنایا جاتا ہے۔ یا واقعہ کی مدت گزر چکی ہوتی ہے تو اس کی یادوں میں تازہ رکھی جاتی ہے۔

لیکن جہاں مدت کے تمام ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور صاحبِ کرامت ہر آن حاجت روائی کے لئے تیار ہے وہاں واقعات کی نہیں جذبات و توجہات کی ضرورت ہے۔

آج بھی کوئی انسان کرامات و کمالات کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو صدقِ دل سے "باب المراد" کی بارگاہ میں آئے۔ یا اُن سے توسل کرے۔ انشاءاللہ مراد ضرور پوری ہوگی۔

اور بعض واقعات سے تو یہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات روضۂ حضرت سیدالشہداءؑ سے مراد پوری نہیں ہوئی تو صاحب ضرورت روضۂ ابوالفضلؑ میں آیا اور مراد پوری ہو گئی۔

اور جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو جواب ملا کہ "عباسؑ" "باب المراد" ہیں۔ عباس باب الحسینؑ ہیں۔ دروازہ چھوڑ کر منزل تک آنے والا بامراد نہیں ہو سکتا۔ مراد حاصل کرنا ہے تو باب المراد تک جاؤ۔ اور حسینؑ کی بارگاہ سے کچھ لینا ہے تو دروازہ کی طرف سے آؤ۔

بعض اعلامِ امت کا زیارت امام حسینؑ سے پہلے زیارت حضرت عباسؑ کے لئے

جانا اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کا واحد وسیلہ "دروازہ" ہے۔ یہ ادبیات ہے کہ یہ ترتیب شرط نہیں ہے اور اس کے برخلاف بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے کہ عباسؑ معنوی اعتبار سے "باب الحسینؑ" ہیں۔ صرف ظاہری اعتبار سے نہیں۔ زیارت میں یہ ترتیب کبھی نہ رہ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ذہن میں یہ ضرور رہنا چاہیئے کہ مولا کا فیض حضرت ابو الفضل کے ذریعہ ملے گا اور حضرت ابو الفضلؑ سے جو کچھ ملتا ہے وہ امام حسینؑ ہی کا فیض و کرم ہے۔

تاہم مولفین و مصنفین کی رسم ہے کہ جذبۂ عقیدت و محبت کی تسکین کے لئے بعض ایسے واقعات درج کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ تبرکاً یہاں بھی بعض واقعات کا اندراج کیا جاتا ہے۔ اور ان واقعات میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان سے کرامت ابو الفضلؑ کے علاوہ بھی کسی نکتہ کا علم حاصل ہو سکے۔

(۱) آیۃ اللہ خاتم المجتہدین حضرت شیخ مرتضیٰ انصاری طاب ثراہ کے شاگرد رشید آقائے شیخ عبدالرحیم شوستری متوفی ۱۳۱۳ھ کا بیان ہے کہ میں زیارت سید الشہداؑ سے فارغ ہونے کے بعد حرم ابو الفضل میں آیا۔ مشغول زیارت و دعا تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخصِ عرب اپنے مفلوج بچے کو لیکر آیا اور ضریح ابو الفضلؑ سے باندھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بچہ صحت یاب ہو گیا اور وہ عرب خوش خوش اسے لیکر چلا گیا۔

میرے دل پر اس واقعہ کا بے حد اثر ہوا۔ اور میں نے کہا یا ابا الفضلؑ! کیا آپ کی نظر میں میری ایک عام عرب کے برابر بھی قیمت نہیں ہے کہ اس کا مدعیٰ فوراً پورا ہو گیا اور میں اتنی دیر سے مانگ رہا ہوں اور میری مراد پوری نہیں ہوتی۔

یہ کہنے کے بعد معاً ذہن میں خیال آیا کہ یہ سوء ادب ہے۔ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ فوراً توبہ و استغفار کیا اور حرم سے باہر نکل آیا۔

نجف اشرف آنے کے بعد شیخ انصاری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے دو تھیلیاں

عطا کیں۔ اور فرمایا کہ ایک سے مکان خرید لینا اور ایک سے حج کے لئے جانا۔

میں یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اور بے حد شرمندہ ہوا۔ اس لئے کہ میں نے حضرت عباسؑ سے اتنا ہی مطالبہ کیا تھا۔

اس واقعہ سے جناب عباسؑ کی عظمت کے علاوہ شیخ انصاری جیسے غلامانِ عباسؑ کی جلالتِ قدر اور ان کی بلندیٔ کردار کا بھی اندازہ ہوتا ہے

ایک حضرتِ عباسؑ تھے جنہوں نے اپنے سائل کو نامراد نہیں پلٹایا۔ ایک شیخ انصاری تھے جنہیں "باب المراد" کی طرف سے وسیلہ قرار دیا گیا۔ اور ان کے ہاتھوں برکات تقسیم کئے گئے۔

اور ایک آقائے شوستری تھے جنہیں عام بشری جذبات نے "اسائتِ ادب" پر آمادہ کر دیا۔ تو توجہ کے بعد فوراً توبہ و استغفار کر لیا کہ حضرت عباسؑ کی جلالت بہت بلند ہے۔ ان کی بارگاہ میں کوئی نامناسب کلمہ نہیں کہا جا سکتا۔ توبہ و استغفار عزت و عظمت کا وسیلہ ہے توہین و ذلت کا ذریعہ نہیں۔

اربابِ علم کے لئے یہ واقعہ شمع راہ ہے۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ اگر جلیل القدر بارگاہوں میں کوئی بھی "اسائتِ ادب" ہو جائے تو فوراً توبہ و استغفار کریں۔ اور اپنے دامنِ مراد کو گوہرِ مقصود سے مالامال کر لیں۔

(۲) علامہ سید نصر اللہ الحائری طاب ثراہ کا بیان ہے کہ میں حرم ابو الفضلؑ میں خدام کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کہ ایک مرتبہ حرم کے اندر سے ایک عرب روتا ہوا نکلا۔ اس کی ایک انگلی کٹی ہوئی تھی اور اس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے روک کر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔؟

اُس نے کہا کہ یہ انگلی حضرت عباسؑ نے کاٹ دی ہے۔ میں فوراً حرم کے اندر آیا اور دیکھا کہ وہ انگلی ضریح سے معلق ہے۔ اور اس میں ایک قطرۂ خون بھی نہیں ہے معلوم ہوا کہ

اس شخص نے حرم اقدس میں کوئی بے ادبی کی تھی۔ اور اس کی سزا اسے دی گئی ہے۔ دوسرے دن وہ شخص شدتِ الم سے انتقال کر گیا۔

(۳) خطیب شہیر علامہ شیخ محمد جواد نے علامہ اجل شیخ جاسم فحام کے حوالے سے بعض خطباءِ ایران کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایران کا ایک صاحب ثروت انسان کاظمین میں مقیم تھا اور وہ برابر لوگوں کو مخصوص کے مواقع پر زیارتِ امام حسینؑ کے لئے بھیجا کرتا تھا۔ ایک سال حالات خراب ہو گئے اور وہ معذور ہو گیا۔ دفعتاً خیال آیا کہ مجھے زوار کو بھیجنا چاہیئے۔ اس کے بعد جو بھی حشر ہو گا دیکھا جائے گا۔

جانور کرایہ پر لئے اور کہا کہ کرایہ کربلائے معلیٰ میں دوں گا۔ زوار کو جمع کیا۔ اور قافلہ کو لے کر چلا۔ حرمِ امام حسینؑ میں آکر فریاد کی!

"مولاؑ! آپ کے زوار کو لایا ہوں۔ ان کو کرایہ عطا کیجئے۔" کوئی جواب نہ ملا۔ دل نے آواز دی۔ تو نے غلطی کی۔ دروازے کے بغیر منزل تک آگیا۔ جا۔ اور جا کر عباسؑ سے التماس کر۔ میں فوراً حرم ابوالفضلؑ میں آیا۔ اور یہی گزارش کی۔

ابھی میری التجا تمام نہ ہوئی تھی کہ ایک شخص نے ایک تھیلی لا کر دی جس میں میری ضرورت سے کہیں زیادہ درہم و دینار تھے۔ میں خوش خوش پلٹ آیا۔ اور سب کا کرایہ ان کو دیا۔ قمر بنی ہاشم مقرم ص ۳۲

(۴) آقائے عباس طباطبائی کا بیان ہے کہ میں کربلا میں مشغولِ درس تھا۔ ایک مرتبہ حرم حضرت عباسؑ میں شور ہوا کہ معجزہ ہو گیا ہے۔ میں دوڑ کر حرم میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک جمِ غفیر ہے۔ اور اس کے درمیان ایک عورت بے ہوش پڑی ہے۔ اور ایک طوق حرم کی ایک قندیل میں معلق ہے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد اس کے اعزاء و اقرباء آ گئے اور سب نے مل کر بے حد آہ و زاری اور نالہ و فریاد کیا۔ بہ مشکل وہ عورت ہوش میں آئی۔ تو اس نے بیان کیا کہ میرا بچہ بیمار تھا

میں نے نذر کی تھی کہ جب شفایاب ہو جائے گا تو میں یہ طوق روضۂ حضرت عباسؑ میں نذر کروں گی۔

بچہ شفایاب ہو گیا تو میں ایفائے نذر کے لئے آئی۔ یہاں آکر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ طوق بہت قیمتی ہے۔ اب کام نکل چکا ہے[1]۔ بہتر ہے کہ اس کے بدلے سونا چڑھا دیا جائے۔

یہ خیال آنا تھا کہ ایک پرچھائیں سی نظر آئی اور میں بیہوش ہو گئی۔

(موسع النجوم ص ۳۳)

(۵) ایک عظیم فضل و کرم جو خود حقیر کے شامل حال ہوا۔ ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۹ء کا زمانہ تھا۔ میں نجف اشرف میں مشغول تحصیل تھا۔ میرے ہمراہ والدہ گرامی بھی وہیں مقیم تھیں۔ ذی الحجہ کا مہینہ آیا تو والدہ محترمہ نے فرمایا کہ عشرۂ محرم کربلائے معلیٰ میں کرنا ہے۔ میں نے عرض کی کہ امسال حالات اچھے نہیں ہیں۔ یہاں کرایہ کا مکان موجود ہے اور کربلا میں مکان کرایہ پر لینا پڑے گا۔ اس زمانہ میں کرایہ وغیرہ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس سال نجف اشرف کا محرم کیا جائے۔

وہ بے حد غمگین ہوئیں اور ان کا اصرار جاری رہا کہ کربلا جانا ضروری ہے۔ میں نے عرض کی کہ ہم لوگ محرم سے قبل دورہ کی زیارت کے لئے چلیں۔ ۱½ دینار اپنے پاس ہے۔ اس میں یہ زیارتیں ہو جائیں گی۔ واپسی میں تیسری جو تھی محرم کو ایک روز کربلا معلیٰ میں قیام کر کے نجف اشرف واپس آجائیں گے۔

---

[1] درحقیقت یہ اس جذبہ کی سزا تھی ورنہ بارگاہِ ابوالفضل کو کسی کے طوق و زنجیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ایفائے نذر کرنے والا روزِ قیامت جواب دہ ہو گا اور اسے مالک کی بارگاہ میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

۲۷ر۲۸ر ذی الحجہ کو ہم لوگ روانہ ہوئے۔ پہلے کربلا آئے۔ یہاں مکان کے بارے میں دریافت کیا تو ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کا کرایہ دس دینار بتایا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ مقدار اپنے تصور سے بالاتر تھی۔ اس لئے ہم لوگ شام کو کاظمین کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک روز قیام کر کے سامرہ چلے گئے۔ دو روز وہاں قیام کیا۔ اسکے بعد واپس ہوتے ہوئے پھر کربلا آئے۔

کربلائے معلیٰ میں آقائے حجۃ الاسلام مولانا سید حسن الرضوی دام ظلہ لکھنوی مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ اور ہر سال اپنے گھر میں عشرۂ محرم کرتے ہیں اور خود ہی ذاکری فرماتے ہیں۔

میں حسب روایات اس مجلس میں حاضر ہوا تو ان کے فرزند عزیز محترم علامہ سید سلیمان الرضوی نے بعد مجلس کہا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیے گا۔ والد ماجد کو آپ سے کچھ کام ہے۔ میں حسب خواہش حاضر ہوا تو جناب موصوف نے فرمایا کہ ایک صاحب افریقہ سے آئے ہیں اور آپ کی کوئی امانت لائے ہیں۔

اس وقت تک میرا کوئی رابطہ افریقہ سے نہیں تھا۔ میرے برادر معظم حجۃ الاسلام مولانا السید علی عابد الرضوی دام ظلہ (جو عرصۂ دراز سے افریقہ میں قیام پذیر ہیں) بھی عراق میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ افریقہ سے میرا کیا کیا تعلق ہے؟

میں نے عرض کیا کہ وہ بزرگ کہاں ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اب کل مجلس میں ملیں گے۔

برادر علام بھی بسلسلۂ عشرۂ محرم وہیں مقیم تھے۔ میں نے بمشکل تمام انھیں کے ساتھ ایک مختصر کمرہ میں قیام کیا اور دوسرے دن بھی گیا تو بعد مجلس ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ڈائری دیکھ کر پوچھا کہ سید ذیشان حیدر آپ کا نام ہے؟ میں نے

کہا جی ہاں۔

انھوں نے فرمایا اور سید علی عابد رضوی؟ میں نے کہا کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں!

انھوں نے کہا کہ آپ دونوں کی امانتیں میرے پاس ہیں۔

میں نے کہا کہ افریقہ میں میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔ غالباً آپ کو اشتباہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے پھر ڈائری کو دیکھا اور کہا نام یہی لکھے ہیں۔ میں نے کہا بڑی مشکل کی بات ہے کہ اس نام کا میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بہرحال میں آپ کی امانت لئے لیتا ہوں۔ اب اگر دوسرا مستحق نکل آیا تو ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ میں واپس کرنے کے لائق نہیں ہوں۔

انھوں نے خوشی سے اس شرط کو منظور کر لیا اور دے کر چلے گئے۔ میں مولا کے کرم اور اپنی دعاؤں کی قبولیت پر خوشی خوشی گھر واپس آیا اور والدہ ماجدہ کو واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ بھی بے حد مسرور ہوئیں۔

اسی دن کرایہ پر مکان لے لیا۔ اور عشرۂ محرم پھر کربلائے معلیٰ میں قیام کیا۔ سرزمین کربلائے معلیٰ کی یہ برکت اور باب الحوائج حضرت عباسؑ کی بارگاہ سے یہ انعام حقیر کی زندگی کا وہ یادگار واقعہ ہے جسے تاحشر نہیں بھلایا جا سکتا۔

اب تک کئی مرتبہ افریقہ جانے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ اور برادر علام دام ظلہ ۲۲ سال سے وہاں مقیم ہیں۔ لیکن آج تک نہ معلوم ہو سکا کہ اس رقم کا بھیجنے والا یا لانے والا کون تھا۔

ظاہر ہے کہ اس کو حضرت "باب المراد" کے فیض و کرم کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ اس میں میری پریشانیوں سے زیادہ میری والدۂ گرامی

کے اخلاص کا دخل ہے۔

بارگاہ ابوالفضلؑ میں ان کا اخلاص عجیب وغریب حیثیت رکھتا ہے۔ خدائے کریم اس اخلاص میں اضافہ فرمائے۔ اور ہر صاحب ایمان کو ان فیوض وبرکات سے استفادہ کرنے کا موقع دے! والحمد للّٰہ اولاً وآخراً۔

جوادی
۲۳ر شوال المکرم ۱۳۹۳ھ
نظر ثانی ۱۴ر جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ

جب زباں پر کبھی آجاتا ہے نامِ عباسؑ
دیر تک ہونٹوں سے خوشبوئے وفا آتی ہے

جوادی